اصول شرع محمدی 1923

سلسلۂ مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ

اصول شرع محمدی

رائٹ آنربیل سر سید امیر علی صاحب کی تالیف
"دی پرنسپلز آف محمڈن لا فار سٹوڈنٹس"

مترجمۂ

مولوی سید علی رضا صاحب بی۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا
رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ
جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۲ ہجری مرسنہ ۱۳۳۳ فصلی مرسنہ ۱۹۲۳ عیسوی

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سررشتۂ تعلیم حیدرآباد دکن

فہرست مضامین اصول شرع محمدی حصہ اول۔ دوم وسوم

تمہید

ہند میں شرع اسلام کا نفاذ۔

مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں شرع محمدی کی اشاعت ہوئی لیکن اس کے نفاذ و رواج نے ہندو باشندوں کے مذہب و قانون رسوم و وراثت میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا بلکہ انھیں مثل سابق اپنے مذہبی و معاشرتی طریقوں پر چلنے کی کامل آزادی حاصل رہی۔ موجودہ زمانے میں تخمیناً سات کرور اہل ہند دین اسلام کے پیرو ہیں اور کشور ہند کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو رسول عربی کے معتقدین سے آباد نہ ہو۔ چونکہ مسلمان کی جائداد خواہ وہ ملک کے کسی حصہ میں واقع ہو جب وراثت کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو منتقل ہوتی ہے اور جو حقوق و املاک کہ اہل اسلام بشکل وصیت وغیرہ منتقل کرتے ہیں وہ بالکل ان کے قانون شخصی کے تابع ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس بات سے واقف ہونا نہایت ضرور ہے کہ ہند کی برطانوی حکومت نے کن قواعد کے ماتحت مسلمانوں کے قانون دیوانی کا کس قدر حصہ جائز و بحال رکھا ہے۔

جواز رسم

فقہ اسلام بذات خود کسی رسم کو جو اس کے احکام و اصول کے منافی و متغائر ہو جائز نہیں رکھتی[1]۔

اس پر بھی ہند کے بعض اضلاع اور شہروں میں ایسے رسوم پائے جاتے ہیں جو

---

[1] جوالا بخش بنام دھرم سنگھ (سنہ ۱۸۶۶ء) مورز انڈین اپیلز جلد ۱۰ صفحہ ۸۱۱ و صفحہ ۵۳۸ - اور حاکم خاں بنام گل خاں سنہ ۱۸۸۲ء انڈین لا رپورٹ کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۸۲۳ - یہی مقدمہ کلکتہ لا رپورٹ جلد ۱۰ صفحہ ۶۰۳ پر شائع ہوا ہے۔

عام فقہ اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ ایسے مقامات میں وہاں کی عدالتیں جہاں تک ان کو اُن کی سند اور دستور کی رو سے اجازت ہے وہ ان رسوم کی تعمیل کرا کے مسلمانوں کو اُن کا پابند کرتی ہیں بشرطیکہ وہ "انصاف اور اغراض معدلت" کے متضاد و مخالف نہوں یا اُن کے جواز کی ہند کی مجلس وضع قوانین کے کسی قانون کے ذریعہ سے صریحاً ممانعت نہ کردی گئی ہو۔

اُن لوگوں کے رسوم قدیمہ کی بحالی کے تصفیہ کے متعلق جو اپنا مذہب ترک کر کے خصوصاً دین اسلام اختیار کرتے ہیں جوڈیشل کمیٹی کی ایک تجویز کا اقتباس جو بمقدمہ ابراہیم بنام ابراہیم[1] صادر ہوئی ذیل میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"رسوم و رواجات، کا تعلق ملک سے اس وقت اور اس حد تک ہو سکتا ہے جب تک اور جس حد تک کہ قانون ان کی اجازت دے۔ چونکہ لوگ رسم و رواج کو اپنی خوشی سے اختیار کرتے ہیں اس لئے جب انھیں منظور ہوتا ہے ان کو ترک بھی کر دیتے ہیں۔ . . . . اگر کوئی نو عیسائی خاندان اپنے آبا و اجداد کے بعض ان رسوم کو اختیار کرنا چاہے جبکہ وہ اپنے قدیم دین پر قائم تھے تو کیا ان کا یہ فعل ناقابل تغیر اور دائمی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ لوگ اور ان کی نسلیں ایسی چیزوں میں جو بذات خود تغیر پذیر ہیں اور ان کے خیالات و جذبات اور ارادوں کے بدل جانے سے اور ضرورتوں کے مجبور کرنے سے تبدیل نہیں کریں گے؟ اگر مذہب جدید کے سبب سے دوسری اور تیسری پشت والوں کے عقیدہ اور روحانیت میں ترقی ہو اور ان کو ان کا نفس ان رسوم کی پیروی کرنے سے ملامت کرے جن کو ان کے باپ دادا مذہب جدید اختیار کرنے کے بعد بھی بجالاتے تھے تو کیا ان ترک کردہ رسوم پر مفروضات قانون کا اطلاق ہو کر اِن کو اُس خاندان کے واجب التعمیل رسوم مان لیا جائے گا؟"

برطانوی دور حکومت میں شرع اسلام کی بقا۔ اب میں اس بات کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ انگریزی حکومت نے ان مسلمانان ہند کے لئے جو اس کی رعایا ہیں کس حد تک شرع اسلام کو باقی رکھا ہے۔ جب انگریزی حکومت کا

[1] (۱۸۶۳ء) مور صاحب کے مرافعات ہند جلد ۹ صفحہ ۱۹۹ و صفحہ ۲۴۷۔

ہند میں تسلط ہونے لگا تو اس نے پارلیمنٹ سے ایک واجب التعظیم قانون نافذ کرا کے اہل ہند کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ اپنے قوانین اور رسوم سے پوری طرح متمتع ہوسکتے ہیں۔ قانون انگلستان مجریہ ۲۱ سنہ جلوس جارج سوم باب ۷، دفعہ ۱۷ کی رو سے طے پایا ہے کہ کل مقدمات جن کا تعلق اراضی کی وراثت و قائم مقامی زرلگان اور مال سے ہو اور معاہدہ کی قسم کے جس قدر معاملات صدر عدالت قلعۂ ولیم واقع بنگالہ میں دائر ہوں اگر فریقین مقدمہ مسلمان ہوں تو شرع اسلام اور اسلامی رسوم سے اور اگر فریقین ہندو ہوں تو دھرم شاستر و رواجات ہنود کی بنا پر تصفیہ ہوگا اور اگر اس قسم کے کسی مقدمہ میں ایک فریق مسلم اور دوسرا ہندو ہو تو اس کا فیصلہ "مدعی علیہ کے قانون اور رسوم شخصی پر مبنی ہوگا"۔

قانون انگلستان مجریہ ۳۷ سنہ جلوس جارج سوم باب ۱۴۲ دفعہ ۱۳ کے ذریعہ سے مدراس اور بمبئی کی صدر عدالتیں بھی اس قاعدہ کی پابند کی گئی تھیں۔ زمانۂ حال کی ہند کی مختلف پریزیڈنسیوں کی عدالہائے عالیہ (ہائی کورٹ) جن کو سابق کی صدر عدالتوں کے صیغۂ دیوانی کے معمولی ابتدائی اختیارات حاصل ہیں اسی قاعدہ[1] کے تابع ہیں۔

مفصلات یا اس رقبۂ ملک کے متعلق جو قلعۂ ولیم کی صدر عدالت کے صیغۂ دیوانی کے معمولی ابتدائی اختیارات و حدود اراضی سے خارج سمجھا جاتا تھا دفعہ ۱۵ ریگیولیشن ۴ ۱۷۹۳ء کے ذریعہ سے حکم دیا گیا کہ "وراثت اور جانشینی، نکاح اور ذات (Caste) اور تمام مذہبی رسوم اور ادارات کی نسبت اگر فریقین مقدمہ مسلم ہوں تو حکام عدالت کو تصفیہ میں ان کے عام احکام شرعی کا لحاظ کرنا ہوگا"۔

اس کے بعد ہی اسی قسم کے قوانین مدراس اور بمبئی کے مفصلات کے متعلق بھی وضع کئے گئے۔

ایکٹ ۱۲ سنہ ۱۸۸۷ء کے ذریعہ سے بنگالہ اضلاع شمال و مغربی اور آسام کے

---

[1] ہند کی صدر عدالتوں کی شاہی اسناد میں جو احکام ہندو اور مسلمانوں کی دھرم شاستر اور شرع کے نفاذ و تعمیل کے متعلق درج ہیں ان کی بابت حکام عدالت نے بمقدمہ ایچ۔ ایچ عظیم النسا بیگم بنام کلیمنٹس ڈیل (سنہ ۱۸۹۴ء) میں فیصلہ کر دیا۔ دیکھو مدراس ہائی کورٹ رپورٹ جلد ۶ صفحہ ۴۵۸۔

صوبہ کی دیوانی عدالتوں کو اختیارات عطا ہوئے اور ان کے حدود ارضی کا قیام ہوا ہے۔ اس قانون کی دفعہ ۳۳ کی ذیلی دفعہ ۱ کی رو سے قرار پایا ہے کہ اُن کل ابواب کی نسبت جن کی تخصیص اُس میں کر دی گئی ہے شرع محمدی یا دھرم شاستر کی رو سے "مقدمات کا انفصال ہو گا بجز اُس صورت کے جبکہ مسلمان اور ہندوؤں کے قانون شخصی کے کسی حصہ کو ہند کی مجلس وضع قوانین کے کسی قانون نافذہ نے بدل دیا یا منسوخ کر دیا ہو۔"

اسی دفعہ کی ذیلی دفعہ ۲ کی عبارت حسب ذیل ہے "جن اشکال[1] کی بابت ذیلی دفعہ ۱ ساکت ہو یا ملک کے کسی دوسرے قانون سے مدد نہ ملے تو عدالت کو اپنی تجویز صادر کرنے میں عدل وانصاف اور (نیک نفسی) پر عمل کرنا لازم ہے۔"

لیکن مسلمان اور ہندوؤں کے قانون شخصی کے لحاظ سے مندرجۂ بالا ذیلی دفعہ (۱) کافی نہیں ہے مثلاً اُس میں ہبہ یا ہبہ بلا معاوضہ تک کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ دفعہ ہندو یا مسلمان کے مقدمات ہبہ میں جیسی کہ صورت ہو فیصلہ کی نسبت قاعدہ تبلانے سے ساکت ہے۔ اس بنا پر عدالتوں نے یہ طے کر لیا کہ مجلس وضع قوانین کا منشا ان ابواب سے جن کی دفعۂ ہذا میں تخصیص ہوئی ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے شخصی قانون کو متعلق کرنے کا نہیں ہے اور اس اصول پر ان کے انفصال مقدمات کی روش رہی ہے بلکہ عدالتوں نے تاویل کی ہے کہ فریقین مقدمہ کے قانون شخصی کا اطلاق "عدل گستری، نصفت اور نیک نفسی" کے قاعدہ کے تحت میں دوسرے امور پر بھی ہونا چاہئے بجز اس صورت کے جبکہ اس طرح کے قانون کی کسی اصلی قانون موضوعہ سے مخالفت پائی جائے۔ چنانچہ عدالتوں نے طے کر دیا ہے کہ ایسے کل مسائل جن کا تعلق ہبہ سے ہو شرع اسلام[2] کے تابع سمجھے جائیں گے

---

[1] "جانشینی، وراثت، تزویج (عقد نکاح) ذات یا کسی مذہبی رسم یا ادارہ" یہ وہی ابواب ہیں جن کا ذکر دفعہ ۵ ارگیولیشن ۴ سنہ ۱۷۹۳ء میں ہے۔

[2] ظہورالدین سردار بنام بھاراللہ سردار (سنہ ۱۸۶۴ء) گیپ نمبر ویکلی رپورٹر صفحہ ۱۸۷، یوسف علی بنام کلکٹر آف ٹیپرا (سنہ ۱۸۸۲ء) کلکتہ جلد ۹ صفحہ ۱۳۸۔

اور ان مسائل کا احکام شرعی سے تصفیہ کرنا معدلت، نصفت اور نیک نفسی کے قاعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوائے یہ بھی تجویز ہوئی ہے کہ شرع محمدی کا نفاذ نہ صرف کسی معاملہ کے فریقین پر ہوتا ہے بلکہ اس کا اطلاق ان اشخاص پر بھی کیا جائیگا جو کوئی دوسرا مذہب رکھتے ہوں بشرطیکہ سابق کے فریقین یا کم سے کم ان میں سے کسی ایک فریق سے ان[1] کو مقدمۂ مذکور میں حق پہنچتا ہو۔

ایکٹ ۱۲ ۱۸۸۷ء کے دفعہ ۳۷ میں ان رسوم کے جواز کی تائید میں کوئی بات نہیں قرار دی گئی ہے جو عام مسائل شرعیہ کے خلاف و مغائر ہوں۔ ان پرانے قوانین میں بھی جن کو اس قانون نے منسوخ کیا ہے رسوم خارج از اسلام کی حمایت میں کسی قسم کا حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے صوبۂ بنگال کی عدالتوں نے کبھی ایسے رسوم کو جائز نہیں قرار دیا ہے جو شرع[2] اسلام کے مخالف ہوں۔

بمبئی آئین نشان ۴ بابت ۱۸۲۷ء[3] پنجاب قوانین ایکٹ (نشان ۴ بابت ۱۸۷۲ء) متعلق بہ اختیارات سماعت وحدود ارضی عدالتہائے دیوانی پنجاب، قانون عدالتہائے مدراس (نشان ۳ بابت ۱۸۷۳ء)، قانون اضلاع متوسط (نشان ۲۰ بابت ۱۸۷۵ء)، قانون عدالتہائے برہما (نشان ۱۱ بابت ۱۸۸۷ء) اور قانون اودھ (نشان ۱۸ بابت ۱۸۷۶ء) میں مجلس وضع قوانین نے بصراحت حکم دیا ہے کہ عدالتیں[4] اپنے فیصلوں کے لئے ان شرائط و رسوم کو

---

[1] عظیم النسا بیگم بنام کلیمنٹ ڈیل۔ سابق میں ذکر ہو چکا۔

[2] سرمست خاں بنام قادرداد خاں (۱۸۶۶ء) آگرہ این۔ ڈبلیو نظائر جلسۂ کاملہ مطبوعہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۳۸ (جلسۂ کاملہ کا فیصلہ آئین ۴ ۱۷۹۳ء دفعہ ۱۵ اور آئین ۳ ۱۸۰۳ء دفعہ ۱۶ (۱) پر مبنی ہے)۔ حکیم خاں بنام گل خاں کا سابق میں حوالہ دیا گیا ہے۔ جامیا بنام دیوان (۱۹۰۰ء) الہ آباد جلد ۲۳ صفحہ ۲۰

[3] یہ قانون ایکٹ ۱۲ ۱۸۶۹ء سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔

[4] دفعہ ۲۶ آئین ۴ ۱۸۲۷ء کا مطلب و حکم حسب ذیل ہے۔

"تحقیقات مقدمات میں جن چیزوں کا لحاظ کرنا لازم ہے وہ پارلیمنٹ کے ایسے قوانین اور گورنمنٹ (حکومت ہند) کے آئین ہیں جن کا مقدمہ پر اطلاق ہوتا ہو۔ اور جب کسی مقدمہ کے متعلق اس طرح کے قوانین و آئین موجود نہوں تو اس ملک کے رسم کا اطلاق کرنا چاہئے جہاں

قاعدہ تصور کریں "جو کسی گروہ یا جماعت اشخاص" کے ہاں رائج ہوں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ بنائے دعویٰ پیدا ہوئی ہو اور اگر رسم کا بھی پتہ نہ ملے تو مدعی علیہ کے قانون شخصی سے کام لیا جائے اور اگر مخصوص قانون شخصی و رواج بھی ہمدست نہوں تو عدل و انصاف اور نیک نفسی پر مقدمہ کی تجویز ہونی چاہیئے"۔ جو اہمیت کہ بمبئی کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے فیصلوں میں رسوم کو دی جاتی ہے اس کا سبب اس آئین کے بھی چند مخصوص احکام ہیں۔

دفعہ ۵ ایکٹ ۴ ۱۸۷۲ء کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"وراثت، اناث کی خاص جائداد املاک ازدواج شادی بیاہ مہر، تبنیت ولایت، نابالغی، غیر صحیح النسبی، تعلقات زناشوئی اور والدین و اولاد کے معاملات باہمی وصیت، ہبہ بذریعۂ وصیت، ہبہ، تقسیم، یا کسی مذہبی رسم و ادارہ کے مسائل میں تصفیہ کا قاعدہ امور ذیل پر مبنی ہوگا۔

(۱) کسی گروہ یا جماعت اشخاص کا رسم جو عدل و انصاف اور نیک نفسی کے منافی نہو اور جس کو کسی قانون نافذالوقت یا شخص مقتدر نے کالعدم نہ قرار دیا ہو۔

(۲) شرع محمدی جبکہ فریقین مقدمہ مسلمان ہوں بشرطیکہ اس شرع کا اتنا حصہ جو مجلس وضع قوانین کے کسی قانون کی رو سے نہ بدل دیا گیا یا منسوخ ہوا ہو یا ایسا جزو جو اس ایکٹ کے احکام و مطالب کے مخالف نہو یا ایسے رسوم سے اس میں ترمیم نہوئی ہو جن کا حوالہ اس دفعہ کے فقرہ بالا میں دیا گیا ہے۔

دفعہ ۶ کا حکم ہے کہ "اگر بعض اشکال کے لئے اور طرح سے مخصوص قانون نہ بنا ہو تو عدالت کو اپنی تجویز عدل و انصاف اور نیک نفسی پر مبنی کرنی ہوگی"۔

دفعہ ۵ ایکٹ ۲۲ ۱۸۷۵ء میں طے کر دیا گیا ہے کہ ان مسائل کے تصفیہ میں جن کا تعلق "وراثت، اناث کی خاص جائداد، منگنی، عقد، مہر، تبنیت، ولایت، نابالغی، غیر صحیح النسبی، تعلقات زناشوئی اور والدین و اولاد کے معاملات باہمی، وصیت، ہبہ بالوصیت، ہبہ، تقسیم، یا کسی مذہبی رسم یا ادارہ سے ہو اگر فریقین مسلم ہیں تو شرع محمدی بنا اور وجہ انفصال سمجھی جائے گی بجز اس صورت کے جبکہ شرع مذکور اس مجموعۂ قانون کے احکام و مطالب کے مغائر ہو.... لیکن اگر کسی گروہ یا جماعت اشخاص میں یا کسی خاندان کے اراکین یا خاندان میں ایسے رسم پر عمل ہوتا ہو جو ان لوگوں کے قانون کے مطابق نہو جن کا اس دفعہ میں ذکر ہے اور اگر یہ رواج اس قانون کے مطابق ہوتا تو اس کا وہی اثر ہوتا جو قانون ملک کا ہے تو ایسی صورت میں اس رسم کو باوصف اس مجموعہ میں اس کے خلاف کسی حکم کے موجود ہونے کے نافذ کرنا ضرور ہے"۔

دفعہ ۶ کا حکم ہے کہ "جن صورتوں میں دفعہ ۵ ساکت ہو یا بوقت ضرورت ان کے متعلق کوئی دوسرا قانون نافذہ ہمدست نہ ہو تو عدالت کو عدل و انصاف و نیک نفسی پر عمل کرنا ہوگا"۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مجلس وضع قوانین کے ان تمام قوانین میں جن کا اس فقرہ میں بالاجمال حوالہ دیا گیا ہے صریح احکام اس امر کے متعلق موجود ہیں کہ جس کسی مقدمہ کی بابت کوئی مخصوص قانون ہمدست نہو تو عدالت اس کا تصفیہ "عدل وانصاف اور نیک نفسی" کے اصول پر کرے گی۔

اطلاق ونفاذ شرع محمدی۔

یہ بات یادر کھنے کے قابل ہے کہ ہند کے کل مسلمانوں پر خواہ وہ ازروئے نسب مسلم ہوں کہ نومسلم[1] شرع اسلام کا نفاذ ہے۔ اس بنا پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ناظرینِ کتاب اسلام اور ایمان کے فرق سے واقف ہو جائیں اگر کوئی شخص اپنے کو مسلم ظاہر کرے یعنے خدا کی توحید اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اقرار باللسان کرتا ہے تو وہ شرع محمدی کا تابع سمجھا جائے گا۔ ہر ایک متنفس کا کلمۂ توحید[2] کو پڑھنا جو اصل اصول اور بنائے اسلام متصور ہوتا ہے اُس کے مسلمان قرار پانے کے لئے کافی ہے مسلمان بننے کے لئے کسی شخص کا خواہ مرد ہو کہ عورت اسلام کے کل فروعات اور رسوم کا بجالانا لازم نہیں اور نہ مخصوص اصول ومسائل میں اعتقاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہند کی برطانوی عدالتوں نے اکثر موقعوں پر مسلمانوں کے مقدمات کے تصفیہ میں اسلام وایمان کے امتیاز کو نظرانداز کیا ہے اور ایسی صورتوں میں اپنی حیثیت ایمان کی عدالتیں[3] (Courts of Conscience) قرار دی ہیں۔

---

[1] ابراہیم بنام ابراہیم کے مقدمہ میں جس کا اس کتاب کے سابق میں حوالہ دیا گیا ہے اور جو مورز انڈین اپیلز جلد ۹ صفحہ ۲۲۳ پر شائع ہوا ہے لارڈ کنگزڈن کے خیالات واعتراضات قابل دید ہیں ۱۲۔

[2] یعنے اظہار وحدانیت خدا ۱۲۔

[3] راج بہادر بنام بشن دیال سنہ ۱۸۸۲ء الہ آباد جلد ۴ صفحہ ۳۴۳ تجویز ہوئی کہ "فریقین مقدمہ کو ہندو یا مسلم قرار دینے میں ایکٹ ۶ سنہ ۱۸۷۱ء کی دفعہ ۲۴ (جس کے بجائے اب ایکٹ ۱۲ سنہ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۳۷ قائم ہوئی ہے) کے معنوں کے لحاظ سے ہم کو اس کے الفاظ کا

رسوم و تقاریب (یعنے فروعات دین) کی شان مذہبی کے قطع نظر اُن کے متعلق شہادت لینے سے اس امر کی بخوبی تحقیق ہوسکتی ہے کہ اُن کا بجا لانے والا دین اسلام کے کس مخصوص فرقہ سے تعلق رکھتا ہے اور کس فرقہ کی شرع کا اُس پر اطلاق کیا جانا چاہیئے۔

ہر ایک بالغ و بااختیار مسلم اسلام کے ایک فرقہ سے نکل کر دوسرے میں شامل ہوسکتا ہے[1]۔ تبدیل مذہب و عقیدہ کے لئے کسی رسم و تقریب کے بجالانے کی ضرورت نہیں۔ طریقۂ نماز کے ذرا سے تغیر اور شہادتین میں[2] ایک جملہ کی کمی و بیشی سے تبدیل مذہب کا اظہار ہوسکتا ہے۔

سنی اور شیعہ کا باہم عقد کرنا جائز ہے

شیعہ اور سنی کا تبدیل مذہب کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ عقد کرنا جائز ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی سنی عورت کسی شیعہ شوہر سے عقد کرلے تو جو حقوق اس کو اپنے مذہب کی رو سے پہنچتے ہیں[3] وہ ان کو اس طرح کے عقد کے بعد بھی پاسکتی ہے۔ اگر ایسی عورت حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے متعلق اس قسم کی عزاداری وغیرہ کرے جو شیعوں کے گھروں میں ہوتی ہے[4] تو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ ٹھیک ٹھیک طلاق کرنا اور اُس کا نفاذ صرف ان لوگوں تک محدود رکھنا چاہیئے جو ایک یا دوسرے مذہب کے شدید معتقد ہوں" لیکن میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ لایق ارکان عدالت العالیہ نے اس طرح رائے قائم کرنے میں غلطی کی ہے۔

[1] محمد ابراہیم بنام غلام احمد (۱۸۶۴ء) بمبئی ہائی کورٹ رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۲۳۶۔ حیات النسا بنام محمد علیخاں ۱۸۹۰ء مور ز انڈین اپیلز جلد ۱۷ صفحہ ۷۳، ملاحظہ ہو الہ آباد جلد ۱۲ صفحہ ۲۹۰۔

[2] کلمۂ شہادت کے حسب ذیل الفاظ ہیں "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کے سوائے کوئی دوسرا خدا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے رسول ہیں"۔ اِس میں شیعہ الفاظ ذیل اضافہ کرتے ہیں "اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علیؑ جو مومنین کے امیر (حاکم) اور متقین کے امام (پیشوا) ہیں رسول کے وصی ہیں"

[3] نصرت حسین بنام حمیدن ۱۸۸۲ء الہ آباد جلد ۴ صفحہ ۲۰۵ حیات النسا بنام محمد علیخاں جس کا اوپر ذکر ہو چکا۔

[4] ماہ محرم میں جو عزاداری ہوتی ہے۔

اس سے اُس کے تبدیل مذہب کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ تبدیل مذہب اُسی وقت ثابت ہوگا جبکہ وہ شیعہ طریقہ کی نماز اور کلمہ (اظہار عقیدہ) پڑھتی ہو۔

ایک مقدمہ میں کلکتہ ہائی کورٹ نے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے۔ "چونکہ ہند میں سنی مسلمانوں کی کثرت ہے اس لئے اگر کسی مقدمہ کے فریقین مسلمان ہوں تو اُن کی نسبت سنت جماعت ہونے کا قیاس کیا جائے گا تا اینکہ یہ ثابت نہ کیا جائے کہ کون فریق شیعہ ہے[1]" یہ اصول کسی قدر تامل کے ساتھ قبول کرنے کے قابل ہے۔ مثلاً ملک کے بعض حصوں میں سنیوں سے زیادہ شیعوں کی آبادی ہے اس لئے ایسے مقامات کے مسلمانوں کی نسبت اس طرح کا قیاس کرنا دشوار ہوگا لہذا میری رائے میں جب مسلمانوں کا مقدمہ عدالت میں پیش ہو تو ہر ایک فریق سے عدالت کو دریافت کرلینا چاہئے کہ اس کا کس فرقہ سے تعلق ہے اور جب فریقین اپنا مذہب ایک دوسرے سے مختلف بتلائیں تو ہر ایک کے ادعائے مذہب کی تائید میں شہادت لے کر اس امر کا تصفیہ کرے کہ امر نزاعی کس فریق کے مذہب کے قانون سے طے ہونا چاہئے۔

مسلم ہونیکا قیاس

جب کسی بچہ کے والدین سے ایک شخص مسلم ہو تو شرع محمدی کی رو سے وہ بچہ اُس وقت تک مسلم قیاس کیا جائے گا جب تک کہ وہ کسی دین کے اختیار کرنے کے قابل ہو جائے۔ (یعنے بلوغ کو نہ پہنچے) اور اس کے ورثا کا حق توریث قوانین اسلام کے تابع ہوگا بلکہ اس فرقہ اور مذہب کی شرع سے طے پائے گا جس کے معتقد اُس کے والدین ہیں۔

اگرچہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور وراثت کے لحاظ سے ایک فرقہ کا مسلم دوسرے فرقہ کے مسلم متوفی کا وارث ہوتا ہے لیکن ایسی صورتوں میں وراثت کا تصفیہ اس فرقہ کے اصول و قواعد کے مطابق کیا جاتا ہے

---

[1] بفاطون بنام ولائتی (بلائیتی) خانم سنہ ۱۹۰۳ء کلکتہ جلد ۳۰ صفحہ ۶۸۳ و صفحہ ۶۸۶۔

جس سے مورث کا تعلق ہو یا جس مذہب کے مطابق وہ عمل[1] کرتا رہا ہو۔

حق وراثت کی دست برداری کا اثر

"شرع محمدی کی رو سے مسلمان حقوق وراثت سے دست بردار ہو سکتے ہیں اور یہ ضرور نہیں کہ اس قسم کی دست برداری بالاعلان کی جائے بلکہ ایک شخص جس کو دوسرے کے مقابلہ میں وراثت کی بابت دعوی کرنے کا حق حاصل ہے سکوت اختیار کرنے یا نالش دائر کرنے میں احتراز کرنے سے معناً اپنے حق سے دست کش ہو سکتا ہے[2]"۔

لیکن اس سوال کا کیا جواب ہے کہ ایک شخص جو دوسرے کے بعد زندہ رہنے کی صورت میں اس کا وارث ہو سکتا ہے لیکن حق توریث کے حاصل ہونے کے قبل یعنے میراث آیندہ سے وہ بزمانۂ حیات مورث دست بردار ہو جاتا ہے؟ خانم جان بنام جان بی بی کے مقدمہ[3] میں ایک مسلمہ کے دو وارثوں نے اُس کے حین حیات اُن حقوق سے جو اُن کو مورثہ کی جائداد میں ملنے والے تھے بربنائے معاوضہ دوسرے ورثہ کے حق میں ایک دستاویز کی تکمیل کر کے دست برداری کی اور جب مورثہ کے مرنے کے بعد ۱۲ سال تک دوسرے ورثہ کے مقابلہ میں سکوت اختیار کیا اور بالآخر متوفیہ کی جائداد سے حصۂ شرعی پانے کی نسبت یہ دونوں عدالت میں رجوع ہوئے۔ لیکن جب صوبۂ پٹنہ کی عدالت کے افسران قانونی سے اس دست برداری کے جواز کی نسبت استفسار ہوا تو اُنھوں نے حسب ذیل جواب تحریر کیا:۔

"دست برداری سے مراد کسی شخص کا اپنے حق محصلہ سے

---

[1] دیکھو حیات النسا بنام محمد علی خاں جس کا سابق میں حوالہ دیا گیا ہے۔

[2] حرمت النسا بیگم بنام اللہ دیا خاں ۱۸۷۱ء ویکلی رپورٹر پریوی کونسل رولنگز جلد ۱۷ صفحہ ۱۰۸۔ دیکھو اس کو سنڈرلینڈ صاحب کے فیصلہ جات پریوی کونسل جلد ۲ صفحہ ۵۶۵ پر۔

[3] ۱۸۲۷ء ایس۔ ڈی۔ اے رپورٹس جلد ۴ صفحہ ۲۱۰۔ شمس الدین بنام عبدالحسین بمبئی جلد ۳۱ صفحہ ۱۵۵۔

دست کش ہوتا ہے یا ایسا شخص کسی دوسرے کے مقابلہ میں دعویٰ یا نالش دائر کرنے سے محترز و ساکت رہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ چونکہ اسی مقدمہ کے دو دعوے دار بیٹیوں کو ان کی ماں کی زندگی میں کسی قسم کا حق توریث حاصل نہ تھا اور وہ اپنی ماں کے حین حیات بر بنائے وراثت کسی دوسرے کے مقابلہ میں دعویٰ بھی نہیں کر سکتی تھیں لہٰذا اُن کا اپنی ماں کی زندگی میں حقوق میراث سے دست بردار ہونا کالعدم سمجھا جائے گا اگر اس واقعہ کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی ایک ایسی شئے دوسرے کو دی جس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس لئے اس طرح کے معاملہ سے اُن کے حقوق وراثت کا جو ان کو ماں کی وفات کے بعد حاصل ہونے والے تھے ازالہ نہیں ہو سکتا اور نہ یہ دست برداری ان کو متوفیہ کا متروکہ پانے سے مانع ہو سکتی ہے۔ مدعیوں کے بارہ سال تک دعویٰ نہ کرنے سے دعوے کو نمبر پر لینے میں کوئی قانونی ممانعت نہیں ہے[1]۔ صوبۂ مذکور کی عدالت کے افسران قانونی کی اس رائے کی صدر عدالت کے افسران قانونی نے توثیق کی اور بعد ازاں ان دونوں عدالتوں نے دوسرے مقدمات میں اس رائے پر عمل کیا۔ لیکن کھنی محمود بنام کھنی محی الدین[2] کے مقدمہ میں مدراس ہائی کورٹ نے ایک معاہدہ کی نسبت جس میں ایک آیندہ کے حق سے بر بنائے معاوضہ دست برداری کی گئی تھی تجویز کی کہ اس طرح کا معاہدہ جائز اور واجب التعمیل ہے۔

اگرچہ فیصلۂ بالا میں لائق ججوں کی رائے شرع محمدی کی رو سے جائز نہیں ہے لیکن میری رائے میں اُس شخص سے جو

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں متروکہ و میراث کی نالشات کے متعلق قانون میعاد سماعت نہیں بنا تھا اب اس قسم کے دعووں کی مدت ۱۲ سال قرار پائی ہے۔ از مترجم۔

[2] ۱۸۹۴ء مدراس جلد ۱۹ صفحہ ۱۲۶۔

اپنے حق سے دست بردار ہونے کے بعد پھر اُس کا مدعی ہو
معاوضہ یا بدل جو اُس کو دست برداری کے لئے دیا جاتا ہے
واپس لینا چاہیئے۔

اُصول
شرع محمدی
حصۂ اوّل
شرع متعلق وراثت
باب اوّل
مشاہدات عام
فصل اوّل

سُنّی اور شیعہ دنیائے اسلام دو فرقوں میں منقسم ہے سنی اور شیعہ۔ ان دونوں فرقوں کے اصل اختلاف کا باعث مسئلۂ امامت ہے جس سے مراد دینی اور دنیوی صدارت اسلام ہے سنّی اصول انتخاب کے حامی و موید ہیں اور شیعہ کہتے ہیں کہ امام یا خلیفہ کا تقرر منجانب نبی و امام ہونا چاہیئے اور امامت موروثی ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر شرع کے دو مختلف نظام یا مکتب بنے ہیں اور اگرچہ دونوں نظام فقہ کی بنیاد احکام قرآنی ہیں لیکن جن اصول کے ذریعہ سے ان احکام کی تکمیل و توسیع ہوئی ہے وہ حضرت پیغمبر اور ان کی آل پاک اور اصحاب کے احادیث و اقوال سے مستنبط ہیں لہذا دونوں فرقوں کی شرع بھی مختلف ہے۔

قانون محمدی کا ماخذ شیعہ اپنی فقہ کا ماخذ قرآن شریف اور پیغمبر برحق کی اُن احادیث کو بتلاتے ہیں جو اُن کی آل کے توسط سے اُن تک پہنچی ہیں اور جس قدر فیصلے اور فتاوی اُن کے ائمہ اور مذہبی پیشواؤں سے صادر نہیں ہوے اُن کی صحت و جواز کو وہ نہیں مانتے۔

سنیوں کی شرع کے حسب ذیل ماخذ ہیں:۔

(۱) قرآن مجید (۲) سُنت یعنے رسول اللہ صلعم کا قول و فعل اور آپ کا سکوت، اگر آپ نے کسی بات کے معلوم ہونے پر کیا ہو و نیز قول و فعل صحابۂ کرام (۳) اجماع اُمّت، یعنے کسی زمانہ میں کسی امر قولی و فعلی پر مسلمانوں کے علماء مجتہدین کا اتفاق کر لینا۔

(۴) قیاس یعنے کسی فرع کا اصل پر حکم اور علت میں اندازہ کرنا۔

فقہ شیعہ کی اشاعت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے جن کا دوازدہ امام کے سلسلہ میں شمار کیا جاتا ہے دوسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اُس کی کچھ مدت بعد سنت جماعت کی فقہ کے اصول کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی اور ان کو قواعد و ضوابط کی شکل میں ڈھالا گیا۔

وراثت کے متعلق جو رسمی قواعد زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں رائج تھے اُن کی پیغمبر عربی نے اصلاح فرمائی اور انھی اصلاحات پر شیعوں کی فقہ مبنی ہے لیکن سنیوں کی فقہ میں عرب کے ایسے رسوم برقرار رکھے گئے ہیں جن کی بنا پر ذوی الارحام محروم اور عصبات کو میراث پہنچتی تھی۔ خلیفہ معتضد باللہ کے زمانے تک ذوی الارحام یا اناث کے ذریعہ کے رشتہ دار کسی شخص متوفی کی جائداد سے حصہ نہیں پا سکتے تھے بلکہ عصبات کے موجود نہ رہنے میں جائداد متوفی بحق خلیفہ ضبط ہو جاتی تھی معتضد نے محکمۂ ضبطی کو موقوف کیا اور حکم دیا کہ اگر کسی میت کے ذوی الفروض و عصبات موجود نہوں تو متوفی کی جائداد اس کے ذوی الارحام نہ کہ خلیفہ کو ملا کرے۔

سنیوں کے چار ذیلی فرقے ہیں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ ان چاروں فرقوں میں نہ صرف مسائل مذہبی اور رسوم وغیرہ میں اختلاف ہے

اہل سنت وجماعت کے ذیلی فرقے

بلکہ ان کے مسائل فقہی اور اصول شرعی کی تاویلات بھی مختلف ہیں اس طرح اہل سنت وجماعت کی شرع کے چار ذیلی مذاہب یا نظامات ہیں۔

حنفی المذہب سُنّی امام ابوحنیفہؒ کے (جنھوں نے امام جعفرؒ سے فقہ کی تعلیم پائی تھی) اجتہاد کے مقلد ہیں۔ اس مذہب کے اصول اجتہاد خود امام ابوحنیفہ اور اُن کے کثیر التعداد علماء کے قائم کردہ ہیں جن میں امام ابویوسف اور امام محمدؒ آپ کے شاگرد مشہور ترین علماء مجتہدین ہیں۔ چونکہ ابویوسف بزمانۂ خلیفہ ہارون الرشید بغداد کے صدر قاضی (قاضی القضاۃ) ہونے کی وجہ سے فقیہ باعمل سمجھے جاتے ہیں اس لئے اکثر ایسے مسائل شرعی پر جن کا تعلق جائداد کی تقسیم و انتقال سے ہوتا ہے ان کی رائے مستند اور واجب التعمیل متصور ہوتی ہے۔ ہرچند ہند کے سنّی مسلمان زیادہ تر حنفی ہیں اس پر بھی گذشتہ چند سال سے ملک میں شافعی مذہب نے بھی خوب ترقی کی ہے۔

امام شافعی کے مقلدین شافعی کہلاتے ہیں امام صاحب نے ملک مصر میں سنہ ۸۱۹ عیسوی میں وفات پائی۔ اس فرقہ کے لوگ خصوصاً عرب، مصر اور شمالی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ بمبئی کے بواہیر کا ایک جزو اس مذہب کا پیرو ہے اور ملایا کے مسلمان بھی شافعی ہیں۔

فرقۂ مالکی امام مالک بن انس کا جن کا سنہ ۱۷۹ ہجری میں انتقال ہوا مقلد ہے۔ یہ لوگ عرب اور شمالی افریقہ میں بود و باش رکھتے ہیں۔

امام احمدؒ بن حنبل کے مقلدین حنبلی کہلاتے ہیں اور بہت کم ہیں مگر حضرموت اور عمان کے خاص خاص حصوں میں یہ لوگ آباد ہیں۔

شیعوں کے بھی چند ذیلی فرقے ہیں لیکن اندنوں لفظ شیعہ کا اطلاق اثنا عشری یعنے پیروان دوازدہ امام کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ اور اس بنا پر اُن کو

شیعوں کے ذیلی فرقے

امامیہ بھی کہتے ہیں۔ اثنا عشری کے بھی دو مختلف فرقے ہیں یعنے اصولی و اخباری[۱] اور اس وجہ سے اُن کے یہاں بھی

---

[۱] اس مقام پر ممتاز مصنف نے اصولی اور اخباری شیعوں کی فقہ کا مختلف ہونا تحریر فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ان دونوں فرقوں کی ایک ہی فقہ ہے البتہ فقہی مسائل کے استنباط کرنے کا طریقہ جداگانہ ہے۔ نیز فاضل مصنف نے اصولیوں کی جو تعریف بیان فرمائی ہے وہ اخباریوں پر صادق آتی ہے اور اخباریوں کی جو تعریف کی ہے اس کا مصداق اصولی ہیں۔ ۱۲
س۔ ع۔ ر۔

دو علیحدہ قسم کی فقہ ہے۔ اصولی صرف ان احادیث کو مانتے ہیں جو بہت سخت جانچ اور تنقیح کے بعد صحیح ثابت ہوئی ہیں اور اصول شرع کی تشریح کرنے اور ان کو روزانہ معاملات سے متعلق کرنے میں اپنی رائے کو بہت زیادہ دخل دیتے ہیں اس کے برعکس، اخباری شیعہ صرف اپنے مجتہدوں کی رائے اور تشریح پر عمل کرتے ہیں۔

فرقۂ معتزلہ

مسلمانوں میں ایک اور اہم فرقہ معتزلہ کا ہے۔ اس مذہب کے تابعین اسلام کے دوسرے فرقوں سے بالکل جداگانہ طرز پر شرع کی تشریح و تاویل کرتے ہیں۔ اس فرقہ کا بانی واصل بن عطا ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں گذرا۔

صوبۂ بمبئی کے خوجوں کا تعلق فرقۂ اسمٰعیلیہ سے ہے جو شیعوں کا ایک ذیلی فرقہ خیال کیا جاتا ہے اور اکثر بواہیر مذہب اسمٰعیلیہ کے پیرو ہیں۔ لیکن میراث کے قانون میں وہ بالخصوص ہندوؤں کے رسوم پر عمل کرتے ہیں اور جن مسائل کا تعلق انتقال جائداد بذریعۂ میراث سے ہوتا ہے ان میں وہ فقہ شیعہ کے تابع ہیں۔

اگرچہ اکثر بواہیر مذہب اسمٰعیلیہ کے پیرو ہیں لیکن وہ خوجوں کے امام کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ ان کا مذہبی پیشوا یمن میں ہے۔ ان کے بھی دو گروہ ہیں سلیمانی اور داؤدی۔ بہرحال یہ لوگ عام شرع محمدی کے اصول کے تابع ہیں۔[1]

قانون اور مذہب کا تعلق

جس قدر نظام اسلامی میں مختلف فرقے اور ذیلی فرقے ہیں اسی قدر ان کے عقائد اور شریعتیں بھی جداگانہ ہیں اس لیئے جب ایک شخص کسی ایک مذہبی فرقے سے نکل کر دوسرے میں شامل ہوتا ہے تو اس کی شریعت سابقہ بدل جاتی ہے

---

[1] ان خیالات کا گجرات کے تعلقہ دھندوکا کے سنی بوہروں پر اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اصل میں یہ لوگ راجپوت نومسلم ہیں دیکھو آیندہ حصۂ کتاب۔

اور اس کی حیثیت اور جائداد جس کو اس نے بذریۂ وصیت منتقل کی ہو اور میراث شریعت تازہ کے تابع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شیعہ سینوں کا عقیدہ اختیار کر لے تو وہ سینوں کے قانون کے تابع سمجھا جائے گا ایسا ہی ایک حنفی مسلمان شافعی ہو جائے یا ایک اصولی شیعہ اخباری بنجائے تو وہ شافعی یا اصولی مذہب کے جیسی کہ شکل ہو اصول کا پابند متصور ہوگا اور اگر شافعی و اصولی اپنا مذہب ترک کر کے حنفی و اخباری بنجائیں تو اس کے برعکس سمجھا جائے گا۔ اگر اس نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کا تمام قانون شخصی قانون نظر آئے گا۔

شیعہ اور سینوں کا فرق ظاہری

شیعہ اور سینوں کا سب سے بڑا اختلاف ظاہری ان کے نماز پڑھنے کا طریقہ ہے امامیہ مذہب والے ہاتھ چھوڑ کر (یعنے جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ہاتھوں کو رانوں پر رکھ کر) اور سنت جماعت ہاتھ سامنے کی طرف باندھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ حنفی اور شافعی مذہب والوں کا فرق ظاہری یہ ہے کہ پہلے مذہب کے اشخاص نماز پڑھنے میں آمین بالخفا اور دوسرے مذہب کے پیرو آمین بالجہر کہتے ہیں۔

چند سال سے ہند کے مسلمانوں میں ایک نیا مذہبی فرقہ نکل آیا ہے اور اُس کے پیرو اپنے کو غیر مقلدین یا نان کن فرمسٹ (منحرفین) کہتے ہیں۔ لیکن اُن کے حریف و مخالف (ازروئے عناد) ان کو بعض اوقات وہابی کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں مگر یہ نام صحیح ہے اور نہ انصاف کا مقتضا ہے کہ وہ اس طرح نامزد کیئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ غیر مقلدین کے فرقہ اور اسلام کے کسی مخصوص فرقہ میں مطابقت و مشابہت نہیں پائی جاتی البتہ مذہب شافعی کے عقائد سے اس کے عقائد کسی قدر ملتے جلتے ہیں غیر مقلدین بھی شافعیون کے مثل آمین پکار کر کہتے ہیں اور اصطلاح میں اسی قسم کی آمین بالجہر کہلاتی ہے اور نماز کے مخصوص ارکان ادا کرنے کے وقت غیر مقلد لوگ اپنے ہاتھوں کو کانوں تک لیجاتے ہیں اور اصطلاح میں یہ فعل رفع یدین کہلاتا ہے۔ بہر حال حنفی اور غیر مقلد کے درمیان نماز کے متعلق

اس طرح کے جزوی اختلافات ہیں جن کے سبب سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔[۱]
اصولی اختلافات کے سوائے غیر مقلدوں کے ہاں عموماً حنفی مذہب کا
قانون نافذ ہے۔
مذاہب اربعہ میں اگر ایک فرقہ کا سنی مسلمان دوسرے فرقہ کے
امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کی نماز جائز[۲] ہے۔

دوسری فصل

جائداد موروثی اور مکسوبی میں کوئی فرق نہیں ہے

قانون اسلام کی رو سے جائداد موروثی اور مکسوبہ میں فرق نہیں ہے۔ ہر ایک مسلم اپنی جائداد کا خواہ وہ اُس کے قبضہ میں از روئے وراثت آئی ہو کہ اس نے اسے اکتساب کیا ہو مالک مطلق سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے موافق اس جائداد کو بذریعہ بیع منتقل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس طرح کا معاملہ اس کے حین حیات انجام پایا ہو۔ صرف ان صورتوں میں جبکہ واہب کی نیت اپنی وفات کے بعد جائداد یا (حق) کو منتقل کرنے کی ہو یا میت نے اپنی حیات کے آخر وقت یعنے بوقت مرگ کسی شئے کو ہبہ کیا ہو میت کے ورثا کے حقوق کے لحاظ سے اس کا اپنی جائداد کو منتقل کرنے کا اختیار صرف ثلث کے ہبہ وعطا تک محدود سمجھا جاتا ہے۔

اناث جو درجہ (رشتہ) میں ذکور کے مساوی اور بوقت میراث موجود رہتی ہیں (یا نیچے رشتہ کی عورتیں جو مردوں کے ساتھ میراث پانے کی مستحق ہوتی ہیں) ذکور سے کم حصہ پاتی ہیں لیکن بلکا ورصیت کے ذریعہ سے

---

[۱] فضل کریم بنام حاجی مولا (۱۸۹۱ء) لا رپورٹس انڈین اپیلز جلد ۸ صفحہ ۵۹ سدر لینڈز کیسز (نظائر مرتبہ سدر لینڈ صاحب) انڈین لا رپورٹس سلسلہ نظائر کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۴۴۸۔

[۲] اسی مقدمہ میں یہ اصول بھی طے پایا ہے۔

جائداد کے منتقل کرنے کے اختیار میں اور جو حق کہ ان کو کسی میت کی میراث میں پہنچتا ہے اُن پر تصرف کرنے میں وہ ذکور کے مساوی سمجھی جاتی ہیں اسی طرح بیوہ اپنے حصہ میں جو اُس کو اُس کے شوہر متوفی کی جائداد میں ملتا ہے مطلق و ناقابل ابطال حق رکھتی ہے یعنے وہ اُس کی مِلک مطلق سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح قانون اسلام میں بلحاظ وراثت، جائدادِ منقولہ و غیر منقولہ میں امتیاز نہیں کیا جاتا ہے لیکن ایک شکل میں اس طرح کا فرق کیا جاتا ہے اور اس کا شیعوں کے قانون سے تعلق ہے۔

قیاس شرکت کا نہونا

مسلمانوں کی نسبت مِلک وغیرہ میں اشتراک[1] کا قیاس نہیں ہو سکتا اس پر بھی ہند کے بعض حصوں میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے خاندان مشترکہ کے طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اکثر ایسے گھرانوں میں جو پہلے ہندو تھے اور بعد ازاں مسلم ہو گئے ابھی تک ان کے قدیم ہندو مراسم جاری ہیں اور اسی بنا پر وہ مشترک زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس طرح کے مقدمات میں طے پایا ہے کہ فریقین کے حقوق قانونی ہندو خاندان مشترکہ[2] کے اصول کے تابع سمجھے جائیں گے جن مسلمان گھرانوں نے ہندوؤں کے رسوم اختیار کر لیئے یا جن ہندو خاندانوں نے اِسلام قبول کرنے کے بعد اپنے ہندو رواجات کو جاری رکھا اُن لوگوں نے اپنی ضرورت اور خواہش کے موافق ان قدیم رسوم میں ضرور تبدیل و ترمیم کی ہے لہذا نہ عدالت اس امر کی پابند ہے اور نہ اس طرح کی پابندی انصاف پر مبنی

---

[1] حکیم خاں بنام گل خاں (سنہ ۱۸۸۲ء) نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۸۲۳ (نظائر سدرلینڈ) کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۷۰۳ جوالا بخش بنام دھرم سنگھ سنہ ۱۸۶۶ء مورز انڈین اپیلز ضمیمہ صفحہ ۱۹۵۔ ذاکر علی چودھری بنام راجیبندا سین سنہ ۱۸۸۲ء نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۹۳۱۔

[2] حسینہ بی بی بنام عزیز النسا بی بی سنہ ۱۸۶۹ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۱ صفحہ ۴۵۔

ہو سکتی ہے کہ جس قدر قواعد اور قیاسات ہندو خاندان مشترکہ سے متعلق ہیں ان سب کا اطلاق کسی ایسے مسلم خاندان پر کرے جس کے ارکان مشترک زندگی بسر کرتے ہوں[1]۔

محض یہ بات کہ ایک مسلم خاندان کی زندگی مشترک ہے اور جائداد پر ان کا مشترک قبضہ ہے ان قیاسات کو پیدا کرانے کے واسطے کافی نہیں ہو سکتی جو قانون ہنود میں زندگی مشترکہ سے پیدا ہوتے ہیں[2]۔

لیکن جس مسلم خاندان کے ارکان مشترک زندگی بسر کرتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ جو جائداد ان کو مورث اعلیٰ سے ارثاً ملی ہے اس کے وہ مشترک قابض ہیں تو اس خاندان کا رکن منتظم جائداد موروثی کا اپنے کو تنہا مالک نہیں قرار دے سکتا اور نہ دوسرے ارکان کے حقوق کی نسبت قانون میعاد کی رو سے تمادی عارض ہونے کا عذر کر سکتا ہے[3]۔

جب ایک ہندو خاندان کئی پشت پہلے مسلمان ہوا ہو اور اس خاندان کی ایک مسماۃ وراثت کے متعلق دعویٰ کرے جس کے جواب میں دوسرے ورثا رواج خاندانی کو پیش کر کے اس کو محروم کرنا چاہیں تو عدالتوں کا فرض ہے کہ اس طرح کے مقدمہ کو شرع محمدی کے مطابق فیصل کریں اور اس عذر رواج کو منظور نہ کریں جو شرع مذکور کے خلاف ہو[4]۔

مدراس ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ میں تجویز کی ہے کہ اگر متوفی کے ورثا خاندان کے اناث کو میراث سے محروم کرنے کی غرض سے کوئی رواج خاندانی پیش کریں تو بتلانا چاہیئے کہ اس خاندان نے سوچ سمجھ کر اس رواج کو اختیار کیا

---

[1] صدارت النسا بنام مجیدہ خاتون ۱۸۷۸ء نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۳ صفحہ ۶۹۴ ایس سی۔ کلکتہ لارپورٹ جلد ۲ صفحہ ۲۰۸ نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۵۶۲ -

[2] عبدالودود بنام محمد محل ۱۸۸۴ء -

[3] حسینہ بی بی بنام عزیز النسا بی بی جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

[4] سرمست خاں بنام قادر خاں ۱۹۲۶ء آگو جلد ا (این۔ ڈبلیو۔ پی) الف۔ بی۔ آر جلد ۹ ۳ مطبوعہ ۱۸۷۴ء صفحہ ۲۹۔ جمیا بنام دیوان ۱۹۰۰ء انڈین لارپورٹس سلسلۂ الہ آباد جلد ۲۳ صفحہ ۲۰۔

اور مثل قانون کے وہ اُسی خاندان میں نافذ ہے اور اُس کے سبب سے وہ کل ضرورتیں پوری ہوتی ہیں جو ایک جائز رسم کے اختیار کرنے سے انجام پاسکتی ہیں[1]۔

شرع محمدی کے عوض رسم و رواج کا نفاذ

لیکن ملک کے جن حصوں میں خاندانوں کے بجائے ہندوؤں کی بڑی بڑی آبادیوں نے دین اسلام اختیار کرکے مسائل وراثت میں شاستر پر عمل کیا ہے اُن کے مقدمات وراثت کا تصفیہ اصول بالا کے خلاف کیا گیا ہے چنانچہ بمبئی کی ہائی کورٹ نے باتباع فیصلۂ صدر عدالت بمبئی جو اُس نے خوجوں اور میمنوں کے ایک مشہور مقدمہ میں صادر فرمایا ہے تجویز کی ہے کہ جب انھی دو فرقوں کے درمیان نزاعاتِ میراث کے فیصلہ کی ضرورت پیش آئے اور کسی ایسے رسم کے متعلق جو دھرم شاستر کے خلاف ہو بذریعۂ ثبوت (منجانب مدعی) عدالت کو اطمینان نہ دلایا جائے تو عدالت کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے قانون وراثت وجانشینی کے مطابق ان کا تصفیہ کرے[2]۔

یہی اصول تعلقۂ دھندوکہ واقع ضلع گجرات کے سنی بوہروں اور ضلع بروچ کے مولے سلام گراسیوں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ یہ دونوں فرقے ابتدأً راجپوت تھے لیکن اُنھیں مسلمان ہوکر چند صدیاں گذری ہیں۔

وراثت کے ایسے دعاوی جن کی بنا ناجائز رسوم اور اخلاق قبیحہ پر رکھی گئی ہو یا جن رسوم کی شرع محمدی سے ممانعت و مذمّت کی گئی ہو وہ ناجائز اور خلاف شرع خیال کیے جاتے ہیں۔

---

[1] میرا بی بی بنام دلایانا ۱۸۸۵ء مدراس جلد ۸ صفحہ ۴۶۴۔

[2] دیکھو ہیرا بائی بنام سونا بائی ۱۸۴۵ء پیری صاحب کے مقدمات مشرق صفحہ ۱۱۰ ہر بائی بنام گور بائی ۱۸۷۵ء نظائر بمبئی ہائی کورٹ جلد ۱۲ صفحہ ۲۹۴ رحمت بائی بنام ہر بائی ۱۸۷۷ء بمبئی جلد ۳ صفحہ ۳۴ عائشہ بائی بنام حاجی طیب ۱۸۸۲ء بمبئی جلد ۹ صفحہ ۱۱۵ محمد صدیق بنام حاجی احمد ۱۸۸۵ء بمبئی جلد ۱۰ صفحہ ۱۔

مورث (متوفی) کے قابل توریث اور ناقابل توریث قرابتداروں میں امتیاز کرنے کی غرض سے فریقین (یعنے سنی اور شیعہ) میں یہ ایک مسلمہ قاعدہ

اصول تفریق

ہے کہ جب ایک مسلم کی وفات کے بعد اس کے ایسے دو قرابتدار باقی رہیں جن میں کا ایک دوسرے کے توسط سے میت کا وارث قرار پاتا ہو تو پہلا شخص دوسرے شخص کے حین حیات میراث نہیں پا سکتا مثلاً ایک میت کے ایک لڑکا اور پوتا موجود ہوں تو پوتا جبکہ اس کا باپ زندہ ہے دادا کا وارث نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کلیہ کا ایک استثنا ہے۔ اہل سنت کی شرع کے مطابق ماں کی موجودگی میں میت کے اخیافی بھائی اور بہنیں محروم الارث نہیں ہو سکتے۔

اسی غرض سے ایک دوسرا قاعدہ بنا ہے یعنے قرابت قریبہ قرابت بعیدہ کو محروم کرتی ہے۔ اگرچہ یہ قاعدہ پہلے قاعدے میں مضمر ہے لیکن اس کو فریقین مانتے ہیں مگر چونکہ دونوں کے ہاں تقسیم ورثا میں سخت اختلاف ہے اس لئے اس قاعدہ کے اطلاق میں بھی بے انتہا فرق ہے مثلاً سنیوں کے ہاں ورثا کی دو قسمیں ہیں یعنے عصبات اور ذوی الفروض اور پھر عصبات اور ذوی الارحام کی ذیلی تقسیم اولاد، اجداد اور مساوی درجہ کے قرابتداروں میں ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی تقسیم کا مقصد سلسلۂ وراثت بتلانا ہے اور اس قاعدہ کا ہر ایک طبقہ کے ورثا پر اطلاق ہوتا ہے لیکن سنیوں میں متوفی کی فرع کو اس کی اصل پر ترجیح دیجاتی ہے یعنے ایک متوفی کا بیٹا اُس کے باپ پر بحیثیت عصوبت ترجیح پاتا ہے اس لئے دوسرے ذوی الفروض کے حقوق دینے کے بعد جس قدر ترکہ باقی رہتا ہے وہ بربناء عصوبت کل بیٹے کو ملتا ہے مگر باپ کو بربناء عصوبت کچھ نہیں ملتا۔

اسی طرح شیعوں میں ورثا کے تین طبقات ہیں لیکن ان کے ہاں عصبات اور ذوی الارحام کا فرق نہیں ہے۔ ان میں کے ہر ایک طبقہ کی پھر دو شاخیں کی گئی ہیں۔ قاعدۂ بالا کا ان تین مختلف طبقات کے ورثا پر اطلاق کیا جاتا ہے لیکن ایک ہی طبقہ کی دو مختلف شاخوں کے

ورثا پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا مثلاً میت کے والدین اور اولاد ایک ہی طبقۂ اولیٰ کے ورثا ہوتے ہیں اور یہی اس طبقہ کی دو شاخیں بھی ہیں لہٰذا پوتا اگرچہ وہ میت کے باپ کا حاجب نہیں ہے لیکن دادا یا بھائی پر میراث پانے میں مرجح سمجھا جائے گا باوجود اس کے کہ دونوں قرابت دار اس سے زیادہ میت کے قریب کے عزیز ہیں لیکن ان کا دو مختلف طبقات سے تعلق ہے اس لئے یہ محروم کیئے جائیں گے۔ اسی طرح دادا پوتے کا حاجب نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں ایک ہی طبقہ کی دو شاخیں ہیں۔ اس طرح قاعدۂ مذکور کا اطلاق تقسیم ورثا کے تابع ہے یعنے شیعہ اور سینوں میں جس طرح ورثا کے مختلف طبقات قائم کیئے گئے ہیں اُن کے مطابق ہر ایک فرقہ اس کا اپنے ورثا پر اطلاق کرتا ہے اور اسی بنا پر اس کے متعلق دونوں مذہبوں میں اختلاف ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بتدریج اس امر کا انکشاف ہوگا کہ اہل السنن کے یہاں صرف عصبات ذکور کی وراثت میں قرابت قریبہ قرابت بعیدہ کی حاجب ہوتی ہے اس کے برعکس شیعوں میں قاعدۂ قربت کا اطلاق بلا لحاظ طبقہ و جنس ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص فوت ہو اور ورثا میں ایک بھتیجا، ایک

فریقین کا عملی اختلاف

بھائی کا پوتا اور اپنا ایک نواسا اپنے بعد چھوڑ جائے تو سنی مذہب کے مطابق گو بھتیجا اور بھائی کا پوتا دونوں عصبہ ہیں مگر اقرب ہونے کی وجہ سے بھتیجا میراث کا مستحق ہوگا اور بھائی کا پوتا محروم رہے گا اور نواسا چونکہ ذی رحم ہے اس لئے وہ کسی عصبہ کی موجودگی میں مستحق میراث نہ ہوگا۔ اس کے خلاف شیعوں میں نواسہ قرابت قریبہ کے سبب سے میت کے ان دوسرے ورثا کا حاجب ہوگا۔

اس طرح متوفی کے پس ماندوں کا حق وراثت بلحاظ حالات بدلتا رہتا ہے۔ اصول متذکرۂ صدر کی بنا پر میت کے بعض رشتہ دار بالکل محروم ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے حصص کی مقدار دوسرے برابر کے رشتہ داروں کی موجودگی سے خواہ اُنھیں متروکہ میں حصہ ملے کہ نہ ملے گھٹ جاتی ہے۔ لیکن

سنی اور شیعہ دونوں کے یہاں ایسے ورثا کا ایک طبقہ ہے جو وراثت سے کبھی محروم نہیں ہو سکتا خواہ ان کے سہام میں ایک دوسرے سے کتنا ہی تجاوز کیوں نہ ہو۔ یہ طبقہ ذوی الفروض کہلاتا ہے اور اس میں حسبِ ذیل قرابت دار شریک ہیں:-

باپ۔ دادا۔ ماں۔ دادی۔ اخیافی بھائی۔ اخیافی بہن۔ بیٹی۔ پوتی، سگی بہن، علاتی بہن۔ زوج اور زوجہ،

مسئلہ قائم مقامی کا نہ تسلیم کیا جانا

لیکن شیعہ اور سنی دونوں کے ہاں ایک عام قاعدہ ہے کہ وہ مسئلہ قائم مقامی کو نہیں مانتے مثلاً اگر الف کے دو لڑکوں میں سے ایک اُس کے سامنے فوت ہو اور کچھ اولاد چھوڑ جائے تو الف کی وفات کے بعد اس کی وراثت میں یہ اپنے پدر متوفی کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دادا کی میراث پانے میں اُن کا چچا اُن کا حاجب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی میت کے ایک لڑکے کے دو بیٹے (یعنے دو پوتے) یا بھائی کے دو بیٹے (یعنے دو بھتیجے) اور دوسرے لڑکے یا بھائی کے تین بیٹے (یعنے تین پوتے یا بھتیجے) بوقت وفات موجود ہوں اور اُن کے سوائے کوئی دوسرا قرابت دار نہ ہو تو پانچ پوتوں یا بھتیجوں میں جیسی کہ صورت ہو متروکہ کی تقسیم علی السویہ بالرؤس نہ کہ بالنسب ہوگی۔ لیکن ذوی الارحام کی وراثت میں ایک حد تک اصول قائم مقامی کا لحاظ کیا جاتا ہے مثلاً جب میت کی سوتیلی خالاؤں کو وراثت ملتی ہے تو ان کو میت کی ماں کا پورا حصہ ملتا ہے اس کے علاوہ اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں۔

وراثتِ فرزند اکبر کا قاعدہ ایک حد تک شیعہ، شافعی اور مالکی مذاہب میں جاری ہے۔ اُن کے ہاں متوفی کا فرزند اکبر متوفی کے گھوڑے ہتھیار زرہ بکتر اور قرآن شریف کا تنہا وارث ہوتا ہے اس طرح متوفی کی دوسری اولاد کے مقابل میں اُس کو ایک امتیاز حاصل ہے لیکن اس کے برعکس حنفی مذہب میں اس امر کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔ اہل ہند کے بعض خاندانوں میں

جیسا کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رواج ہے بربنائے رسم متوفی کی پوری جائداد اس کے فرزند اکبر کو ملتی ہے۔

چنانچہ اسمٰعیلیہ فرقہ وراثت فرزند اکبر کے قاعدہ پر عمل کرتا ہے۔

حق وراثت محصلہ سے دست بردار ہونے کا اثر

چونکہ قانون ملک کے زیر اثر وارث اپنے حق وراثت سے مستفید ہوتا ہے اس لیئے اگر کوئی شخص اس حق کے حاصل ہونے کے بعد اُس سے فی الواقع دست بردار ہو جائے تو اُس کو اپنے عہد پر قائم رہنا لازم ہے لیکن جن لوگوں کو وہ حق وراثت دست برداری کرنے والے کے ذریعہ سے پہنچتا ہے اُن پر اُس دست برداری کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے بشرطیکہ قانون میعاد سماعت کی رو سے اُن کا حق ارجاع نالش زائل نہ ہو گیا ہو مثلاً میت کے ورثا میں سے ایک وارث اپنے حصۂ میراث سے دست بردار ہو جائے تو وہ اپنے ورثا کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتا اور اس لیئے اس کی وفات پر اس کے ورثا اس حق کے پانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں (لیکن یہ حق بہر نوع قانون میعاد سماعت کے تابع رہے گا) لیکن اگر دست برداری کے معاوضہ میں دست برداری کرنے والے نے کوئی بدل پا لیا ہو تو سمجھا جائے گا کہ اُس نے اپنے حق یا جائداد کو اپنی حیات میں دوسروں کو منتقل کر دیا اور اس لیئے دست بردار ہونے والے شخص کے ورثا اُس دست برداری کے پابند سمجھے جائیں گے۔

شرع محمدی میں ایسے حقوق کا جو کسی شخص نامزد شدہ کے بعد دوسروں کو پہنچتے ہیں لحاظ نہیں کیا جاتا

اصل شرع محمدی کی رُو سے جس میں تفسیر و شرح کا دخل نہیں ہے ایسے حقوق کا وجود پذیر ہونا ناممکن ہے جو ایک شخص یا چند اشخاص معین کو مالک جائداد کی وفات کے بعد حاصل ہونے والے ہیں یعنے مورث کی زندگی میں ورثا کو حق توریث نہیں پیدا ہوتا اور نہ ورثا اپنے اس آیندہ کے حق کو کسی دوسرے کو منتقل کر سکتے ہیں بالفاظ دیگر مالک کے حین حیات اُس کے ورثا اُس کی ملک میں جو اُنھیں میراث میں

ملنے والی ہے نہ تو خود کسی قسم کا حق رکھتے ہیں اور نہ اُن حقوق کو جو مورث کی وفات کے بعد اُس کی ملک میں اُنھیں ملنے والے ہیں وہ کسی دوسرے کو منتقل کرنے کے مجاز ہیں[1]۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طرح کا انتظام بذریعہ وصیت کرنا چاہے کہ اپنی جائداد الف کو بدیں شرط ہبہ کرے کہ الف تاحیات اُس پر متصرف رہکر اس سے متمتع ہوتا رہے اور اُس کی وفات کے بعد وہ جائداد الف کے ورثا یا کسی غیر شخص کو ملے تو اُس کے اس انتظام کی نسبت شرع محمدی کی رو سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔

فصل تیسری

شرع محمدی کے مطابق میت کے قرضہ جات کی ادائی اور وصایا کی تعمیل کے پہلے میت کے متروکہ سے اس کے تجہیز و تکفین کے مصارف کا ادا کیا جانا لازم ہے۔ ان اخراجات کو وضع کرنے کے بعد متوفی کے قرضہ کی ادائی ہونی چاہیئے اور اس کے بعد متوفی کی وصیت کی بنا پر اگر کوئی جائداد یا متروکہ سے کوئی حصہ کسی اور کو ہبہ کیا گیا ہو تو اُس کی تعمیل واجب ہوتی ہے اور ان فرائض شرعیہ کی بجاآوری کے بعد میراث ورثا میں تقسیم ہوسکتی ہے۔

اخراجات تجہیز و تکفین

مرض الموت کے علاج وغیرہ کے اخراجات غیر مودی مثلاً تنخواہ ملازمین اور اجرت اجیران یہ دین میت کے ذمہ ہوتا ہے اس کی' اور دوسرے' قرضوں کی ادائی اور وصیت کی تعمیل کے بعد جو مال باقی رہتا ہے وہ اُس کا مال متروکہ ہے'۔

---

[1] عبد الواحد خاں بنام مسماۃ نورن بی بی ۱۸۸۵ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۱۲ صفحہ ۹۱ کے علاوہ دیکھو حسن علی بنام نجو ۱۸۸۹ء نظائر قانون ہند سلسلۂ الہ آباد جلد ۱۱ صفحات ۴۵۶ و ۴۵۸۔

ایکٹ ۵ سنہ ۱۸۸۱ء کی دفعات از ۱۰۱ تا ۱۰۵ کے تابع جن کا تعلق نقل معدد ۃ وصیت اور اہتمام ترکہ سے ہے اور جو ملک ہند کے لیئے نافذ کیا گیا ہے مسلم متوفی کی جائداد ہے اور اُن کے مطابق اُس کی تقسیم وغیرہ ہوتی ہے اور اِن احکام سے شرعِ محمدی کے مسائل کی بخوبی وضاحت ہوگئی ہے۔

چونکہ کسی مسلمان کو اپنے مال وجائداد سے ایک ثلث سے زیادہ بذریعہ وصیت منتقل کرنے کا شرعًا اختیار نہیں ہے[1]۔

لہذا وصیت کے ذریعہ سے جائداد کا ایک ثلث سے زیادہ ہبہ کرنا جائز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر کسی میت نے وصیت کے ذریعہ سے اپنی جائداد کو منتقل کیا ہو تو بجز ایک ثلث کے دوسرے دو ثلث پر وراثت بلا وصیت کا اطلاق ہوگا۔

حق توریث کا پیدا ہونا

شخص مسلم کی وفات کے بعد ہی اُس کی جائداد اس کے ورثاء کو پہنچتی ہے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے مخصوص حصہ کا خواہ متوفی کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کی تقسیم ہوئی ہو کہ نہو مالک مطلق متصور ہوتا ہے۔ جو حق کہ ورثاء کو اس طرح پہنچتا ہے وہ جائداد کی تقسیم اور میت کے قرضہ کی ادائی پر منحصر نہیں ہے[2] لیکن شرعًا اُس متروکہ میں جو مستغرق بدین ہو قبل ادائی دین ورثا کو حق پیدا نہیں ہوتا یعنے ورثا اُس ترکہ کے مالک نہیں ہو جاتے۔

وارث شرعی کو اپنے حصہ پر تصرف کرنے کا حق

اہتمام ترکہ کے زمانہ میں ورثا کو اگر اس امر کا اطمینان ہو کہ میت کے قرضوں کی ادائی کے بعد اس قدر متروکہ بچ رہے گا کہ وہ آپس میں اُس کو تقسیم کرسکیں گے تو ہر ایک وارث اپنے حصہ کو بذریعہ بیع یا رہن کسی دوسرے پر منتقل کرسکتا ہے اور منتقل الیہ کے لیئے اس طرح کی جائداد

---

[1] اس کے متعلق اس کتاب کا وہ باب جس میں وصیت کی بابت فقہ بیان کی گئی ہے ملاحظہ طلب ہے ۱۲۔

[2] جعفری بیگم بنام امیر محمد خان سنہ ۱۸۸۵ء نظائرِ قانون ہند سلسلۂ الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۸۲۲ اور اس کے علاوہ نظائر کی اسی جلد کے صفحات ۸۳۸ و ۸۳۹ قابل ملاحظہ ہیں۔

یا حق حاصل کرنا جائز ہوگا اور ایسی صورت میں مورث متوفی کے حقیقی قرضہ جات کا لحاظ نکرنا ورثاء کے حق میں مضر نہیں ہو سکتا[1]۔ دائن یا قرض خواہ اگرچہ کہ دین مہر کی بابت ہی کیوں نہو میت کی جائداد پر جس کو وارث شرعی نے بذریعہ بیع یا رہن کسی دوسرے کو منتقل کیا ہو اور اُس نے نیک نیتی سے قیمت دے کر اُس کو خریدا یا رہن لیا ہو حق نہیں رکھتا اور نہ ایسے منتقل الیہ کے مقابلہ میں دعویٰ کر سکتا ہے[2]۔ لیکن شرعًا مال متروکہ دین ذمگی میت سے سبکدوش نہیں ہوتا بلکہ دائن کو حق ہوتا ہے کہ متروکہ منتقل کردہ شدہ سے ایفا دین کرائے جانے کا دعویٰ کرے۔

اگر کوئی دائن میت کی جائداد پر دعویٰ کرے اور دوران مقدمہ میں جائداد مذکورہ منتقل ہو جائے تو اُس ڈگری (حکم) کی پابندی جو جائداد مذکورہ کے خلاف صادر ہو منتقل الیہ پر لازم ہے[3]۔ لیکن مسئلۂ انتقال جائداد دوران مقدمہ کا تعلق صرف جائداد غیر منقولہ سے ہے۔

دعویٰ قرضہ

چونکہ شرع محمدی کی رو سے ایک وارث دوسرے وارث کا قائم مقام نہیں ہو سکتا اس لئے جائداد متوفی کے مقابل قرضہ کے دعویٰ میں جملہ ورثاء کو فریق بنانا لازم ہے۔ اگر محض کسی ایک وارث کے مقابلہ میں ڈگری حاصل کی جائے تو جب تک منجانب دائن

---

[1] اُسی مقدمہ میں بسنت رام مارواڑی بنام کمال الدین ۱۸۸۵ء نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۱۱ صفحات ۴۲۱ و ۴۲۸ کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۲۔

[2] بضاعت حسین بنام دولے چند ۱۸۷۸ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۵ صفحہ ۲۱۱۔ مسماۃ وحید النسا بنام مسماۃ شب براتن ۱۸۷۰ء بنگال لا رپورٹ جلد ۶ صفحہ ۵۴۔ کیمبل بنام ڈی لانی رپورٹ مرتبہ مارشیل ۱۸۶۳ء صفحہ ۵۰۹ ۔۱۲۔

[3] بضاعت حسین بنام دولے چند جس کا حوالہ ابھی دیا گیا ہے۔ یٰسین خاں بنام محمد یار خاں ۱۸۷۹ء نظائر قانون ہند سلسلہ الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۵۰۴ اس کے ساتھ قانون انتقال جائداد نشان ۵۲ بابتہ ۱۸۸۲ء ملاحظہ طلب ہے۔ بھولا ناتھ بنام مقبول النسا ۱۹۰۳ء نظائر قانون ہند سلسلہ الہ آباد جلد ۲۶ صفحہ ۲۸۔

یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ایسا وارث دوسرے تمام ورثاء کی رضامندی سے اُن کا قائم مقام اور جائداد متوفی کا قابض و منتظم ہے وہ ڈگری کا تنہا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

الہ آباد ہائی کورٹ نے اس اصول کو اختیار کر کے اس پر عمل کیا ہے اور اپنی ایک تجویز میں اُس کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ”جب ڈگری کا کسی متوفی مسلمان کے قرضہ جات سے تعلق ہو اور اُس میں مقدمہ کے نزاعی یا غیر نزاعی یعنے دعوی کی جواب دہی کا لحاظ کیا گیا ہو کہ نہ کیا گیا ہو اور اُس کو عدالت صرف اُن ورثاء کے خلاف صادر کرے جن کے قبضہ میں کلاً یا جزاً جائداد مذکورہ ہو تو ایسی ڈگری کا دوسرے ورثاء پر جو بسبب غیر حاضری یا کسی اور وجہ سے جائداد پر قابض نہ ہوں اور فریق مقدمہ نہ بنائے گئے ہوں پابندی لازم نہیں ہے اس لئے جب اس طرح کی جائداد بصیغہ نیلام بیع کی جائے تو اس قسم کے ورثاء کا حق خریدار جائداد کو منتقل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس طرح کے ورثاء خریدار بذریعۂ نیلام دعوی کر کے جائداد کے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ مورث کا قرضہ جو اُن کے حصہ میں آئے ادا نکریں[1]۔

لیکن اس کے برعکس کلکتہ ہائی کورٹ نے باتباع قانون انگلستان ایک مقدمہ میں جس میں ایک یا ایک سے زیادہ ورثاء کے مقابلہ میں جو جائداد متوفی پر قابض تھے ادائی دین متوفی کا دعوی کیا گیا تھا دعوی کو نالش اہتمام ترکہ تصور فرمایا اور ڈگری کی تعمیل اُن ورثاء پر بھی لازم قرار دی جن کا متوفی کی کل یا جزوِ جائداد پر قبضہ نہیں تھا بشرطیکہ اس طرح کے غیر حاضر اور بیدخل ورثاء کی جانب سے صدور ڈگری کے متعلق مدعی کی سازش یا فریب ثابت نہ کیا جائے[2]۔ بمبئی ہائی کورٹ نے بھی مسلک شمار قانون کی

---

[1] نظیر جعفری بیگم بنام امیر محمد خاں پر جس کا ابھی اس کے پہلے حوالہ دیا گیا ہے محمد ادریس بنام ہر سہائے (سنہ ۱۸۸۵ء) میں عمل کیا گیا اور یہ دوسری نظیر نظائر قانون ہند سلسلہ الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۱۶۷ پر شائع ہوئی ہے۔ یہی اصول دتو مل بنام ہر داس میں طے ہوا ہے جو (سنہ ۱۹۰۱ء) میں الہ آباد جلد ۲۳ صفحہ ۲۶۳ پر شائع ہوا ہے۔

[2] موتی جان بنام احمد علی (سنہ ۱۸۸۲ء) نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۳۷۰۔ امیر دلہن بنام بیجناتھ سنگھ (سنہ ۱۸۹۴ء) نظائر قانون ہند سلسلہ کلکتہ جلد ۲۱ صفحہ ۳۱۱۔

مشابہت میں اسی قسم کے اصول واثر کو جائز قرار دیا ہے[1]۔ مدراس ہائی کورٹ نے بھی بمبئی ہائی کورٹ کے اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے[2]۔

متوفی کی جائداد کو آپس میں تقسیم کر لینے کے بعد متوفی کے قرضوں کی ادائی کے ورثاء اپنے اپنے حصوں کی مناسبت سے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی دائن صرف چند ورثاء پر دعوی کرے تو اس کو اس مناسبت سے ڈگری دی جائے گی جس قدر متروکہ اُن ورثاء کے حصہ میں آیا ہو[3]۔

جس اختلاف کا کہ فقرات بالا میں ذکر ہوا ہے اس کا سبب متوفی کا بذریعہ وصیت کسی کو اپنا وصی مقرر نہ کرنے یا عدالت کی جانب سے متوفی کی جائداد کے لئے مہتمم کا تقرر نہ کیا جانا ہے۔ کیونکہ جب کوئی وصی یا مہتمم مقرر ہوتا ہے تو ازروئے قانون وہ متوفی کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور دائن کو لازم ہے کہ اُس کے نہ کہ ورثاء کے مقابلہ میں دعوی کرے۔

مسلم متوفی کا وصی اُن قرضوں کے متعلق دعوی کر سکتا ہے جو جائداد متوفی کو وصول طلب ہوں لیکن وصیت نامہ کی نقل مصدقہ حاصل کرنے کے بغیر وہ اُس ڈگری کی رقم حاصل نہیں کر سکتا جو بحق جائداد صادر ہوئی ہو[4]۔

اسی طرح مسلم میت کے ورثاء اجازت نامۂ اہتمام ترکہ حاصل کرنے کے بغیر مورث کے وصول طلب قرضوں کا دعوی کر سکتے ہیں۔ لیکن قانونِ صداقت نامہ جانشینی یعنے ایکٹ ۷ سنہ ۱۸۸۹ء کی رو سے جب تک

---

[1] خورشید بی بی بنام کیسو ونایک سنہ ۱۸۸۷ء نظائر قانون ہند سلسلہ بمبئی جلد ۱۲ صفحہ ۱۰۱۔
داوا لالا دا بنام بھیما جی ڈھونڈ سنہ ۱۸۹۵ء نظائر قانون ہند سلسلہ بمبئی جلد ۲۰ صفحہ ۳۳۸۔

[2] فاطمہ بی بنام درس اما چابی سنہ ۱۹۰۲ء انڈین لاء رپورٹ مدراس جلد ۲۶ صفحہ ۲۳۴۔

[3] بیتھی پال سنگھ بنام حسینی جان سنہ ۱۸۹۲ء انڈین لاء رپورٹ الہ آباد جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۱۔

[4] ایکٹ نشان ۵ بابتہ سنہ ۱۸۸۱ء (دی پروبیٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن ایکٹ = قانون حصول نقل وصیت از عدالت واہتمام ترکہ)۔

ایک صداقت نامہ اہتمام ترکہ کے متعلق حاصل نہ کریں اس طرح کی کوئی ڈگری اُن کے حق میں صادر نہیں ہوسکتی۔[1]

---

[1] ایکٹ ۲۷ نشان بابتہ ۱۸۶۰ء کے ذریعہ سے یہ ایکٹ یعنے قانون محولہ منسوخ ہوگیا ہے۔ علاوہ بمبئی میں ریگیولیشن ۸ بابتہ ۱۸۲۷ء اب تک نافذ ہے اور اُس کا وہی اثر ہے جو اس ایکٹ ناسخ کا۔ اس ریگیولیشن کے زیر اثر عدالت نے طے کیا ہے کہ نابالغ کو عدالت سے "صداقت نامۂ وراثت" نہیں عطا کیا جاسکتا۔ بائی بے بہا بنام بائی داگیوبا ۱۸۸۲ء انڈین لا رپورٹ بمبئی جلد ۶ صفحہ ۷۲۸۔ ایکٹ ۷ نشان بابتہ ۱۸۸۹ء کی دفعہ ۴ کے مطلب اور مفہوم کے متعلق ملاحظہ ہو گنجن مودی بنام بیجناتھ سنگھ ۱۸۹۲ء انڈین لا رپورٹ کلکتہ جلد ۱۹ صفحہ ۲۳۶۔

باب دوم

حنفی قانون وراثت

پہلی فصل تقسیم ورثاء

اہل سنت والجماعت میں اگرچہ ورثا آٹھ قسم کے ہوتے ہیں مگر آج کل ہندوستان میں صرف تین قسم کے ورثا ہوتے ہیں (۱) ذوی الفروض (۲) عصبات، (۳) ذوی الارحام۔

(۱) ذوی الفروض وہ ورثا جن کے حصص کا اندازہ اور تعین قرآن مجید، حدیث شریف، یا اجماع صحابہؓ سے ہو چکا ہے۔

(۲)[1] عصبات، وہ ورثا جن کا حصہ معین نہیں بلکہ ذوی الفروض کے حصص دینے کے بعد جس قدر متروکہ بچتا ہے وہ سب اُن کو ملتا ہے، وہ خود بھی مرد ہوتے ہیں اور اُن کے اور میت کے درمیان جس قدر واسطے ہوتے ہیں وہ سب مردوں کے ہوتے ہیں۔

---

[1] جن انگریزوں نے فقہ اسلام کے متعلق کتابیں تالیف کی ہیں انہوں نے عصبات کو Residnaries (یعنی بچا کھچا پانے والے) لکھا ہے۔

[2] انگریز مولفین نے ان کو "قرابت بعیدہ" لکھا ہے۔ اصل میں اس لفظ کے معنی ذی رحم یعنے قرابت داران رحمی ہیں اور اس سے ایسے رشتہ دار مراد ہیں جن کی بواسطۂ اناثیت سے قرابت ہو۔ قانون ہنود میں اس کے ہم معنی لفظ بندھو ہے۔

(۳) ذوی الارحام[۱] - میت کے وہ قرابت دار جو ذوی الفروض یا عصبات نہوں۔ سب سے پہلے ذوی الفروض مستحق وراثت ہوتے ہیں اون سے جو متروکہ بچے وہ عصبات کو ملتا ہے اگر عصبات نہوں تو مابقی ترکہ پھر ذوی الفروض پر رد ہوتا ہے لیکن ذوی الفروض میں سے زوج اور زوجہ پر رد نہیں ہوتا۔ اگر ذوی الفروض اور عصبات دونوں نہوں تو پھر ترکہ کے مستحق ذوی الارحام ہوتے ہیں۔ اور اس طرح کے عصبات سے شوہر و زوجہ خارج ہیں[۲]۔ اگر ذوی الفروض اور عصبات موجود نہوں تو ترکہ ذوی الارحام میں تقسیم ہوتا ہے۔

ذوی الفروض حصہ یا بندگان یا ذوی الفروض تعدادیں بارہ ہیں جن میں کے چار ذکور اور آٹھ اناث ہیں۔ سہام (معینہ) ہیں بلحاظ حالات تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اور اُن دو اصولِ اخراج کی بنا پر جن کو خصوصیت سے پہلے باب کی دوسری فصل میں بصراحت بیان کیا گیا ہے ذوی الفروض میں سے بعض ورثار کبھی کبھی محروم الارث قرار پاتے ہیں[۳]۔

چار مرد جو ذوی الفروض ہیں حسب ذیل ہیں:-

میت کا (۱) باپ (۲) دادا یا سلسلۂ بالا کا ایسا دادا جو محروم نہوا ہو (۳) برادر اخیافی اور (۴) شوہر۔

انہیں کے آٹھ اناث کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے:-

میت کی (۱) زوجہ (۲) بیٹی (۳) پوتی (خواہ وہ درجہ میں کتنی ہی نیچی ہو) (۴) ماں (۵) (جدۂ صحیحہ) حقیقی دادی یا نانی خواہ درجہ میں کتنی ہی اونچی ہو (۶) سگی بہن (۷) علاتی بہن اور (۸) اخیافی بہنیں (یعنے میت کی ماں کے میت کے باپ سے نہیں بلکہ دوسرے شوہر سے جو

---

[۱] دیکھو عبدالسیر نگ بنام بیتلی بی بی ۱۹۰۲ء کلکتہ جلد ۲۹ صفحہ ۷۳۸۔

[۲] مسئلۂ رد کے متعلق دیکھو آیندہ صفحہ ۳۵۔

[۳] دیکھو سابق کا حصۂ کتاب صفحہ ۱۰۔

لڑکیاں پیدا ہوئی ہوں)

اولاً باپ۔ سنی فقہا نے میت کے باپ کی تین حیثیتیں قرار دی ہیں۔ (الف) اگر متوفی کا صلبی لڑکا یا اُس کے سلسلہ سے کوئی فرزند نرینہ باقی رہے تو ایسی صورت میں اُس کی ایک معمولی ذی فرض کی سی حیثیت ہوتی ہے (ب) اگر باپ کے سوائے ایک دوسرا ذی فرض بھی موجود ہو تو باپ کی عُصبہ کی حیثیت ہوتی ہے مثلاً جبکہ متوفی کی زوجہ یا متوفیہ کا شوہر موجود ہو یا ماں یا دادی کے ساتھ باپ باقی رہے۔ ایسی شکل میں ذوی الفروض کے سہام کے بعد میراث سے جو بچ رہتا ہے وہ باپ کو ملتا ہے۔

(ج) بعض صورتوں میں باپ کی حیثیت ذی فرض اور عُصبہ دونوں ہو جاتی ہے مثلاً باپ کے سوائے میت کی ایک لڑکی یا پوتی موجود ہو۔ اس شکل میں پہلے باپ کو اُس کا سہام معینہ دیا جاتا ہے اور اس کے بعد بیٹی یا پوتی کا حصہ نکالا جاتا ہے اور جو باقی رہے اس کے پانے کا بھی باپ مستحق ہے۔

اگر میت کے ایک بیٹا یا پوتا یا سلسلۂ ذکور سے کوئی

باپ کا حصہ | بیٹا باقی رہے تو باپ کا حصہ $\frac{1}{6}$ ہوتا ہے۔

ثانیاً۔ دادا یا سلسلۂ صعودی کے کسی دادا کا

دادا کا حصہ | حصہ (جبکہ وہ باپ یا کسی اور قریب کے دادا سے محروم نہ ہو تو ہشں باپ کے حصہ کے ہے یعنی $\frac{1}{6}$

(اہل سنت والجماعت بلکہ حنفیہ نے توریث کی غرض سے اجداد کی دو قسمیں قرار دی ہیں یعنے جد صحیح وفاسد جد صحیح وہ دادا ہے جس کی

حقیقی | اولاد میں عورت کے توسط کے بغیر متوفی کا شمار ہو اور اُسی بنا پر متوفی سے دادا کی قرابت سمجھی جائے مثلاً باپ کا باپ جد صحیح

اور ماں کا باپ یعنے نانا جد فاسد ہے۔

جدۂ صحیحہ وہ دادی ہے جس کے سلسلۂ قرابت میں متوفی اور اس کے درمیان کوئی جد فاسد حائل نہو مثلاً نانی و دادی یا دادا کی ماں جدات صحیحہ ہیں اس کے برعکس نانا کی ماں جدۂ فاسدہ ہے۔ شیعوں کے ہاں اس قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ثالثاً اخیافی بھائی جبکہ میت کے بیٹا بیٹی یا کسی درجہ کا پوتا۔

اخیافی بھائی | پوتی۔ یا باپ یا کسی درجہ کا دادا نہو تو اگر اخیافی بھائی ایک ہو تو $\frac{1}{6}$ پاتا ہے اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب مل کر $\frac{1}{3}$ پاتے ہیں۔

جب دو یا دو سے زیادہ اخیافی بھائی ہوں اور میت کی کوئی اولاد یا اولاد کا کوئی لڑکا خواہ درجہ میں کتنا ہی نیچے ہو باقی نہ رہے اور باپ اور جد صحیح موجود نہ ہوں $\frac{1}{3}$۔

شوہر۔ | رابعاً۔ شوہر (جب میت کا بیٹا بیٹی یا کسی درجہ کا پوتا موجود ہو) $\frac{1}{4}$
لیکن ان لوگوں کی عدم موجودگی ہیں، $\frac{1}{2}$

بیوہ | خامساً بیوہ (جب میت کا بیٹا بیٹی یا کسی درجہ کا پوتا موجود ہو) $\frac{1}{8}$

(جب شوہر یا بیوہ کے ساتھ کسی لڑکی کی اولاد ذی رحم ہونے کی وجہ سے حصہ دار ہو تو شوہر یا زوجہ کو جیسی کہ صورت ہو پورا حصہ ملتا ہے۔

اور جب بیوہ کے ساتھ میت کا بیٹا بیٹی یا کسی درجہ کا پوتا موجود ہو بیوہ کو $\frac{1}{8}$ ملتا ہے۔

چونکہ اسلام کے مختلف فرقوں میں محدود یا غیر محدود طور پر کثرت ازدواج جائز ہے اس لئے مسلم متوفی کے بعد اکثر صورتوں میں ایک سے زیادہ زوجائیں قابل توریث باقی رہتی ہیں لہذا جب ایک سے زیادہ بیوائیں موجود ہوں تو ان سب میں متروکہ کا $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{8}$ حصہ اولاد کی موجودگی اور عدم موجودگی کے لحاظ سے تقسیم ہوگا۔

دختر۔ | سادساً۔ دختر (صرف ایک لڑکی باقی رہے اور کوئی لڑکا

موجود نہ ہو جس کے سبب سے لڑکی عُصبہ بالغیر نہ بننے پائے) کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہے۔
اور جب دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں (اور کوئی لڑکا نہ ہو) $\frac{2}{3}$

پوتی سابعًا۔ پوتی (خواہ درجہ میں وہ کتنی ہی نیچی ہو) صرف ایک پوتی اور دوسری کوئی اولاد یا پوتا یا میت کے سلسلۂ اولاد ذکور میں کوئی لڑکا باقی نہ رہے تو، $\frac{1}{2}$

جب دو یا دو سے زیادہ پوتیاں موجود ہوں لیکن میت کی کوئی اور اولاد یا پوتا یا میت کے فرزندوں کی اولاد میں کوئی لڑکا باقی نہ رہے تو، $\frac{2}{3}$

جب میت کے بعد اُس کی ایک پوتی اور ایک لڑکی باقی رہیں اور کوئی لڑکا یا پوتا یا اولاد ذکور کا کوئی لڑکا موجود نہ ہو تو $(\frac{2}{3}-\frac{1}{2})=\frac{1}{6}$

جب میت کے دو لڑکیاں موجود ہوں تو پوتیاں محروم ہو جاتی ہیں بشرطیکہ اُن کے ساتھ اولاد ذکور کے سلسلہ کا کوئی لڑکا (خواہ درجہ میں کتنا ہی نیچے ہو) باقی نہ رہے۔ پوتیاں یا سلسلۂ اولاد ذکور کی لڑکیاں میت کے لڑکے یا سلسلۂ اولاد ذکور کے کسی ایسے لڑکے کے سبب سے محروم ہوتی ہیں جو اُن سے زیادہ میت کا قریب ہو۔ جب پوتی کے ساتھ اُس کا ہم درجہ یا اُس سے نیچے درجہ کا پوتا ہوتا ہے تو پوتی عُصبہ بالغیر ہو جاتی ہے۔

ماں ثامنًا۔ ماں۔ جب کہ میت کا بیٹا بیٹی یا کسی درجہ کا پوتا پوتی یا کسی قسم کے دو یا زیادہ بھائی بہن موجود ہوں تو $\frac{1}{6}$ اور جب ان میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو $\frac{1}{3}$ اور جب میت کا باپ اور احد الزوجین موجود ہوں تو احد الزوجین کا حصہ دینے کے بعد مابقی متروکہ سے $\frac{1}{3}$ لیکن اگر میت کا دادا اور احد الزوجین موجود ہوں تو سالم متروکہ سے $\frac{1}{3}$ حصہ پاتی ہے۔

جدۂ صحیحہ - تاسعًا۔ جدۂ صحیحہ خواہ درجہ میں کتنی ہی اونچی ہو (بشرطیکہ میت کے قریب کی کسی جدۂ صحیحہ کے سبب سے محروم نہ ہوی ہو) $\frac{1}{6}$ اور میت کے باپ کی موجودگی میں باپ کی جانب کی

کل جدّات محروم ہوتی ہیں نیز میت کے دادا کی موجودگی میں بجز باپ کی ماں کے باپ کی جانب کی کل جدّات محروم ہوتی ہیں۔

سگی بہن۔ عاشراً۔ سگی بہن اگر ایک ہو تو ½ ایک سے زیادہ ہوں تو سب مل کر ⅔ پاتی ہیں اور اگر سگا بھائی موجود ہو تو عُصبہ بالغیر ہو جاتی ہے اور اگر میت کی ایک بیٹی موجود ہو تو ½ پاتی ہے اور اگر میت کی ایک سے زیادہ بیٹیاں یا بیٹا یا کسی درجہ کا پوتا یا باپ یا کسی درجہ کا دادا موجود ہو تو محروم ہو جاتی ہے۔

علاتی بہن۔ حادیٔ عشر۔ علاتی بہن اگر ایک ہو تو ½ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب مل کر ⅔ پاتی ہیں اور اگر علاتی بھائی موجود ہو تو عُصبہ بالغیر ہو جاتی ہے اور اگر میت کی ایک بیٹی موجود ہو تو علاتی بہن عُصبہ مع الغیر ہو جاتی ہے اور اگر میت کی ایک ایسی سگی بہن موجود ہو جو عصبہ نہ ہو گی تو ⅙ پاتی ہے اور اگر میت کی دو یا زیادہ بیٹیاں یا ایسی سگی بہنیں موجود ہوں جو عُصبہ نہ ہونگی یا بیٹا[1] یا کسی درجہ کا پوتا یا باپ یا کسی درجہ کا دادا یا سگا بھائی یا ایسی سگی بہن جو عُصبہ ہو گئی ہو موجود ہو تو علاتی بہن محروم ہو جاتی ہے۔

اخیافی بہن ثانیٔ عشر۔ اخیافی بہن مثل اخیافی بھائی کے حصہ پاتی ہے[1]۔

یہ بارہ ایسے حصہ دار ہیں جن کے مخصوص حصص کا قرآن مجید میں تعین ہوا ہے اور اسی بنا پر سنی اور شیعہ میں ذوی الفروض اور اُن کے فرائض کے متعلق بالکل اختلاف نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو نہایت خفیف جس کو اختلاف نہ سمجھنا چاہئے۔

---

[1] اس طرح کی تمثیلات کے لئے ضمیمہ اول دیکھنا چاہئیے ۱۲

فصل دوسری

عصبات

عصبہ کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) عصبہ بنفسہ یعنے جو اپنے حق کی بنا پر عصبہ ہے ۔

(۲) عصبہ بغیرہ یعنے جو غیر کے سبب سے عصبہ ہو جائے ۔

(۳) عصبہ مع غیرہ یعنے جو غیر کے ساتھ عصبہ ہو جائے ۔

پہلی صنف میں میت کے ایسے قرابتداران ذکور شامل ہیں جن کا نسب میت کی جانب بیان کرنے میں کوئی عورت بیچ میں نہ آئے یعنے وہ بلا واسطۂ اناث میت کا رشتہ دار ہو کیونکہ اُس کے اور میت کے درمیان اگر کوئی عورت نسباً حائل ہو تو وہ عُصبہ نہو گا بلکہ ذی فرض یا ذی رحم ہو گا اسی قسم کے ورثا عصبات[۱] نبفسہ کہلاتے ہیں۔

عصبہ نبفسہ کی چار قسمیں ہیں :۔

(الف) جزء میت یعنے وہ لوگ جو میت کی اولاد ذکور میں ہیں مثلاً بیٹا پوتا پروتا وغیرہ

(ب) اصل میت یعنے وہ لوگ جن کی اولاد میں میت ہے بالفاظ دیگر میت کے آباواجداد مثلاً اس کا باپ اور جد صحیح خواہ درجہ میں کتنا ہی اونچا ہو۔

(ج) میت کے باپ کا جزء یعنے وہ لوگ جو اس کے باپ کی

---

[۱] اس کے متعلق ضمیمہ دیکھا جائے ۱۲

اولاد میں ہیں مثلاً سگے بھائی اور علاتی بھائی اور اُن کا سلسلۂ اولاد ذکور۔

(د) میت کے دادا کا جزیعنے وہ لوگ جو میت کے دادا کی خواہ وہ درجہ میں کتنا ہی اونچا ہو اولاد ہوں جیسے چچا وغیرہ۔ بالفاظ دیگر اصل میت کا سلسلۂ اولاد ذکور خواہ میت سے وہ کتنا ہی بعید ہو۔

عصبہ بنفسہ کی توریث کا قاعدہ یہ بات سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عصبہ بنفسہ کی توریث میں جب ایک ہی درجہ کے قرابت دار ہوں تو قوت قرابت اور قرب قرابت کو ترجیح دیجاتی ہے۔ مثلاً میت کے ایک سگے اور ایک علاتی بھائیوں میں باوجود دونوں ایک درجہ کی میت سے قرابت رکھتے ہیں میراث پانے میں سگے بھائی کو بسبب اتصالِ خون و قوت قرابت سوتیلے بھائی پر ترجیح ہے۔ اسی طرح سگا بھتیجا سوتیلے بھتیجے سے مرجح سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی جب بھتیجے کے ساتھ میت کا چچا بھی موجود ہو تو چچا کا میراث میں کوئی حق نہیں ہے میت کی اولاد ذکور (خواہ وہ درجہ میں کتنی ہی پست ہو) کے سبب سے وہ کل عصبات جو میت کے اوپر کے اور بازو کے سلسلوں میں واقع ہیں محروم ہوتے ہیں۔

عصبہ بغیرہ۔ عُصبہ بالغیر ایسی ذی فرض عورت ہوتی ہے جو اپنے ہم درجہ یا اپنے سے ادنیٰ درجہ کے عُصبہ بنفسہٖ کی موجودگی کی وجہ سے عُصبہ ہو جاتی ہے اور وہ چار ذوی الفروض عورتیں ہیں:۔

(الف) بیٹیاں (بیٹوں کے ساتھ)

(ب) پوتیاں (پوتوں یا پردتوں یا ایسی اولاد ذکور جو سلسلہ میں اور بھی نیچے آئے)۔

اسی کا اطلاق ان سب بیٹوں پر ہوتا ہے جو متوفی کے فرزندوں کے راست سلسلہ میں آتی ہیں خواہ سلسلہ کتنا ہی پست کیوں نہو مثلاً جب پروتی کے ساتھ پوتی موجود ہو تو اس دوسری عورت کو (مثل متوفی کی لڑکی کے) نصف متروکہ ملتا ہے اور اس پروتی یا اس سے بھی جو پست درجہ کی پروتی ہو ملے گا۔ اگر دو پوتیاں ہوں تو پروتی کو کچھ نہ ملے گا۔ بشرطیکہ

اس کے ساتھ ایک ہی درجہ کا یا اس کے نیچے کے درجہ کا جیسا بھائی یا بھتیجا ہے کوئی فرزند نرینہ موجود ہو۔

(ج) سگی بہن (اپنے سگے بھائی کے ساتھ)

(د) علاتی بہن جو ایک باپ سے ہو (اپنے بھائی کے ساتھ)

لیکن جب ایک درجہ کے چند اناث و ذکور ہوں (جیساکہ پوتوں اور پروتیوں کی وراثت کے متعلق طریقہ ہے خواہ وہ درجہ میں کتنی ہی پست ہوں جب متوفی کی اولاد ذکور کے ساتھ باقی رہیں اور یہ اولاد درجہ میں کتنی ہی نیچے ہو) تو ہر ایک عورت کو مرد کا نصف حصہ ملتا ہے۔ مثلاً اگر دو بیٹے اور تین بیٹیاں یا دو بھائی اور تین بہنیں میت کے وارث ہوں تو ہر ایک لڑکی یا بہن $\frac{1}{7}$ اور ہر ایک لڑکا اور بھائی $\frac{2}{7}$ پاتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بعض صورتوں میں اکثر اقربائے ذکور عصبات ہوتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سب شکلوں میں ان کی بہنیں بھی ان کے ساتھ عصبات بن جاتی ہیں۔ عورت صرف اس وقت عصبہ ہوتی ہے کہ جب وہ ذوی الفروض میں سے ہو اور اس کے ساتھ کوئی عصبہ ذکور میں سے بھی موجود رہے مثلاً اگر کوئی مسلمان مرنے کے بعد ایک زوجہ اور ایک چچا اور ایک پھپی چھوڑ جائے خواہ وہ پھپی اس کے باپ کی سگی بہن ہو خواہ علاتی چونکہ وہ ذوی الفروض میں سے نہیں ہے لہٰذا وہ اپنے بھتیجے کے ترکہ میں شرعاً حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے اور زوجہ کو حصہ ملنے کے بعد متوفی کی کل جائداد اس کے چچا یعنے پھپی کے بھائی کو ملے گی۔

جب ایک سگی بہن اور چند علاتی بھائی اور بہنیں موجود ہوں تو سگی بہن کو اس کا نصف حصہ ملے گا اور باقی جائداد علاتی بھائیوں اور بہنوں میں دو اور ایک کی نسبت سے تقسیم ہوگی۔

جب میت کی چند سگی بہنیں موجود ہوں تو وہ سب مل کر دو ثلث حصہ پاتی ہیں اور باقی اس طرح جیساکہ سابق میں بیان کیا گیا تقسیم کر دیا جائے گا۔

جب میت کی صرف ایک سگی بہن اور علاتی بہن باقی رہ جائیں تو پہلی کو نصف اور دوسری کو سدس میراث ملے گی اور باقی متروکہ ان میں اسی مناسبت سے تقسیم ہوگا۔

اگر دو یا دو سے زیادہ سگی بہنیں اور چند علاتی بہنیں باقی رہیں اور کوئی علاتی بھائی موجود نہو تو سگی بہنوں کو پورا متروکہ ملے گا اور سوتیلی بہنیں کچھ نہیں پائیں گی۔

عُصبہ مع الغیر وہ ذی فرض عورت ہوتی ہے جو دوسری ذی فرض عورت کی موجودگی کی وجہ سے خود تو عُصبہ ہو جاتی ہے اور وہ دوسری ذی فرض عورت علیٰ حالہا ذی فرض رہتی ہے اور وہ حسب تفصیل ذیل ہیں:۔

(۱) سگی بہنیں بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ۔
(۲) علاتی بہنیں بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ۔

عصبات بغیرہ۔

جب ایک بیٹی یا پوتی ایک سگی بہن یا علاتی بہن کے ساتھ ہو تو بیٹی یا پوتی کو اپنا پورا نصف حصہ اور باقی بہن کو ملے گا:۔

تمثیلات۔

جب چند لڑکیاں یا پوتیاں موجود ہوں تو ان کو دو ثلث اور باقی بہن کو ملتا ہے۔

جب چند لڑکیاں اور سگی بہنیں پوتیوں کے ساتھ موجود ہوں تو بیٹیوں اور حقیقی بہنوں میں پوری جائداد تقسیم کردی جاتی ہے۔

اگر دو بیٹیاں ایک پوتی اور ایسی اولاد جو متوفی کا پوتا یا پروتا ہوتا ہو باقی رہیں تو دو ثلث متروکہ بیٹیوں کو ملے گا باقی متروکہ سے پوتے کو $\frac{2}{9}$ جو میراث کا $\frac{2}{3}$ حصہ ہے ملتا ہے اور باقی $\frac{1}{9}$ حصہ پوتی کو دیا جائے گا۔

جب کوئی مسلمان اپنے مرنے کے بعد ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی جو اس کے سامنے مرا ہو چند بیٹیاں چھوڑ جائے تو اس کی بیٹی میراث سے اپنا نصف حصہ پاتی ہے اور پوتیوں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اس کے بعد

جو باقی رہے وہ بیٹی اور پوتیوں میں ان کے حصوں کی مناسبت سے تقسیم ہوگا لیکن اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو اُن کو دو ثلث میراث بطور اُن کے حصہ کے ملتی ہے اور بقیہ متروکہ اصول رد کے مطابق انھی کو ملتا ہے اور اس کے بعد دو پوتیوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن جس صورت میں کوئی مرد وارث ان کے ساتھ موجود ہو تو یہ اناث خواہ اس مرد کی بہنیں ہوں خواہ اس کی پھپیاں اس کے ساتھ عصبات ہو جاتی ہیں لہٰذا ایسی صورت میں اگر متوفی کی دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو دو ثلث میراث ملے گی اور باقی لڑکے کی اولاد کو مرد کے دو حصے اور عورت کا ایک حصہ کی مناسبت سے دی جائے گی۔ گو اس طرح کا مرد عورتوں سے درجہ میں کتنا ہی نیچے ہو لیکن وہ ان کو اپنے ساتھ عصبات بنا دیتا ہے اس لئے اس تقسیم کے بعد جو بچ رہتا ہے اُسی نسبت سے یعنے بحساب فی مرد دو حصے اور فی عورت ایک حصہ ان میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

ترجیح قرابت قریبہ جب متوفی اپنے بعد ایسے چند قرابتداروں کو چھوڑ جائے جن کا ان مختلف قسم کے عصبات میں شمار ہو سکتا ہو جن کا ذکر تفصیل سے فقرات بالا میں کیا گیا ہے تو اُس رشتہ دار کو ترجیح دی جائے گی جو متوفی سے سب سے زیادہ قرابت رکھتا ہے اس لئے اگر عصبہ مع غیرہ کی دوسرے عصبات سے زیادہ متوفی سے نزدیک کی قرابت پائی جائے تو اُس کو ترجیح حاصل ہوگی۔

تمثیل مثلاً ایک مسلم مرنے کے بعد ایک بیٹی ایک سگی بہن اور ایک علاتی بھائی کا لڑکا (یعنے سوتیلا بھتیجا) چھوڑتا ہے۔ میراث سے ایک نصف بیٹی کو اور دوسرا نصف بہن کو ملتا ہے چونکہ بہن بیٹی کے ساتھ عصبہ ہے اور بھتیجے سے زیادہ متوفی کی قریب کی رشتہ دار ہے اس لئے ان دونوں میں پوری میراث تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر متوفی کی سگی بہن باقی رہے تو اس کو علاتی بھائی پر ترجیح دی جاتی ہے یعنے متوفی کی بیٹی اپنے حصہ میں نصف میراث لیتی ہے اور باقی

سگی بہن کو ملتا ہے[1]۔

فصل تیسری

ذوی الارحام۔ جب ذوی الفروض اور عصبات نہ ہوں تو ذوی الارحام اپنی اپنی قرابت اور اپنے حقوق کے لحاظ سے متوفی کا ترکہ پاتے ہیں۔

اگرچہ زوج وزوجہ عصبات ہیں لیکن جب ذوی الارحام شوہر یا زوجہ کے ساتھ جمع ہوں تو ہمیشہ مورث کی جائداد میں حصہ پائیں گے یعنے شوہر یا زوجہ ذوی الارحام کو محروم الارث نہیں کر سکتے۔

عصبہ بنفسہ کے مانند ذوی الارحام کی بھی چار قسمیں ہیں:۔

قسم اوّل۔ (۱) متوفی کی اولاد یعنے:۔

(الف) بیٹیوں کی اولاد اور اُن کی اولاد کی اولاد خواہ درجہ میں وہ کتنی ہی پست ہو۔

(ب) پوتیوں کی اولاد اور اُن کی اولاد خواہ درجہ میں کتنی ہی پست ہو۔

قسم دوم۔ (۲) اصل میت یا اجداد یعنے:۔

(الف) میت کے اجداد خواہ وہ میت سے کتنا ہی اوپر کی پشت میں واقع ہوں اور میت سے اُن کی قرابت بیان کرنے میں اُن کے اور میت کے درمیان ایک عورت واسطہ ہو اور اس لئے جن کو "اجداد فاسدین" کہتے ہیں[2]۔ مثلاً مورث کا نانا اور دادی کا باپ یا نانی کا باپ وغیرہ۔

---

[1] مزید تمثیلات کے لئے ضمیمہ اول دیکھنا چاہیئے ۱۲

[2] دیکھو سابق کا حصہ صفحہ ۲۲

(ب) جدات فاسدہ ۔ مثلاً نانا کی ماں ۔

قسم سوم (۳) مورث کے والدین کی اولاد یعنے :۔

(الف) سگی بھتیجیاں اور اُن کی اولاد ۔
(ب) سوتیلی بھتیجیاں اور ان کی اولاد ۔
(ج) اخیافی بھائیوں کی اولاد اور اُن کی اولاد ۔
(د) کل بہنوں کی اولاد اور اُن کی اولاد ۔

قسم چہارم ۔ (۴) دادا دادی کی اولاد اور دوسرے اجداد خواہ درجہ میں وہ کتنے ہی بلند ہوں :۔

(الف) سگی چچازاد بہنیں اور اُن کے بیٹے ۔
(ب) سوتیلی چچازاد بہنیں (یعنے باپ کے سوتیلے بھائیوں کی بیٹیاں) اور اُن کے بیٹے ۔
(ج) سگی علاتی اور اخیافی پھپیاں اور اُن کی اولاد ۔
(د) ماموں خالائیں اور اُن کی اولاد ۔
(ھ) اخیافی چچا (یعنے متوفی کے باپ کے برادران اخیافی) اور اُن کی اولاد اور ان میں کی ہر ایک اولاد کی اولاد خواہ درجہ میں کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو ۔

تعداد معینہ مکتفی نہیں ہے ۔ ذوی الارحام کی یہ جو چار قسمیں بتلائی گئی ہیں ان میں میت کے جس قدر ذوی الفروض ہوسکتے ہیں وہ سب کے سب شامل نہیں ہیں ۔ اگرچہ فقہا نے ذوی الفروض کی مختلف طور پر تعریف کی ہے لیکن جو تعریف کہ اکثروں کی مسلمہ و مقبولہ ہے اُس کے مطابق میت کے کل قرابت دار جو ذوی الفروض اور عصبہ نہوں ذوی الارحام ہوتے ہیں ۔

ترکہ پانے میں ذوی الارحام کی نوع کا خیال کیا جاتا ہے یعنے پہلی قسم کے ایسے ذوی الارحام دوسری قسم کے ایسے ذوی الفروض سے مقدم

سمجھے جاتے ہیں۔ جب ایک ایک نوع میں متوفی کے متعدد قرابت دار ہوں تو جو شخص میت کا قرابت دار بعید ہے وہ عزیز قریب سے محجوب ہو جاتا ہے۔

نوع اوّل کے ذوی الفروض اور ان کی وراثت کے قواعد۔

اسی بنا پر پہلی نوع کے ذوی الارحام میں جو میت کے نواسے نواسیاں اور پوتیوں کی اولاد پر مشتمل ہے۔

(الف) جو شخص قرابت میں سب سے زیادہ متوفی سے قریب ہے وہ دوسروں پر ترجیح پاتا ہے۔

اس طرح نواسی بترجیح پروتی متروکہ پاتی ہے۔

(ب) اگر مستحقین درجۂ قرابت میں برابر ہوں یعنے متوفی سے دوسرے تیسرے یا چوتھے درجہ کی قرابت رکھتے ہوں تو (یعنے کسی ذی فرض یا عصبہ) کی اولاد قرابت دار بعید (ذی رحم) کی اولاد پر ترجیح رکھے گی مثلاً بیٹے کی نواسی بیٹی کے نواسے پر ترجیح رکھتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ پوتی ذی فرض ہے اور نواسی ذی رحم۔

امام محمدؒ کا قاعدہ جس پر ہند کے حنفیہ عمل کرتے ہیں

(ج) اگر دعوے داران وراثت (ذوی الارحام) درجہ اور سمت قرابت میں برابر ہوں اور ان میں کسی (ذی فرض وعصبہ) کی اولاد نہ ہو یا وہ سب بواسطہ کسی ذی فرض یا عُصبہ کے میت سے قرابت رکھتے ہوں تو سہام شرعیہ موافق اُن اشخاص کی تعداد اور جنس (تذکیر و تانیث) کے مقرر کئے جائیں گے جو متروکہ کی تقسیم ہونے کے وقت موجود ہوں بشرطیکہ وہ اشخاص جن کے واسطہ سے مستحقین متوفی سے قرابت رکھتے ہیں ایک ہی جنس سے ہوں یا جیسا کہ اصطلاح فقہ میں کہا جاتا ہے کہ "بشرطیکہ اصول متحد الجنس ہوں"

مثلاً اگر کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اُس کے قرابتداروں میں ایک نواسا اور ایک نواسی باقی رہیں تو ظاہر ہے کہ دونوں مستحقین میراث برابر درجہ کی مورث سے قرابت رکھتے ہیں اور اُن اشخاص کی جنس میں جن کے واسطہ سے وہ متوفی کے قرابت دار ٹھیرتے ہیں کوئی فرق نہیں ہے لہذا نواسا $\frac{2}{3}$ (دو ثلث) اور نواسی $\frac{1}{3}$ (ایک ثلث) متروکہ پائیں گے۔ اسی طرح ایک

بیٹی کے واسطہ سے دو نواسے اور دوسری بیٹی کے ذریعہ سے دو نواسیاں متوفی کی ہوں تو دو ثلث متروکہ نواسوں کو اور ایک ثلث نواسیوں کو ملے گا۔

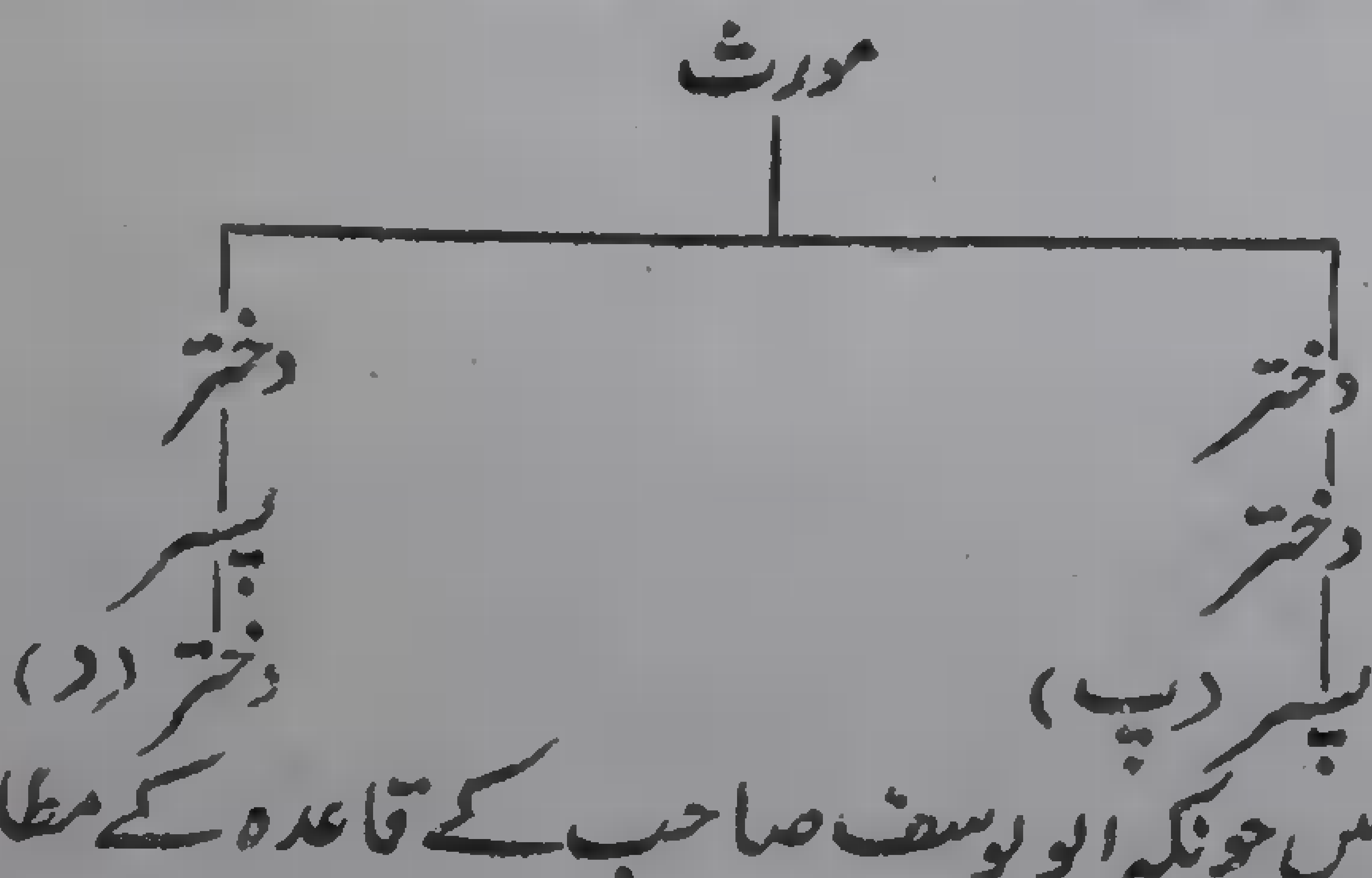
(د) لیکن اگر "اصول مختلف الجنس ہوں" یعنے وہ اشخاص جن کے ذریعہ سے مستحقین میراث متوفی سے قرابت رکھتے ہیں مختلف جنس یعنے ذکور اور اناث دونوں ہوں تو امام محمدؒ کے قول کے موافق جن کی تقلید ہندوستان کے حنفیہ اس مسئلہ میں کرتے ہیں سہام شرعیہ مستحقین کی تعداد اور جنس کے مطابق نہیں مقرر ہوتی بلکہ "اصول" کی تعداد اور جنس کے موافق مقرر ہوتی ہیں۔

قول امام ابو یوسف

امام ابو یوسف کے قاعدہ کے موافق جو زیادہ آسان اور معقول ہے اور جس کی پابندی تمام ایشیا میں کی جاتی ہے اگر مستحقین ترکہ درجۂ قرابت میں برابر ہوں اور اُن میں کسی ذی فرض یا عصبہ کی اولاد نہ ہو تو جائداد کی تقسیم بلحاظ تعداد اور جنس مدعیان کی جاتی ہے۔

ان دو مختلف رایوں کو طلبا کے ذہن نشین کرنے کی غرض سے ذیل میں چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

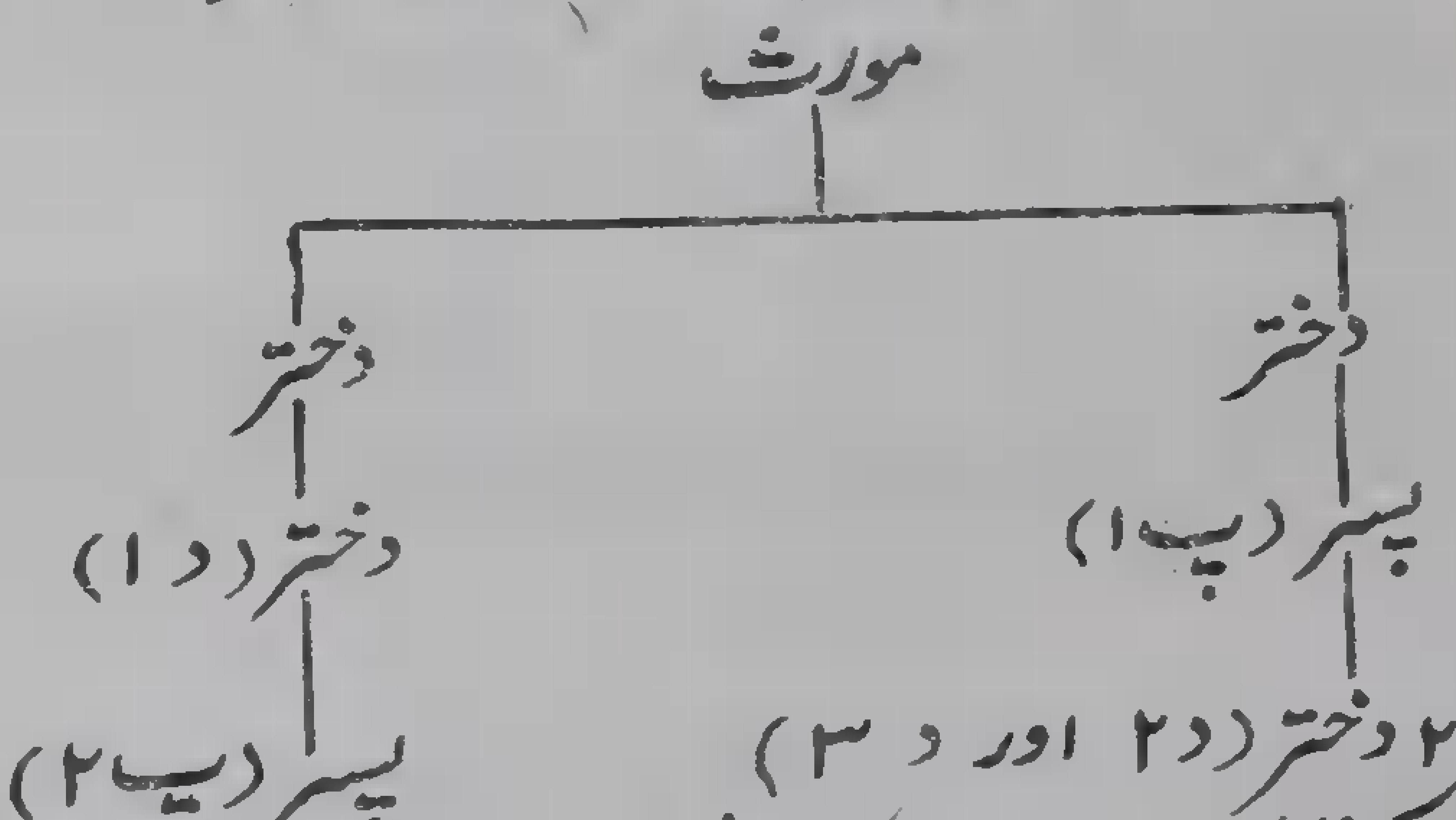
فرض کرو کہ ایک مسلم کے مرنے کے بعد اُس کے ایک نواسہ کی بیٹی اور ایک نواسی کا بیٹا پسماندوں میں باقی رہ جاتے ہیں اس طرح۔



اس شکل میں چونکہ ابو یوسف صاحب کے قاعدہ کے مطابق مستحقین میراث میں بلحاظ تعداد و جنس متروکہ تقسیم ہونا چاہئے لہذا پسر (ب) اُس کا $\frac{2}{3}$ (دو ثلث) اور دختر (د) $\frac{1}{3}$ (ایک ثلث) پائے گی۔ اور امام محمدؒ کے قول کے موافق سہام شرعیہ "اصول" یعنے اجدادِ درمیانی کی تعداد و نوع

کے مطابق مقرر ہوتی ہیں اور چونکہ نواسہ نواسی کے حصہ سے دوچند پانے کا مستحق ہے اس لئے اس کا دو ثلث سہام اُس کی دختر (د) کو اور نواسی کا ایک ثلث سہام اس کے پسر (پ) کو ملے گا۔

ایک دوسری مثال لیجئے ایک مسلم متوفی اپنے بعد ایک نواسی کا بیٹا اور ایک نواسہ کی دو بیٹیاں چھوڑ جاتا ہے اس طرح۔

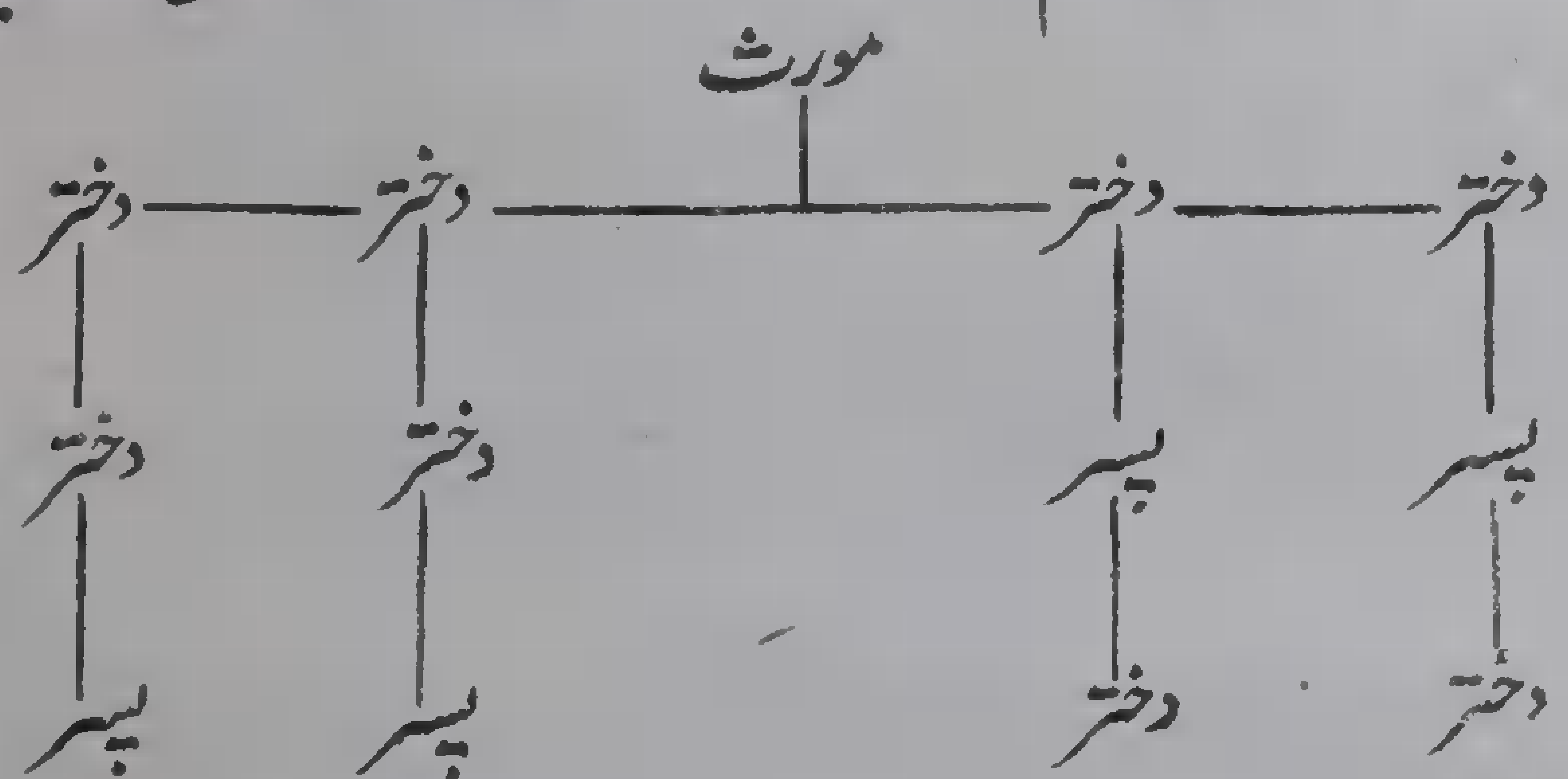


امام محمدؒ کے قول سے (پ ۱) کا دو ثلث حصہ اُس کی دو بیٹیوں (د ۲ اور د ۳) کو پہنچتا ہے اور د ۱ کا ایک ثلث اُس کے پسر (پ ۲) کو ملتا ہے۔

لیکن امام ابو یوسف کے حکم کے مطابق متروکہ چار حصوں میں تقسیم ہو کر پ ۲ کو دو حصے یا کل میراث کا نصف ملے گا اور د ۲ و د ۳ کے درمیان باقی نصف میراث تقسیم ہوگی۔ (ھ) جب میراث کے دعویداروں کی دو سے زیادہ تعداد ہو اور اگرچہ درجۂ قرابت میں تو وہ برابر ہوں لیکن مختلف اجداد کے سلسلہ سے ہوں جن کی جنس جدا ہو تو محمدؒ صاحب کے قول کے مطابق ان اجداد کی جنس کے لحاظ سے جو متوفی کی پہلی پشت میں واقع ہوں متروکہ تقسیم ہوگا بشرطیکہ متوفی کی اس پشت کی اولاد میں اختلاف جنس ہو۔ اس کے بعد جملہ ورثائے ذکور کا ایک گروہ اور کل ورثائے اناث کا دوسرا گروہ قرار دیا جاکر ذکور کے جس قدر سہام ہوں گے وہ کل اُن کی اولاد کو ملیں گے جہاں معمولی قاعدہ کی رو سے یعنی بلحاظ تذکیر و تانیث اُس مجموعہ سہام کی ان میں تقسیم ہوگی

اور اسی طرح اناث کا مجموعۂ حصص اُن کی اولاد کو منتقل اور ان میں تقسیم ہوگا۔
جب درمیانی اجداد کی اس طرح دو جماعتیں قرار پا لیں تو ایک ایک جماعت کا مجموعۂ حصص اُس کے کل سلسلۂ اولاد کے لئے مخصوص ہوگا۔ اگر متوفی کی نسل میں جس پشت میں سب سے پہلے اختلاف جنس واقع ہو اور اس میں ایک شخص ایک جنس کا اور دوسرے چند اشخاص دوسری جنس کے ہوں تو پہلے شخص کا حصہ خواہ وہ مرد ہو کہ عورت جیسی کہ شکل پیش آئے اُس کی اولاد کے لئے مختص کیا جانا چاہئے اور اس قاعدۂ تفریق پر متوفی کی اولاد کے کل سلسلوں میں عمل کیا جائے گا۔

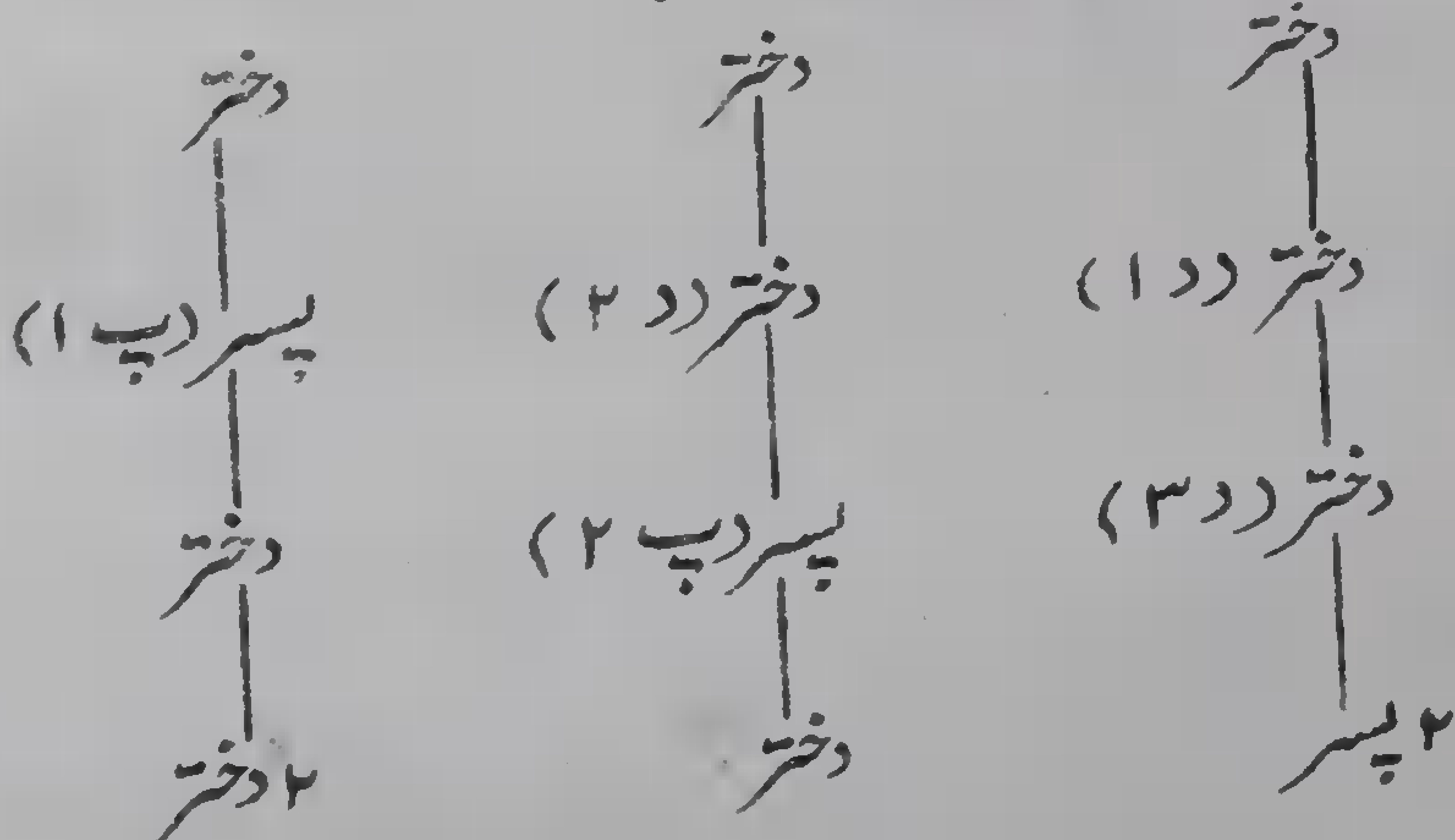
مثلاً اگر کسی مسلم کی وفات کے بعد قرابتداران ذیل باقی رہیں:۔



چونکہ امام محمدؒ کے قاعدہ کے مطابق متروکہ تقسیم ہوگا لہذا سب سے پہلے دوسری پشت میں اختلاف جنس واقع ہوتا ہے اور اس لئے متروکہ اولاً اُس پشت کے ورثا میں تقسیم ہوگا یعنے دو بیٹوں کو $\frac{۴}{۶}$ (چار سدس) اور دو بیٹیوں کو $\frac{۲}{۶}$ (دو سدس) ملے گا۔ لڑکوں کا چار سدس متروکہ اُن کی دو بیٹیوں پر منتقل ہو کر بحصۂ رسدی اُن میں تقسیم ہوگا اور بیٹیوں کا دو سدس اُن کے بیٹوں میں مساوی منقسم ہوگا۔ اگر مثال بالا میں دو بیٹے دو بیٹیوں کو چھوڑنے کے بجائے پہلا شخص ایک بیٹا اور دوسرا شخص ایک بیٹی چھوڑ جاتا تو بیٹے کو چار سدس کا دو ثلث ($\frac{۲}{۳} \times \frac{۴}{۶}$) = $\frac{۸}{۱۸}$ متروکہ ملتا اور بیٹی چار سدس کا ایک ثلث = $\frac{۱}{۳} \times \frac{۴}{۶} = \frac{۴}{۱۸}$ باقی۔

لیکن امام ابو یوسف کے قول کے مطابق دونوں مستحقین ذکور ایک ثلث فی کس اور دو مستحقین اناث بحساب (۱/۶) سُدس فی کس میراث پائیں گے۔

یا دوسری مثال لیجئے۔ ایک مسلمان مرنے کے بعد پانچ اولاد چھوڑ جاتا ہے جن میں کی تین عورتیں اور دو مرد ہیں۔ یعنے ایک پر نواسی کی دو بیٹیاں اور ایک پر نواسے کی ایک بیٹی اور ایک پر نواسی کے دو بیٹے جیسا کہ ذیل کی جدول میں دکھلایا گیا ہے۔



ابو یوسف صاحب کے قول کے مطابق متوفی کی جائداد سات حصوں میں تقسیم ہو کر ہر ایک مرد دو دو اور ہر ایک عورت ایک ایک حصہ پائے گی۔

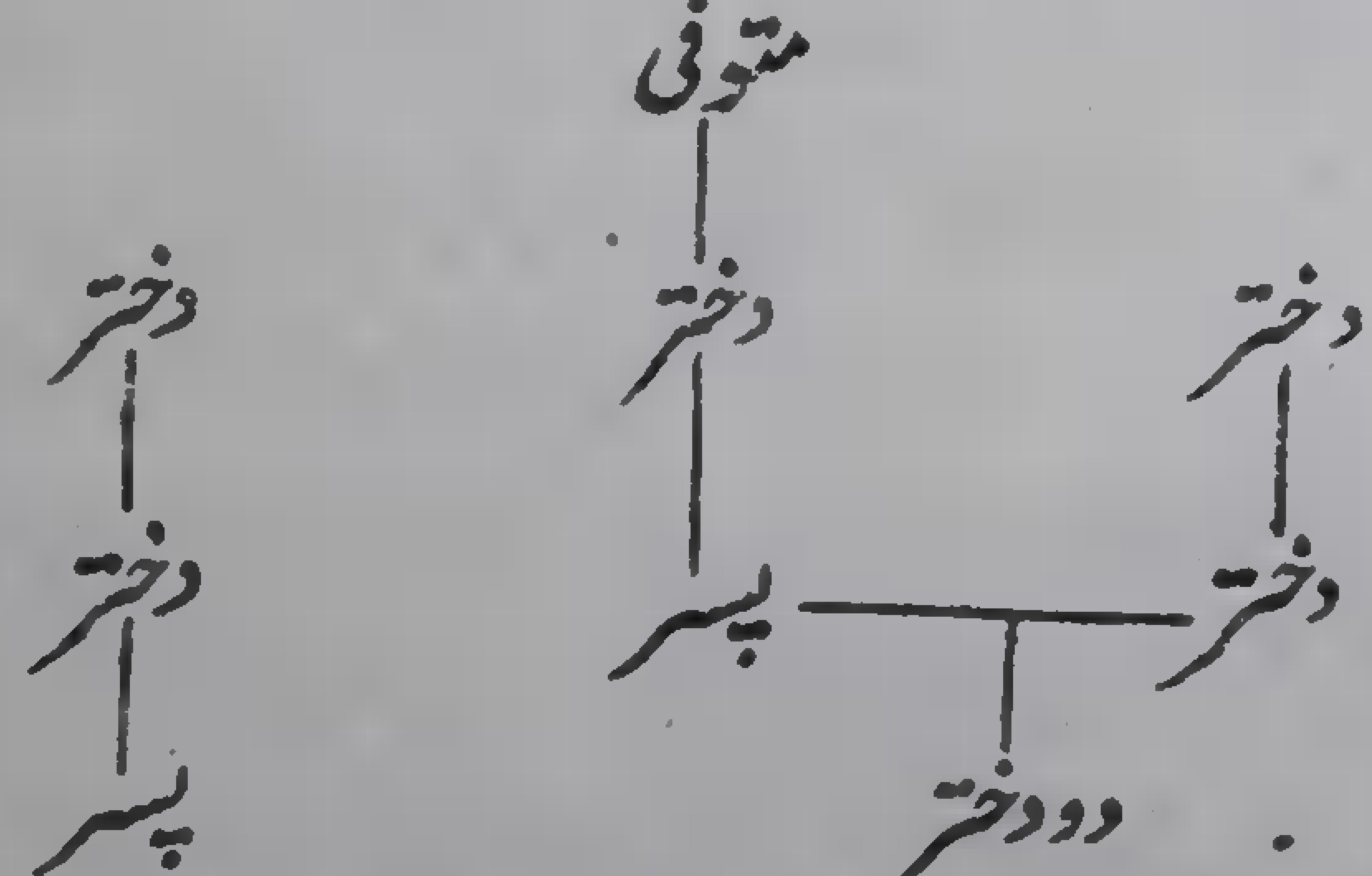
اس کے برعکس محمدؒ کے قول کے موافق جائداد متذکرہ سے کے ۲۸ حصے کئے جا کر نواسے کی دو پر نواسیوں میں سے ہر ایک کو ۸ حصے، نواسی کی پوتی کو ۶ حصے اور دوسری نواسی کے دو نواسوں کو فی کس ۳ حصے ملینگے

اس تقسیم کا سبب حسب ذیل ہے:-

چونکہ شکل ہذا میں اولاد کی جنس کا اختلاف سب سے پہلے دوسری پشت میں واقع ہوتا ہے اس لئے پ ۱ (جو دست چپ کے سلسلہ کی دوسری پشت میں بیٹا ہے) جس کی دو اولاد میراث کی مستحق ہیں اپنی اولاد کی تعداد کی بنا پر دو مرد کے برابر متصور ہوگا (یعنے جو برابر ہے چار

عورتوں کے)؛ د ا کی (جو دست راست کے سلسلہ کی دوسری بیٹی ہے) دو اولاد مستحقین متروکہ ہیں اس لئے وہ اپنی اولاد کی تعداد کے سبب سے دو عورتوں کے مساوی سمجھی جاتی ہے اور چونکہ د ۲ کی (جو بیچ کے سلسلہ کی دوسری بیٹی ہے) ایک اولاد مستحق متروکہ ہے اس لئے وہ ایک عورت متصور ہوگی اور اس بنا پر جائداد کے سات حصے ہوکر چار حصے یا ۴/۷ ب ا کو ملیں گے؛ چونکہ ب ا اپنے سلسلہ میں آپ تنہا وارث ہے اس لئے اس کا پورا حصہ اُس کی اولاد (یعنے اُس کے دو بیٹوں) میں مساوی تقسیم ہوگا یعنے ہر ایک کو ۲/۷ ملے گا۔ د ا اور د ۲ کے حصے اکٹھا ہوکر اُن کی بلا واسطہ اولاد (پ۲ اور د۳) میں مساوی تقسیم ہوں گے۔ مساوات کی وجہ یہ ہے کہ پ۲ مرد ہونے کے سبب سے دو عورتوں کے برابر ہے اور د ۳ اپنے دو (اولاد) ذکور کی قائم مقامی کرتی ہے اور ان دونوں کے حصے ملائے نہیں جا سکتے جس کے سبب سے د ۳ کے دو بیٹوں سے ہر ایک کو ۳/۱۴ کا نصف ملتا ہے اور پ ۲ کی دختر ۳/۱۴ پاتی ہے۔ بالفاظ دیگر ب ا کی اولاد کو ۱۶ حصے د ا و د ۲ کی اولاد میں چھ چھ حصے تقسیم کئے جاتے ہیں۔

ایک دوسری مثال حسب ذیل ہے:-



ابو یوسف صاحب کے قول کے مطابق اولاد ذکور کے درمیان ایک ثلث اور اولاد اناث میں دو ثلث متروکہ تقسیم ہوگا۔

لیکن محمد کے قول سے میراث کے ۲۸ حصے ہوکر اناث کو ۲۲ حصے

(حق پدری کی بنا پر ۱۲ اور حق مادری کے سبب سے ۶ حصے) اور بیٹے کو محض بر بنائے حق مادری صرف ۶ حصے ملیں گے۔ (۲) دوسری قسم کے ذوی الارحام کی وراثت میں بھی انھی قواعد کی پابندی کی جاتی ہے یعنے۔

(الف) متوفی سے قرابت قریبہ رکھنا۔

(ب) اس شخص کی حالیت اور جنس (نوع یعنے تذکیر و تانیث) کا لحاظ کیا جانا جس کے واسطہ سے مستحقین میراث متوفی سے قرابت رکھتے ہیں یعنے یہ دیکھنا ہوگا کہ ایسا شخص درمیانی (مرد ہو کہ عورت) ذی فرض ہے کہ عصبہ بشرطیکہ اسمات برابر ہوں اور اس کے سوائے قاعدۂ ذیل پر بھی غور کیا جاتا ہے۔

(ج) اگر مستحقین متروکہ دو سمت کی بنا پر قرابت رکھتے ہیں تو باپ کی سمت والوں کی جنس و صنف میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا مثلاً۔ دادی کے باپ کو $\frac{2}{3}$ اور نانی کے باپ کو $\frac{1}{3}$ ملتا ہے (۳) تیسری قسم کے ذوی الارحام کی وراثت سے بھی یہی قواعد متعلق ہیں[1]۔ مثلاً بھتیجے کی بیٹی اور بھانجی کا بیٹا متوفی سے برابر کا فاصلہ رکھتے ہیں یعنے دونوں کو مساوی درجہ کی قرابت بعیدہ حاصل ہے لیکن چونکہ بھتیجا عصبہ ہے اس لئے اس کی بیٹی کو بھانجی کے بیٹے پر متروکہ میں ترجیح ہے۔

اس طبقہ کے ورثا کے متعلق قواعد ذیل قابل توجہ ہیں:—

(الف) جب مستحقین وراثت درجہ میں برابر ہوں تو حقیقی بھائیوں کی اولاد سوتیلے بھائیوں کو محجوب لارث کرتی ہے۔ لیکن اُن کے سبب سے اخیافی بھائیوں اور بہنوں کی اولاد محروم نہیں ہو سکتی۔

(ب) مگر حقیقی بہنوں کی اولاد سوتیلے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کی حاجب نہیں ہے۔

(ج) اخیافی بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کو اُن کے اجداد (یا مورثین) کا

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۰۳۔

حصہ ملتا ہے (یعنے ایک ثلث $\frac{1}{3}$) - (۴) چوتھی قسم کے ذوی الارحام میں اگر اسمات برابر ہوں تو متوفی کی قرابت قریبہ کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن جب نسب کی سمتوں میں فرق ہو تو قوت و قرب قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا -

جن لوگوں میں باپ اور ماں دونوں جانب سے قرابت ہوتی ہے ان کو ان اشخاص پر ترجیح حاصل ہے جو محض باپ کی جانب سے قرابت دار ہوتے ہیں اور جو اشخاص صرف باپ کے سبب سے قرابت دار ہو جاتے ہیں ان کو محض ماں کی جانب کے قرابت داروں پر ترجیح دی جاتی ہے اور ان کے مرد و عورت ہونے کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا - اور جب ایسے رشتہ داروں میں چند ذکور اور بعض اناث ہوں اور وہ جب قرابت میں برابر ہوں تو مرد کو عورت کا دوچند حصہ ملتا ہے -

مثلاً اگر ایک چچا اور ایک پھپی جن کی ایک ہی ماں ہو میراث کا ادعا کریں یا ماموں اور خالہ جن کے ماں باپ یا جن کا صرف باپ یا محض ماں ایک ہو اور اگر اُن کی نسب کی سمتیں مختلف ہوں تو اُن کی قرب قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا - چنانچہ ایک حقیقی پھپی اور ایک اخیافی خالہ یا حقیقی خالہ اور اخیافی پھپی میراث کی مستحق ہوں تو باپ کے قرابت داروں کو دو ثلث کیونکہ باپ کا حصہ اسی قدر ہے اور ماں کے قرابت داروں میں ایک ثلث کیونکہ اسی قدر حصہ ماں کو ملتا ہے متروکہ پہنچتا ہے اور جس قدر حصہ جس گروہ کو ملتا ہے وہ ان میں تقسیم کر دیا جاتا ہے گویا کہ وہ سب آپس میں ایک ہی قسم کی قرابت رکھتے ہیں اور اس طرح حقیقی پھپی کے سبب سے اخیافی چچا اور سوتیلی پھپی محروم الارث ہو جاتی ہیں لیکن میت کے سوتیلے ماموں اور خالائیں محجوب نہیں ہوسکتی ہیں - اور اسی طرح ماموں اور خالہ کی موجودگی سے اخیافی چچا اور سوتیلی پھپی محجوب الارث نہیں قرار پاتے ہیں - چنانچہ باپ کی جانب کے اعزا میں دو ثلث اور مادری قرابت داروں میں ایک ثلث میراث

تقسیم ہوتی ہے۔

فصل چوتھی

مسئلۂ وِلا

ورثائے مصرحۂ بالا کے سوائے سنیوں کے نزدیک ایک اور قسم کا حق وراثت ہے جو قرابت وِلا پر مبنی ہے حنفیہ کے پاس ولا کی دو قسمیں ہیں یعنے ولاء العتق (وہ حق وراثت جو غلام کو آزاد کرنے سے ملتی ہے) اور ولاء الموالات (حق وراثت جو موالات سے حاصل ہوتا ہے)۔

شیعوں کے نزدیک تین قسم کی ولاء معتبر ہے جن میں سے دو قسمیں اُن اقسام کے مشابہ ہیں جو سنیوں کے نزدیک مسلم ہیں مگر فریقین میں اس مسئلہ کی نسبت اس قدر اختلاف ہے کہ شیعہ آزاد کرنے والے کے حق وراثت کو اُس وقت تک ملتوی رکھتے ہیں جب تک سب اقربائے نسبی ختم ہو جائیں اور سنی آزاد کرنے والے کے حق وراثت کو ذوی الارحام کی وراثت پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کردے اور وہ غلام اپنے مرنے کے بعد ذوی الارحام کی قسم سے چند ورثا چھوڑ جائے تو سنیوں کے نزدیک آزاد کرنے والا ذوی الارحام کو محجوب الارث کردے گا ہدایہ میں لکھا ہے کہ " ولاء العتق سے عصوبت قائم ہوتی ہے یعنے جب کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے تو وہ ایسے غلام کا عصبہ ہو جاتا ہے اور اس کی توریث کے مستحق ہونے میں اس کے ماموں اور خالہ اور دوسرے ذوی الارحام کے مقابلہ میں ترجیح پاتا ہے "۔

اس بنا پر سنت جماعت کی شرع میں آزاد کنندہ کو عصبہ بسبب خاص کہتے ہیں۔ جس صورت میں عاتق یعنے آزاد کرنے والا موجود نہ ہو تو اُس کے

عصبات ذکور عتیق متوفی کے وارث ہوتے ہیں لیکن عصبات اناث وارث نہیں ہوتے مگر اناث اُس وقت اُس کے وارث ہوتے ہیں جبکہ خود انھوں نے اس غلام کو آزاد کیا ہو اگر عتیق متوفی نے کوئی وارث ذوی الفروض میں سے یا عصبہ نسبی سے نہ چھوڑا ہو تو اُس کی کل جائداد عصبہ با لولا کو ملے گی یعنے آزاد کرنے والے کو یا اس کے عصبات ذکور کو۔ اور اس کے ذوی الارحام بالکل محروم الارث ہوں گے اگر اُس نے کوئی وارث ذوی الفروض میں سے چھوڑا ہو تو عصبہ با لولا کو کچھ نہ ملے گا۔ مگر عاتق اور اس کے عصبات ذکور کی توریث عتیق میں اہل سنت نے ترتیب وراثت میں کسی قدر ردو بدل کیا ہے

حق عاتق۔

مثلاً عام مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک بیٹا اور باپ چھوڑ جائے تو باپ کو اس کا سہم شرعی ایک سدس ملے گا اور جو باقی رہے وہ بیٹے کو دیا جائے گا لیکن اگر کوئی غلام عتیق اپنے مرنے کے بعد کوئی عصبۂ نسبی نہ چھوڑے بلکہ صرف اپنے عاتق کے باپ اور بیٹے کو چھوڑ جائے تو عاتق کا بیٹا عتیق متوفی کی کل جائداد پائے گا اور عاتق کے باپ کو کچھ نہ ملے گا۔ یہی کیفیت اُس وقت بھی ہوگی جبکہ عاتق کے بیٹے کے ساتھ اس کا دادا بھی موجود ہو۔ عام اصول یہ ہے کہ عصبات لسبب الخاص کی توریث میں عصبۂ قریب کو کل جائداد کے پانے میں عصبۂ بعید پر ترجیح دی جاتی ہے۔

مسئلہ ترتیب وراثت میں تغیر۔

عام اصول۔

مسئلہ ولا کی نسبت اب تاریخی دلچسپی باقی رہ گئی ہے یہ ایک قدیم زمانہ کے اصول وراثت کی یادگار سمجھا جاتا ہے کیونکہ دفعہ ۳ ایکٹ ۵ سنہ ۱۸۴۳ء کی رو سے وہ سب دشواریاں جو کسی غلام آزاد کردہ کے قدرتی ورثا کو اُن کی توریث کے متعلق پیش آتی تھیں اب رفع ہوگئی ہیں قانون مذکور نے ہر ایک غلام اور کنیز آزاد شدہ کے حقیقی ورثا کو متوفی کی توریث کا

دفعہ ۳ ایکٹ ۵ سنہ ۱۸۴۳ء

مستحق قرار دیا ہے۔ چنانچہ سید میر امجد الدین خاں بنام ضیاء النسا بیگم کے مقدمہ میں پریوی کونسل نے اس مضمون کا فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ ایکٹ متذکرہ کی رو سے غلام آزاد شدہ کے قدرتی ورثا کی توریث میں اب کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ بہرحال اس قانون موضوعہ کا اثر یہ ہے کہ اب کسی ایسے شخص کے ورثا جو پہلے کسی کا غلام رہا ہو اور بعدازاں اس کے مالک نے اسے آزاد کیا ہو اپنی قدرتی ترتیب وراثت کے موافق مستحق توریث قرار پاتے ہیں۔

جب کوئی مسلم یا مسلمہ اپنے مرنے کے بعد کسی ایسے قرابت دار کو نہ چھوڑ جائے جس سے اس کو شرکت خون ہو بلکہ اس کے عوض کوئی زوجہ یا شوہر جیسی کہ صورت ہو باقی رہ جائے تو شوہر یا زوجہ کو متوفیہ یا متوفی کی کل میراث ملتی ہے[1]۔

جن ورثا کی صراحت فقرات بالا میں کی گئی ہے اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو متوفی کی میراث اس شخص کو پہنچتی ہے جسے متوفی نے اپنے جرائم یا قصور کے واسطے کسی کو ذمہ دار قرار دیا ہو۔ چونکہ یہ خاص طریقۂ ولایت ہندوستان میں مروج نہیں ہے لہذا سینوں کے ان احکام کے متعلق کچھ بیان کرنا بے سود ہے۔

وارث متذکرۂ صدر کے بعد اس وارث کی نوبت آتی ہے جو مقرلہ بالنسب علی الغیر کہلاتا ہے اور یہ وہ وارث ہے جس کو متوفی نے بجز رشتۂ پدری اپنا ایک عزیز بیان کیا ہو (لیکن مقر اور مقرلہ کا نسب معلوم نہ ہو)۔ مثلاً اگر کوئی دو شخص جن کی ولدیت نامعلوم ہو ایک دوسرے کو بھائی پکارتے ہوں جب ان میں سے ایک مرجائے اور کوئی وارث نہ چھوڑ سکے

مقرلہ بالنسب علی الغیر۔

---

[1] محمد ارشد چودھری بنام ساجدہ بانو ۱۸۷۸ء کلکتہ جلد ۳ صفحہ ۷۰۲ - بغاطون بنام ولایتی خانم ۱۹۰۲ء کلکتہ جلد ۳۰ صفحہ ۶۸۳۔

دوسرا اس کی میراث پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایسے موصی لہ کی نوبت آتی ہے جس کے واسطے متوفی نے ثلث مال سے زیادہ کی وصیت کی ہو[1]۔

سب سے آخر میں بیت المال کل مسلمانوں کے فائدہ کے لئے وارث قرار پاتا ہے[2] (چونکہ اس زمانہ میں بیت المال نہیں ہے لہذا ذوی الفروض سببی پر ہی رد جائز ہے)۔

فصل پانچویں

مسئلۂ رد

جب ذوی الفروض کے سوائے عصبات میں سے کوئی موجود نہ ہو تو سہام شرعیہ نکالنے کے بعد متوفی کی جائداد سے جو باقی رہتا ہے وہ اصول رد کے لحاظ سے ذوی الفروض پر اُن کے حصص کی مناسبت سے تقسیم ہوتا ہے۔

فقہائے متقدمین کا قول ہے کہ شوہر اور زوجہ رد پانے کے مستحق نہیں ہیں مگر متاخرین کے نزدیک جب میت کے دوسرے ورثا از قبیل عصبات موجود نہ ہوں تو میراث شوہر یا زوجہ کو اصول رد سے ملنی چاہئے۔

رد۔ حق شوہر یا زوجہ | ہند کی برطانوی عدالتیں اس قاعدے کو مانتی اور اُس کا نفاذ کراتی ہیں[3]۔

---

[1] چونکہ شرعاً کوئی مسلمان اپنے ورثا کو محروم کرنے کی غرض سے اپنے کل مال کی وصیت نہیں کر سکتا لہذا ایسا موصی لہ جس کے واسطے ثلث مال سے زیادہ کی وصیت ہو عام موصی لہ کہلاتا ہے۔

[2] شرع اسلام کے مطابق لاوارث کا مال حکومت وقت کو کل مسلمانوں کے فائدہ کی غرض سے ملتا ہے۔

[3] محمد ارشد چودھری بنام ساجدہ بانو (اس کا سابق میں حوالہ دیا گیا ہے) بفاطون بنام ولایتی خانم (سابق میں حوالہ دیا گیا ہے)

اشخاص جو رد پلٹے ہیں۔

جن ورثا کو از روئے رد میراث پہنچتی ہے وہ آٹھ ہیں۔
(۱) ماں (۲) دادی (۳) دختر (۴) پوتی (۵) سگی بہن
(۶) سوتیلی بہن (۷) سوتیلا بھائی (۸) اخیافی بہن۔

ایک دو یا تین قسم کے ورثا کو ایک ہی وقت میں رد مل سکتا ہے مگر تین سے زیادہ اقسام کے ورثا ایک ہی وقت میں از روئے رد میراث نہیں پا سکتے۔

سہام شرعیہ نکالنے کے بعد بقیہ متروکہ اشخاص مذکورۂ بالا کو اُن کے حصص کی مقدار کے موافق دیا جاتا ہے۔ مثلاً

جب متوفی کی ایک دادی ایک اخیافی بہن کے ساتھ ہو تو ہر ایک کا حصہ $\frac{۱}{۶}$ ہوگا لہٰذا مابقی ان میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔

جب ایک بیٹی اور ماں ہو تو ان کے حصے $\frac{۱}{۶}$ اور $\frac{۱}{۲}$ ہوں گے اس لئے مابقی ان کے حصوں کی مقدار کے موافق اُن میں $\frac{۳}{۱۲}$ اور $\frac{۱}{۱۲}$ کی مناسبت سے تقسیم کر دیا جائے گا۔

جب دو زوجائین ایک ماں اور تین بیٹیاں ہوں تو دو زوجاؤں کو $\frac{۱}{۸}$ ملے گا ماں کو $\frac{۷}{۸}$ کا $\frac{۱}{۵}$ = $\frac{۷}{۴۰}$ ملے گا۔ اور تینوں بیٹیوں کو $\frac{۷}{۸}$ کا $\frac{۴}{۵}$ = $\frac{۷}{۱۰}$ ملے گا یعنے ہر دختر کو $\frac{۷}{۴۰}$

تو ان سب کا مقسوم علیہ اعظم ۲۴۰ ہوا لہٰذا ہر ایک زوجہ کا حصہ ۱۵، اور ۲ زوجاؤں کا حصہ = ۳۰ ہوا ماں کا حصہ = ۴۲
ہر ایک دختر کا حصہ ۵۶، اور ۳ بیٹیوں کا = $\frac{۱۸۶}{۲۴۰}$

یا ماں : بیٹی = $\frac{۱}{۶}$: $\frac{۱}{۲}$ = ۱ : ۳

ماں — ($\frac{۱}{۶}$ + $\frac{۱}{۱۲}$ = $\frac{۲ + ۱}{۱۲}$) = $\frac{۱}{۴}$

دختر — ($\frac{۱}{۲}$ + $\frac{۳}{۱۲}$ = $\frac{۶ + ۳}{۱۲}$) = $\frac{۳}{۴}$

یا — زوجہ، ماں اور بیٹی

زوجہ = $\frac{۱}{۸}$

ماں : بیٹی = $\frac{۱}{۶}$: $\frac{۱}{۲}$ = ۱ : ۳

ماں = $\frac{1}{4}$ کا $\frac{7}{8}$ = $\frac{7}{32}$

بیٹی = $\frac{3}{4}$ کا $\frac{7}{8}$ = $\frac{21}{32}$

زوجہ، ۴، ماں، ۷، بیٹی، ۲۱،

یا ۔ ۲ زوجائیں، ایک ماں اور ۳ بیٹیاں

۲ زوجہ = $\frac{1}{8}$، ۱ زوجہ = $\frac{1}{16}$

ماں: ۳ بیٹیاں = $\frac{1}{6}$: $\frac{2}{3}$ = ۱ : ۴

جب ایک ماں اور ایک بیٹی اور ایک پوتی ہو تو ان کے سہام شرعیہ $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{2}$ اور $\frac{1}{6}$ = $\frac{5}{6}$ ہوتے ہیں۔ باقی متروکہ ان میں ان کے حصوں کی مناسبت سے تقسیم ہوگا یعنے $\frac{1}{5}$ ماں کو $\frac{1}{5}$ پوتی کو اور $\frac{3}{5}$ بیٹی کو ملے گا یا ۔ ماں اور پوتی مل کر دونوں $\frac{2}{6}$ پائیں گی بیٹی = $\frac{3}{6}$

∴ ماں اور پوتی : بیٹی = $\frac{2}{6}$: $\frac{3}{6}$ = ۲ : ۳

∴ بیٹی $\frac{3}{5}$ پائے گی۔

علی ہذا القیاس ماں اور پوتی $\frac{2}{5}$ پائیں گی۔ اسی طرح بیٹی اور پوتی کو ملے گا

دُہری میراث

اگر متوفی کے ورثا میں سے ایک وارث تقسیم ترکہ کے قبل مر جائے اور اپنے بعد چند وارث چھوڑ جائے تو ایسی صورت میں یہ ورثا اگر وہ دونوں متوفی کے وارث شرعی ہیں تو دونوں کا ترکہ پائیں گے اور اگر ایک ہی کے وارث ہیں تو ایک ہی کا ترکہ پائیں گے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے مرنے کے بعد ایک بیٹا اور ایک بیٹی اور سوتیلا بھائی چھوڑا اس شکل میں اگرچہ بیٹا سوتیلے بھائی کا حاجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ ترکہ تقسیم ہونے کے پہلے مر جائے تو اب اس کے وارث صرف اس کی بہن اور اس کا سوتیلا چچا رہا لہذا اس بیٹے کا حصہ $\frac{2}{3}$ اس بہن اور اس کے چچا میں برابر تقسیم ہوگا۔ اور بہن $\frac{2}{3}$ کا $\frac{1}{2}$ یعنے $\frac{1}{3}$ پائے گی اور چچا باقی متروکہ یعنے $\frac{1}{3}$ پائے گا۔

فصل چھٹی

مسئلۂ عول

سنت جماعت کا قاعدہ

بعض وقت ذوی الفروض کے سہام شرعیہ نکالنے میں ایک خاص وقت پیش آتی ہے یعنے اہل فروض کے حصوں کے کسرات کو جمع کرنے میں ان کی تعداد اصل متروکہ کی مقدار کے لئے جو صحیح عدد مقرر کیا جاتا ہے اس سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے لہذا اس دشواری کو دفع کرنے کی غرض سے سنی فقہا مقسم مشترک میں اضافہ کر کے جملہ سہام مطلوبہ میں ایک نسبتی کمی پیدا کرتے ہیں۔ اس قاعدہ کا نام عول ہے جو فقہ سنت جماعت میں مخصوص اصطلاح ہے اور جس سے مراد ہے کہ مقسم مشترک میں ایک نسبتی اضافہ سے سہام مطلوبہ کا بآسانی تعین ہو سکتا ہے مثلاً اگر کسی عورت کے مرنے کے بعد ایک شوہر اور دو بیٹیاں اور ایک ماں باقی رہیں تو ان کے سہام شرعیہ ایک ربع دو ثلث اور ایک سدس ہوں گے۔ اس شکل میں مقسم مشترک بارہ ہے جس سے وہ سہام نکلتے ہیں جن میں جائداد تقسیم کرنے کی ضرورت ہے یعنے شوہر کا حصہ تین اور بیٹیوں کا حصہ آٹھ اور ماں کا حصہ دو ہوگا۔ لیکن تین اور دو اور آٹھ کی جمع تیرہ ہوتی ہے لہذا اہل سنت جائداد کو تیرہ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ ہر ایک وارث کو اس کا پورا شرعی حصہ مل سکے۔

شیعوں کا قاعدہ

لیکن شیعوں کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔ شیعوں کے نزدیک جب تقسیم کرنے میں سہام مطلوبہ سے جائداد کم ہوتی ہے تو وہ کمی اُس وارث یا اُن ورثا پر عائد کی جاتی ہے

جن کا حصہ یا حق تغیر پذیر ہو مثلاً صورت متذکرۂ صدر میں شیعوں کے نزدیک ماں اور شوہر اپنے پورے حصے بلا کم و کاست پائیں گے اور مابقی ۷/۱۲ دونوں بیٹوں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔

فصل ساتویں

اولاد بعد الموت وغیرہ

مدّت عدّۃ۔ کوئی مسلمان بیوہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد جب تک چار مہینے اور دس دن نہ گذر جائیں از روئے شرع پھر نکاح کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اس مدت کو عدۃ یا زمانۂ بیوگی کہتے ہیں۔ اور اس کی غرض محض بیوہ کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کو دریافت کرنی ہے۔ اگر بیوہ حاملہ ہو تو اُس کی عدت وضع حمل تک باقی رہتی اور طفل جو ایسی حاملہ سے اندرون مدتِ حمل تولد ہو وہ اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے۔ لیکن جب سوائے باپ کے کسی دوسرے قرابت دار کی وفات کے بعد کوئی طفل پیدا ہو تو وہ اُس تصور کی بنا پر کہ اگر وہ متوفی کے زمانۂ حیات میں پیدا ہوتا تو وارث قرار پاتا متوفی کے بعد بھی اس کا ورثائے میت میں شمار کیا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی ولادت متوفی کی وفات کے چھ مہینے کے اندر ہونی چاہیئے ورنہ اُس کا ورثا میں شمار نہ ہوگا۔

آفت ناگہانی کی موت۔ جو لوگ کسی آفت ناگہانی سے مرتے ہیں ان کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ وقت واحد میں فوت ہوئے ہیں اور اس بنا پر ہر ایک ایسی میت کی میراث اگرچہ وہ آپس میں قرابت دار کیوں نہوں (مرد و عورت

جیسی کہ صورت ہو) تو اُس کے زندہ ورثا کو ملتی ہے۔

اشخاص مفقود الخبر قول مالکیہ

قدیم قانون حنفیہ کی رو سے شخص مفقود الخبر ۹۰ برس تک زندہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مالکیہ کا اصول جو زیادہ عقل و فطرت کے مطابق ہے حنفیہ میں بھی نافذ العمل ہے۔ یعنے اگر کسی کی خبر چار سال تک نہ معلوم ہو تو اُس کو مردہ سمجھنا چاہیئے۔

اصول شیعہ۔ اصول شافعی۔

شیعوں میں مفقود الخبر کو میت تصور کرنے کے لئے دس سال کی مدت درکار ہے۔ مگر شافعیؒ کے نزدیک اس کے لئے سات سال کافی ہیں اور یہ وہی مدت ہے جو قانون شہادت ہند میں مفقود الخبر کے لئے معین کی گئی ہے۔

چنانچہ دفعہ ۱۰۷ قانون شہادت ہند کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

قانون شہادت ہند دفعہ ۱۰۷

"جب کسی شخص کے مرنے یا جینے کے متعلق سوال ہو اور اگر یہ بتلایا جائے کہ تاریخ ادعا سے تیس سال کے قبل وہ زندہ تھا تو اس کے مرنے کا بار ثبوت اسی شخص پر ڈالا جاتا ہے جو اس کے مرنے کا ادعا کرتا ہے"

دفعہ ۱۰۸

قانون مذکور کی دفعہ ۱۰۸ کا حکم ہے کہ "جب کسی شخص کی حیات یا موت معرض بحث میں ہو اور یہ ثابت کیا جائے کہ سات سال سے اُن لوگوں کو جو اگر وہ زندہ رہتا قدرتاً اُس کے حالات سے واقف ہوتے اس کی کوئی خبر وصول نہیں ہوئی ہے تو جو فریق کہ اُس کے زندہ ہونے کا مدعی ہے اس پر اس کا بار ثبوت ڈالا جاتا ہے"

واضعان قانون کا مُدّعا۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے جلسۂ کاملہ نے ایک مقدمہ میں یہ تجویز کی ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو حنفیہ کا قدیم قول ہے وہ شہادت کا ایک قاعدہ ہے نہ کہ شرع محمدی کا جزو جس کے سبب سے اس کا نافذ کرانا عدالتوں کے فرائض سے خارج ہے[1]۔

---

[1] منظر علی بنام بدھ سنگھ ۱۸۸۴ء ۶ نظائر قانون ہند سلسلہ الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۲۹۷۔

لیکن میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ مفقود الخبر کی نسبت سات سال کی مدت مقرر کرنے سے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے قواعد شرعیہ کی خلاف ورزی واضعان قانون کا ہرگز منشا نہیں ہے۔ چنانچہ فرض کیجئے کہ ایک حنفی مرد کی زوجہ اپنے شوہر کے چار سال تک مفقود الخبر رہنے کے بعد عقد ثانی کرتی ہے۔ میری رائے میں ایسے عقد ثانی کو دفعہ ۱۰۸ (قانون شہادت) کی رو سے ناجائز قرار دینا ناممکن ہوگا۔

باب سوم

شیعوں کا قانون وراثت

فصل پہلی۔ اقسام ورثا

شیعہ اور سنی کی وراثت کے قانون میں سب سے اہم اختلاف مسئلہ تعصیب کے متعلق ہے۔ شیعہ مسئلہ تعصیب کو مطلق نہیں ملنتے اور ان کے نزدیک اقربائے پدری جن کو فقہ حنفی میں عصبات حقیقی کہتے ہیں کوئی خاص حق نہیں رکھتے ہیں اور نہ انھیں اقربائے مادری پر کسی قسم کی ترجیح حاصل ہے۔

شیعوں کی شرع کے مطابق اسباب توریث دو ہیں :—

حق وراثت مطابق قانون شیعہ

(۱) نسب (مشارکت خون) اور (۲) (سبب وجہ خاص) نسب سے صرف مشارکت خون یعنے خون کا رشتہ

مراد ہے۔ اس لئے میت کے جس قدر اقربائے نسبی ہیں وہ اس کے ترکہ میں حصہ پانے کے مستحق ہیں بجز ان صورتوں کے جبکہ قواعد مانع توریث کا جن کا ذکر آگے آئے گا ان پر اطلاق ہو۔

اقربائے نسبی کے تین طبقات

اقربائے نسبی یعنے وہ لوگ جو مشارکت خون کی وجہ سے متوفی کے وارث قرار دیئے گئے ہیں تین طبقوں پر منقسم ہیں اور ہر طبقہ کے دو دو جزو ہیں۔ پہلے طبقہ کے ورثا دوسرے طبقہ کے ورثا کو محجوب الارث کردیتے ہیں اور اسی طرح اس طبقہ کے ورثا کی موجودگی میں تیسرے طبقہ کے لوگ میراث پانے سے محروم ہوتے ہیں۔

لیکن ہر طبقہ کے دونوں جزوں کے ورثا باہم وارث ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) طبقہ اولی کے ورثا میں جو ازروئے نسب مستحق توریث ہیں اشخاص ذیل داخل ہیں (الف) پہلے درجہ کے آبا و اجداد یعنے والدین اور (ب) اولاد در اولاد یعنے متوفی کی درجہ بدرجہ اولاد خواہ سلسلہ میں وہ کتنی ہی پست کیوں نہ ہو۔

(۲) طبقۂ ثانیہ میں یہ لوگ داخل ہیں (الف) سب درجوں کے آبا و اجداد اور (ب) بھائی اور بہنیں اور اُن کی اولاد در اولاد۔

(۳) طبقۂ ثالثہ ہم رتبہ قرابت داروں پر مبنی ہے (الف) باپ کے جانب اور (ب) ماں کی جانب کے مساوی المرتبہ اعزا اور ان کی اولاد خواہ درجہ میں کتنی ہی پست ہو۔ مثلاً (۱) چچا اور پھپیاں (۲) ماموں اور خالائیں خواہ درجہ میں کتنی ہی بلند اور اُن کی اولاد خواہ درجہ میں کتنی ہی پست کیوں نہ ہو۔

سلسلۂ توریث

جب طبقۂ اولی کا ایک وارث بھی باقی ہو تو وہ طبقۂ ثانیہ اور طبقۂ ثالثہ کے ورثا کو بالکل محجوب الارث کردیگا۔ اسی طرح طبقۂ ثانیہ کے کسی ایک وارث کی موجودگی میں طبقہ ثالثہ کے کل ورثا محروم ہوجائیں گے۔

مگر ہر ایک طبقہ کے دونوں جزوں کے ورثا ایک ساتھ وارث ہوتے ہیں۔ مثلاً متوفی کے والدین اس کی اولاد کے ساتھ متروکہ میں حصہ پاتے ہیں اور دادا دادی کو بھائی بہنوں کے ساتھ میراث ملتی ہے اور ماموں اور خالائیں چچا اور پھپیوں کے ساتھ میراث پاتے ہیں۔ متوفی کا محض ایک بچہ یا اُس کی اولاد بھائی اور بہنوں اور اُن کی اولاد کو بالکل محجوب الارث کر دیتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بھائی اور بہنیں اور ان کی اولاد کے سبب سے چچا اور پھوپیاں بالکل محروم الارث ہو جاتی ہیں لیکن یہ لوگ اجداد یعنے دادا پردادا وغیرہ کے ساتھ میراث پاتے ہیں۔

فرق مابین قواعد سنی اور شیعہ

جب کسی سنی مسلمان کے مرنے کے بعد نواسی ایک بھتیجہ کے ساتھ موجود ہو تو بھتیجہ عصبہ ہونے کی وجہ سے متوفی کی نواسی کو بالکل ترکہ سے محروم کر دیتا ہے۔ لیکن شیعوں میں متوفی کی نواسی چونکہ اس کی اولاد کی اولاد ہے لہذا کل جائداد کی وارث ہو گی اور بھتیجہ کو کچھ نہ ملے گا۔

اگر کوئی سنی مسلمان مرنے کے بعد ایک بیٹی اور ایک بھائی چھوڑ جائے تو بیٹی کو اس کا سہم شرعی ملے گا یعنے نصف متروکہ اور مابقی بھائی کو بطور عصبہ کے دیا جائے گا۔ لیکن شیعوں کے قانون کی رو سے بیٹی کل جائداد کی مالک ہو گی، اس طرح کہ نصف متروکہ بطور سہم شرعی اور باقی نصف مسئلہ رد کے مطابق اس کو ملے گا۔

حق وراثت جو کسی خاص سبب پر مبنی ہوتا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں۔

قرابت سببی

(۱) وراثت بسبب زوجیت اور
(۲) وراثت بسبب ولا یا قرابت سببی

(۱) حق وراثت بسبب زوجیت جملہ حالات میں شخص خاص سے متعلق ہوتا ہے اور اس وجہ سے شوہر یا زوجہ ایک دوسرے کی

وراثت میں کبھی محجوب الارث نہیں ہوتے ہیں۔ اگر متوفی اپنے بعد ایک زوجہ اور ایک اولاد چھوڑ جائے تو زوجہ کو اس کا سہم شرعی اور اولاد کو مابقی بربنائے رد ملے گا۔ اسی طرح اگر متوفی کی ایک زوجہ اُس کے ماں باپ یا دادا دادی یا بھائی اور بہنوں کے ساتھ موجود ہو تو سب سے پہلے اُس کو اُس کا سہم شرعی دے دیا جائے گا اور اس کے بعد جائداد اُن ورثا پر تقسیم ہوگی جو از روئے نسب مستحق وراثت ہیں۔

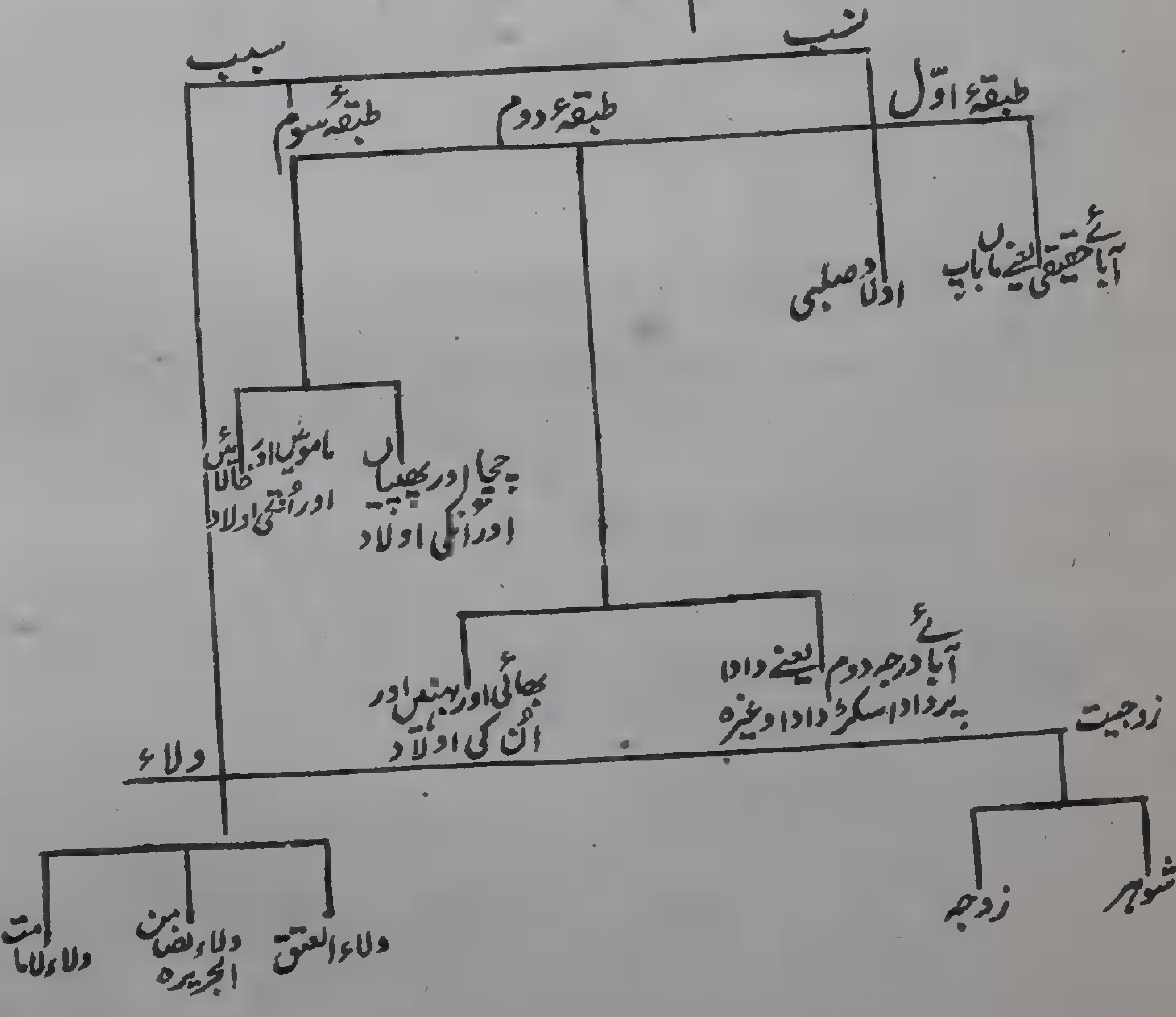
(۲) وراثت بسبب ولا تین قسموں پر منقسم ہے یعنے۔

(الف) ولاء العتق یعنے غلام آزاد کرنے والے کا حق وراثت۔

(ب) ولاء ضامن الجریرہ یعنے حق وراثت اُس شخص کا جو متوفی کے قصور و جرائم کے واسطے ضامن ہوکر اس کے لئے اپنے کو ذمہ دار بنایا ہو۔

(ج) ولاء امام یعنے حق وراثت جو امام زماں کو اس وجہ سے حاصل ہے کہ وہ ہادی و رہنمائے خلق ہے۔

نقشہ تقسیم میراث موافق مذہب شیعہ



فصل دوسری

اقسام اقرباءِ نسبی

شیعوں کے قانون کے مطابق جو ورثا نسب کی وجہ سے حق وراثت رکھتے ہیں وہ تین گروہ پر منقسم ہیں یعنے :-

اقرباءِ نسبی کے تین طبقات ہیں

(۱) طبقۂ اولیٰ میں میت کے ایسے ورثا داخل ہیں جن کے سہام شرعیہ قرآن مجید میں معین ہیں اور اس لئے یہ ذو فرض کہلاتے ہیں۔ ذوی الفروض کی بابت سنی اور شیعہ متفق ہیں۔

(۲) طبقۂ ثانیہ میں ایسے ورثا داخل ہیں جو کبھی بطور ذو فرض کے اور کبھی اُس قرابت کی وجہ سے جو وہ متوفی کے ساتھ رکھتے ہیں ترکہ پاتے ہیں۔

(۳) طبقۂ ثالثہ میں وہ ورثا داخل ہیں جو صرف قرابت کی وجہ سے مستحق توریث ہوتے ہیں لہذا ان کو ذو القرابت اور ان کے حصوں کو سہام القرابت کہتے ہیں۔

ورثا جن کے شرعی حصے معین ہیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) بیٹے یا بیٹیاں جب متوفی کا باپ موجود نہ ہو اور متوفی کے ایک یا ایک سے زیادہ سگے بھائی باقی رہیں۔

(۲) سگی بہن یا بہنیں اور علاتی بہن یا بہنیں جب دادا اور بھائی یا اُس طبقہ کے بھائی جس طبقہ کے وہ خود ہوں موجود نہ ہوں۔

(۳) باپ جب متوفی کی ایک یا ایک سے زیادہ اولاد موجود ہو۔

(۴) ماں۔

(۵) شوہر یا۔

(۶) زوجہ۔

(۷) اخیافی بھائی یا بہنیں (یعنے متوفی اور ان لوگوں کی ایک ماں اور کئی باپ ہوں)۔

جب میت کا ایک ہی وارث ہو خواہ وہ ذو فرض ہو کہ ذو قرابت یا خاص قرابت سببی کی وجہ سے مستحق وراثت ہو بہرحال اُسی ایک وارث کو کُل ترکہ ملے گا۔

ایسا ہی اگر میت نے ایک پوتی لڑکی چھوڑی ہو تو وہ اپنا سہام معینہ یعنے نصف میراث لینے کے بعد جو نصف متروکہ بچ رہتا ہے اُس کو بھی مسئلہ رد کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس چونکہ ایک پوتے فرزند کا اُس کے باپ کی میراث میں شرع کی رو سے کوئی مخصوص و معین سہام نہیں ہے لہٰذا وہ محض اپنے حق قرابت کی بنا پر متروکہ پدری کا مالک قرار پاتا ہے۔

جب کوئی مرد یا عورت اپنے مرنے کے بعد شوہر یا زوجہ کے سوائے کوئی دوسرا قرابت دار نہ چھوڑے تو بربنائے سبب زوجیت وہ عورت یا مرد جیسی کہ شکل ہو جملہ متروکہ پائے گی۔ پہلے تو اُس کو اُس کا سہام شرعی دیا جائے گا اور مابقی بطور رد اُسی کو ملے گا۔

جب ورثا میں ذکور و اناث بلحاظ قرابت ایک درجہ رکھتے ہوں تو مرد کو عورت کے حصہ کا دوچند ملتا ہے مثلاً بیٹا بیٹی سے دوچند اور پوتا پوتی سے دوچند متروکہ حاصل کرتا ہے وقس علیٰ ہذا۔

مرد اور عورتوں کے حصے عام قاعدہ

لیکن اقرباء مادری اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ ہیں مثلاً اخیافی بھائی اور بہنیں جو ایک ثلث ان کو ملتا ہے اس کو بلا امتیاز ذکور و اناث برابر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ جب ایسے دو یا دو سے زیادہ ورثا ہوں جن کا حق وراثت قرابت یا سبب پر مبنی ہو اور وہ ذو فرض نہ ہوں تو جائداد اُن کے حقوق کی مناسبت سے اُن کو دی جاتی ہے مثلاً جب دو بیٹے ہوں تو وہ جائداد کو برابر تقسیم کرتے ہیں اور اگر ایک بیٹا یا ایک بیٹی ہو تو بیٹے کو دو ثلث اور بیٹی کو ایک ثلث ملتا ہے۔

جب میت کے ورثاء میں بعض اُس کے اقربائے پدری اور بعض اقربائے مادری ہوں تو ہر ایک گروہِ ورثا اُس شخص کا حصہ پائے گا جس کے واسطے اور ذریعہ سے وہ میت سے قرابت رکھتا ہے مثلاً جب چچا اور پھپیاں، ماموں اور خالائیں موجود ہوں تو اُن اشخاص کو جو میت کے باپ کے توسط سے میت سے رشتہ رکھتے ہیں دو ثلث اور جو لوگ ماں کی جانب سے میت کے اقربا قرار پاتے ہیں اُن کو ایک ثلث دیا جائے گا۔ لیکن اگر ایسے قرابت دار ورثاء کی نوعیت اور جنس میں اختلاف ہو تو ہر نوع کے ورثاء کو اُن کی جنس اور اُن کے شخصی اور منفردہ حق کے موافق حصہ ملے گا مثلاً جب متوفی چند چچا اور پھپیاں چھوڑ جاتا ہے تو اُن کے کل گروہ کو دو ثلث متروکہ دیا جاتا ہے لیکن یہ دو ثلث اُس گروہ کے افراد میں اس مناسبت سے تقسیم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مرد کو عورت کے حصہ سے دو چند حصہ ملتا ہے۔

اقربائے پدری و اقربائے مادری۔

اگر کسی سبب سے ورثائے نسبی کی اولاد محروم الارث نہ ہوئی ہو تو وہ اپنے والدین متوفی یا محجوب کے قائم مقام بن کر اُن کا حصہ پاتی ہے مثلاً ایک شخص کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے اور بیٹی کی اولاد اُس کے وارث ہوں تو بیٹے کی اولاد میراث کا دو ثلث لے کر اپنے حصوں کے موافق آپس میں تقسیم کر لے گی اور ایک ثلث متروکہ بیٹی کی اولاد کو ملے گا اور جس کی اُسی طرح اُن میں تقسیم کی جائے گی۔

جب دو یا زیادہ ورثاء ہوں اور اُن میں سے بعض ذو فرض اور بعض ذو قرابت ہوں تو پہلے ہر ایک ذو فرض کو اُس کا حصہ دیا جائے گا اور مابقی ذو قرابت ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

جب چند کامل القرابت[1] اور چند ناقص القرابت[2] اعزا ہوں تو اقربائے مادری ایک ثلث لے کر بلا لحاظ جنس یعنے ذکور و اناث باہم برابر تقسیم کر لیں گے اور مابقی اقربائے کامل القرابت میں

ناقص القرابت

---

[1] یعنے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے۔

[2] یعنے صرف ماں یا فقط باپ کی جانب سے۔

بمقادیر معینہ تقسیم کیا جائے گا اور اقربائے پدری بالکل محجوب الارث ہو جائیں گے۔

مثلاً ایک شخص کے مرنے کے بعد اُس کے ورثا میں چند سگے بھائی اور بہنیں اور بعض علاتی و اخیافی بھائی اور بہنیں باقی رہیں تو اخیافی بھائی اور بہنوں کو ایک ثلث میراث ملتی ہے اور اُن کو بلا امتیاز تذکیر و تانیث اس ایک ثلث کو آپس میں برابر تقسیم کر لینی چاہئے لیکن اگر صرف ایک اخیافی بھائی یا ایک اخیافی بہن ہو تو اُس کو ایک سدس ملتا ہے اور باقی سگے بھائی اور بہنوں میں دو اور ایک کی مناسبت سے تقسیم کیا جائے گا اور سوتیلے بھائی محروم الارث قرار پائیں گے۔

اقربائے کامل القرابت کی عدم موجودگی میں اقربائے پدری ترکہ پاتے ہیں ورنہ اُن کو میراث میں حصہ نہیں مل سکتا مثلاً:—

اگر متوفی کے بعد ایک سوتیلا بھائی اور ایک سگی بہن باقی رہ جائیں تو سگی بہن کی وجہ سے سوتیلا بھائی بالکل محجوب الارث ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی جس قدر اشکال ہیں وہ سب اسی قاعدے کے تابع ہیں۔

شوہر اور زوجہ کبھی محروم الارث نہیں ہوتے۔

شوہر اور زوجہ کبھی محروم الارث نہیں ہوتے۔ اگرچہ قدیم زمانہ میں بر بنائے رد زوجہ کو کچھ نہیں ملتا تھا لیکن علمائے حال کا خیال ہے اور اس کے مطابق فیصلے بھی ہوئے ہیں کہ ایسی زوجہ کو جس کے شوہر کی وفات کے بعد اُس کے قدرتی ورثا موجود نہ ہوں رد[1] ملنا چاہئے۔

جب چند اقربائے پدری اور چند اقربائے مادری ہوں اور دونوں قسم کے اقربا درجۂ قرابت اور طبقۂ وراثت میں برابر ہوں تو دونوں قسم کے

[1] دیکھو صفحہ ۳۱ ماسبق۔

ورثا اپنا اپنا حصہ لے کر باقی میراث کی آپس میں رسدی تقسیم کرلیں گے۔

مثلاً میت کی ایک علاتی بہن اور ایک اخیافی بہن موجود ہوں تو دونوں بہنیں اپنا اپنا حصہ پائیں گی یعنے پہلی بہن نصف اور دوسری بہن سدس اور ما بقی ایک ثلث تین اور ایک کی نسبت سے اُنھی دونوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔

کل سہام شرعیہ تعداد میں چھ ہیں یعنے نصف۔ ربع۔ ثمن۔ ثلث۔ دو ثلث۔ اور ایک سدس۔

(۱) نصف ورثائے ذیل کو ملتا ہے:۔

(الف) شوہر کو جب اولاد نہ ہو۔

(ب) سگی بہن کو جب دوسرے ورثا نہ ہوں۔

(ج) بیٹی کو جب ایک ہی ہو۔

(۲) ربع ورثائے ذیل پاتے ہیں۔

(الف) شوہر جب اولاد ہو۔

(ب) زوجہ جب اولاد نہ ہو۔

(۳) ثمن زوجہ یا ازواج کو ملتا ہے جب اولاد یا اولاد کی اولاد ہو چاہے یہ لوگ درجہ میں کتنے ہی پست ہوں۔

(۴) ایک ثلث ورثائے ذیل کو ملتا ہے:۔

(الف) اخیافی بھائی اور بہنوں کو جب دو یا زیادہ ہوں۔

(ب) ماں کو جب متوفی نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو یا دو یا زیادہ بھائی یا ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑی ہوں۔

(۵) دو ثلث ورثائے ذیل کو ملتا ہے:۔

(الف) دو یا زیادہ بیٹیوں کو جب کوئی بیٹا یا بیٹے نہ ہوں۔

(ب) دو یا زیادہ سگی یا علاتی بہنوں کو جب کوئی سگے یا علاتی بھائیوں میں سے موجود نہ ہو۔

(۶) ایک سدس ورثائے ذیل کو ملتا ہے:۔

(الف) باپ اور ماں کو جب متوفی کی اولاد صلبی موجود ہو۔

(ب) ماں کو جب دو یا زیادہ سگے بھائی یا ایک سگا بھائی اور کئی سگی بہنیں موجود ہوں (یا ایک علاتی بھائی اور کئی علاتی بہنیں موجود ہوں اور خود باپ بھی زندہ ہو)

(ج) متوفی کی ماں کی ایک ہی اولاد کو خواہ وہ مرد ہو کہ عورت مگر اس کے باپ سے نہ ہو یعنے ایک ہی اخیافی بہن یا بھائی کو۔

شیعوں کے مذہب میں ایسی بیوہ کو جس کی شوہر کے مرنے کے وقت کوئی اولاد باقی نہ رہے شوہر متوفی کی جائداد غیر منقولہ اور اراضی میں کسی قسم کا حصہ نہیں ملتا لیکن صرف جائداد منقولہ اور مکانات اور عمارات وغیرہ کی قیمت میں وہ حصہ پانے کی مستحق ہے[1]۔

باب چہارم

موانع الارث

مسلمانوں کے قانون میں بعض اسباب کی بنا پر وارث مورث کی جائداد پانے سے ممنوع قرار پاتا ہے۔

(۱) ان میں کا پہلا سبب اختلاف دین ہے جو اصطلاحاً کفر

---

[1] تونان جان بنام مہدی بیگم سنہ ۱۸۶۱ء آگرہ جلد ۳ صفحہ ۱۳ - آسلو بنام عمدۃ النسا سنہ ۱۸۳۷ء ویکلی ریورٹر جلد ۲۰ صفحہ ۲۹۷ - عمر دراز علی خاں بنام ولایت علی خاں سنہ ۱۸۹۶ء الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۱۶۹ - علی حسین بنام ساجدہ بیگم سنہ ۱۸۹۷ء مدراس جلد ۲۱ صفحہ ۲۷ - آغا محمد جعفر بندامین بنام کلثوم بی بی سنہ ۱۸۹۷ء کلکتہ جلد ۲۵ صفحہ ۹ - مظفر علی خاں بنام پاروتی سنہ ۱۹۰۷ء الہ آباد جلد ۲۹ صفحہ ۲۴۰ -

کہلاتا ہے۔ کفر کے معنی وحدانیت خدا اور رسالت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

کفر۔ اس کا مفہوم

انکار کرنا ہے۔ یہی دو باتیں اسلام کے اصل عقاید ہیں۔ جو کوئی شخص خدا کو ایک اور حضرت محمدؐ مصطفےٰ کو اس کا رسول مانے وہ دائرۂ اسلام میں داخل سمجھا جاتا ہے مسلمان بننے کے لئے بس اس قدر عقیدہ کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ اور تکلیف نہیں ہے[۱]۔ لیکن جو لوگ ان دو مخصوص عقائد کے منکر ہیں وہ شرع اسلام کے فوائد سے محروم کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مرنے کے بعد ایک ایسا وارث چھوڑ جائے جو پیدایشی کافر یا مرتد ہو گیا ہو یعنے وحدانیت خدا اور رسالت محمدؐ مصطفےٰ کا منکر ہو تو وہ محروم الارث ہو جاتا ہے[۲]۔

ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء کی رو سے مسلمانوں کے قانون وراثت میں کسی قدر تغیر و تبدل واقع ہو گیا ہے۔ جن اصول کی بنا پر غیر مسلم یعنے

ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء

کافر محروم الارث کیا جاتا تھا ان کا اطلاق ان لوگوں پر بھی جو کسی اور مذہب میں پیدا ہوئے ہوں اور نیز اُن اشخاص پر جنھوں نے اسلام ترک کر دیا ہو یعنے مرتد ہو گئے ہوں کیا جاتا تھا یعنے کافر فطری اور مرتد دونوں اس حکم شرع میں داخل تھے

---

[۱] دیکھو ضمیمہ متعلقہ۔

[۲] جو شخص خدا کا قائل اور موحد ہو گو وہ اپنے کو مسلمان نہ کہتا ہو لیکن محمد مصطفےٰ کو خدا کے رسولوں میں کا ایک نبی برحق سمجھتا ہو مشکل سے کافر کہلا سکتا ہے۔ اکثر علمائے اسلام راجہ رام موہن رائے کو مسلمان نہ کہ کافر سمجھتے تھے۔ جن دو عقاید کا کتاب میں ذکر کیا گیا ہے ان کے ماننے پر اسلام کا انحصار ہے لیکن اسلام کے ہر ایک فرقہ کے مخصوص عقائد کا اُسی فرقہ سے تعلق ہے لہٰذا ان کو بالتفصیل بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ بہرحال ہر ایک فرقہ اپنے مخصوص عقاید کی بنا پر دوسرے فرقوں کے مسلمانوں کو مسلم اور اپنے کو مومن کہتا ہے۔ عقاید مخصوصہ کا تعلق ایمان سے ہے نہ کہ اسلام سے مگر اسکے خلاف ابتدا میں ایمان کے معنی وہی دو عقاید تھے جن کا ذکر ہو چکا لیکن بعد میں ہر ایک فرقہ کے متعصب مسلمانوں نے ایمان کو اپنے خاص خاص عقاید کیلئے مخصوص کر لیا چنانچہ اس بنا پر ایک متعصب سنی شیعہ کو مسلم اور اپنے کو مومن اور ایک متعصب شیعہ اپنے کو مومن اور سنی کو مسلم کہتا ہے۔

اس لئے اگر متوفی تین وارث چھوڑ جاتا اور ان میں سے ایک غیر مسلم اور دوسرا مرتد اور تیسرا مسلم ہوتا تو شرع شریف کی رو سے پہلے دو وارث بالکل محروم الارث ہو جاتے تھے اور کل ترکہ مسلمان وارث کو ملتا تھا گو وہ متوفی سے کیسا ہی بعید القرابت کیوں نہ ہوتا۔

قاعدۂ متعلق بہ ارتداد کی تنسیخ

جو تغیر اس قاعدہ میں ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ع کی رو سے ہوا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ اگرچہ اس قانون میں تنسیخ کے متعلق مبہم سی صرف ایک دفعہ ہے لیکن اُس کا اثر یہ ہوا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے مقدمات وراثت میں اسلامی ضابطۂ وراثت کی اصلی ہیئت بدل دی گئی ہے۔ اس دفعہ میں لکھا ہے کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی کی قلمرو میں جہاں کہیں ایسا قانون یا رواج نافذ ہو جس کی وجہ سے کسی شخص کے حقوق متعلق بہ جائداد کا اتلاف ہوتا ہو یا کسی طرح سے اس کے حق وراثت میں کمی یا محرومیت بسبب کسی مرد یا عورت کے اپنے مذہب کو ترک کر دینے یا اس سے خارج کر دیئے جانے کی وجہ سے ہوتی ہو تو عدالہائے ایسٹ انڈیا کمپنی میں اور نہ اُن عدالتوں میں جو حسب سند شاہی ممالک مذکورہ میں مقرر ہوئی ہیں ایسا قانون یا رواج لبطور قانون نافذ ہوگا۔"

اس قانون سے شرع محمدیؐ کا وہ حکم نافذ العمل نہیں رہا ہے جس کی رو سے ایک مورثِ مسلم کے اقربائے مرتد ترکہ سے محروم ہوتے تھے۔

لیکن اگر کوئی مرتد اپنے مورث کے پہلے مر جائے اور ایسی اولاد چھوڑ جائے جو اپنے باپ یا ماں کے مذہب میں پرورش پاتی ہو تو کیا ایسے مرتد کی اولاد اپنے مسلمان اقربا کی اُس ایکٹ کی رو سے وارث ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب دشواری سے خالی نہیں ہے۔ ایک مقدمہ میں ایک ہندو خاندان کے ایک رکن نے اپنے ہندو مذہب کو ترک کر کے دین اسلام اختیار کیا تھا اور مرنے کے بعد ایک لڑکا چھوڑ گیا

جو مذہب اسلام میں پیدا ہوا تھا۔ جب مسلمان پوتے نے اپنے ہندو دادا کی میراث میں حصہ پانے کی بسنبت دعویٰ کیا تو الہ آباد ہائی کورٹ نے تجویز کی کہ جو دادرسی ایکٹ محولۂ بالا میں اُس شخص کو دی جاتی ہے جو اپنا مذہب سابق ترک کرے اس کا اطلاق اُس کی اولاد پر بھی ہوتا ہے۔ یعنے اس دادرسی سے اس کی اولاد بھی مستفید ہوسکتی ہے[1]۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے (انسان) کی موت کا باعث ہو وہ اس دوسرے شخص کی میراث نہیں پاسکتا یعنے قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا۔

قتل انسان اہل سنت کا قول

سینوں کے قانون میں قتل انسان خواہ عمداً ہو یا سہواً ہمیشہ مانع ارث ہوتا ہے۔

شیعوں کا قول شیعوں کے مذہب میں قتل انسان صرف اس صورت میں مانع ارث ہوتا ہے جبکہ عمداً اور بلا سبب وقوع میں آیا ہو۔ اگر کوئی کسی کو سہواً یا اتفاقاً قتل کرڈالے تو قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہ ہوگا۔

(۳) غلامی شیعہ اور سنی دونوں کے مذہب میں مانع ارث ہے۔

رقیت (غلامی) اگر کوئی شخص مرنے کے بعد ایسے دو وارث چھوڑ جائے جن میں کا ایک آزاد اور ایک غلام ہو اور اگرچہ غلام آزاد سے زیادہ متوفی کا قریب القرابت ہو لیکن آزاد کل میراث پائے گا۔

اگر کسی غلام یا کنیز کی کوئی اولاد ہو جو آزاد ہو تو اس کو اپنے والدین پر ترجیح حاصل ہوگی اور وہ ان کو محروم کرکے خود میراث پائے گا۔

چونکہ لونڈی غلام بنانے کا اب ہند میں دستور باقی نہیں رہا لہٰذا شرع محمدیؐ کے اس قاعدہ کی اب ضرورت نہیں محض تاریخی دلچسپی کی بنا پر اس کا ذکر کیا گیا۔

(۴) سینوں کے مذہب میں ولد الزنا[2] اپنے باپ یا اقربائے پدری

---

[1] بھگونت سنگھ بنام کالو ۱۸۸۹ء الہ آباد جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۰۔

[2] دیکھو مابعد صفحہ ۵۶۔

کی میراث نہیں پا سکتا۔ لیکن میت کی اگر کوئی دوسری حلال اولاد نہ ہو تو ولدالزنا اپنی ماں اور اقربائے مادری کا ترکہ پانے کا مستحق ہے[1]۔

شیعوں کے قانون کی رو سے ولدالزنا چونکہ اولاد ہی نہیں سمجھا جاتا اس لئے وہ والدین میں سے کسی ایک کا بھی وارث نہیں ہو سکتا[2]۔ اگر ولدالزنا مر جائے اور والدین یا ایسے اقربا چھوڑ جائے جو والدین کے ذریعہ سے اس سے قرابت رکھتے ہوں تو ان میں سے کوئی اس کا وارث نہ ہوگا۔

چونکہ شرع محمدیؐ میں نقص اعضا یا عیب جسمانی کا موانع الارث میں شمار نہیں کیا جاتا اس لئے اگر کوئی شخص مجنون یا فاترالعقل ہو تو میراث پانے سے محروم نہیں ہو سکتا[3]۔

علیٰ ہذا القیاس باپ کے حین حیات یا بعد وفات بیٹی اپنی بدعصمتی سے خواہ وہ اپنے عقد سے پہلے یا اُس کے بعد بدعصمت ہوی ہو باپ کی میراث سے محروم نہیں ہو سکتی[4] اور نہ زوجہ اپنے شوہر کی زندگی میں بدعصمت ہونے کی وجہ سے اُس کے مرنے کے بعد اُس کی جائداد میں محجوب لاارث ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس قاعدہ کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی ہے کہ عورت کی عقد نکاح کی حیثیت اُس کی مدت العمر باقی رہتی ہے۔

بعض خاندانوں اور فرقوں میں رواج کی بنا پر عورتیں میراث پانے سے محروم رکھی جاتی ہیں[5]۔

---

[1] بفاطون بنام ولائتی خانم ۱۹۰۳ء کلکتہ جلد ۳۰ صفحہ ۶۸۳۔ اس مقدمہ میں ایک مسلمان عورت نے مرنے کے بعد ورثا میں ایک شوہر اور اپنی بہن کا ایک ولدالزنا لڑکا چھوڑا۔ نصف جائداد پانے کا شوہر مستحق قرار دیا گیا اور باقی نصف جائداد متوفیہ کے بھانجے کو طبقہ سوم کا قرابت دار بعید تصور کر کے دلائی گئی۔

[2] صاحبزادی بیگم بنام ہمت بہادر ۱۸۶۹ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۲ صفحہ ۵۱۲ جس کی نگرانی ۱۸۷۰ء میں ہو کر اُس کی رپورٹ جلد ۱۴ صفحہ ۱۲۵ پر شایع ہوی ہے۔

[3] مہر علی بنام امانی ۱۸۶۹ بنگال لا رپورٹ اپیل کیسیز صفحہ ۳۰۶ = ویکلی رپورٹر جلد ۱۱ صفحہ ۲۶۲۔

[4] نارونارین رائے بنام نول چند سیوجی ۱۸۶۶ء ویکلی رپورٹر جلد ۶ صفحہ ۳۰۳۔

[5] دیکھو محمد کامل بنام امتیاز فاطمہ ۱۹۰۸ء الہ آباد جلد ۳۱ صفحہ ۵۵۷۔

حصہ دوم

قانون متعلق حیثیت

باب اوّل

حیثیت ولد الحلال

فصل پہلی۔ مشاہدات عام

جس طرح اکثر مہذب نظامات قانونی میں قیاس کیا جاتا ہے کہ "اولاد والدین کی ہم بستری کی تابع ہے" اسی طرح شریعت اسلام میں

قیاس متعلق صحت نسب

جب ماں باپ کے ازدواج جائز کے بعد اولاد پیدا ہو تو ایسی اولاد کی ولدیت اس کی ماں کے شوہر میں قائم ہوتی ہے بغیر اس کے کہ باپ اپنی ولدیت کو تصدیق (تسلیم کرے) اور ایسی اولاد اپنے باپ کی حیثیت کی تابع سمجھی جاتی ہے کل مذاہب اسلام میں اقل مدت حمل چھ مہینے ہے۔ لیکن سب سے طویل مدت کے متعلق ان کل فرقوں میں سخت اختلاف ہے۔ سنی فقہا کے نزدیک

اقل مدت حمل

حمل کی سب سے بڑی مدت دو سال ہے۔ لیکن مذہب شیعہ میں حمل کا زیادہ سے زیادہ زمانہ دس مہینے اور خاص خاص حالتوں میں بارہ مہینے ہو سکتا ہے۔

الجیریا کے ملک میں سنی علما نے حمل کی سب سے بڑی مدت دس مہینے قرار دی ہے اور یہی مدت زمانۂ حال کا قاعدہ بن گئی ہے۔

اہل سنت کے فرقوں میں بچہ کے ولد الحلال ہونے کی نسبت

اس قدر ظن غالب ہے کہ والدین کی تاریخ نکاح سے چھ مہینے کے بعد اگر کوئی لڑکا پیدا ہو یا اپنی ماں کی طلاق یا اپنے باپ کی وفات کے دو سال کے اندر پیدا ہو تو محض اس کے باپ کا اس کی ولدیت سے انکار کرنا اس کی حیثیت ولد الحلال کو زائل و سلب نہیں کر سکتا ہے[1]۔

شوہر کا حق انکار

لہٰذا جو لڑکا مدت مذکورہ میں پیدا ہوا ہو اُس کی ولدیت تسلیم کر لی جائے گی بلا لحاظ اس کے کہ اُس کا باپ اُس کی ولدیت کا اقرار صریح کرے لیکن باپ ایسی اولاد کی ولدیت سے انکار کر سکتا ہے جو اس کی زوجہ کے بعد نکاح اندرون مدت شرعی پیدا ہو۔

لیکن انکار ولدیت کا حق بعض حالات میں جن کا لحاظ حاکم شرع کو ہمیشہ رکھنا چاہیئے زائل ہو جاتا ہے مثلاً اگر باپ زچگی کے رسوم میں شریک ہوا ہے جو مسلمان گھرانوں میں برتے جاتے ہیں یا اُس نے کوئی ایسا فعل کیا ہے جس سے لوگوں کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص اُس لڑکے کو اپنی اولاد حلال سمجھتا ہے یا اس نے لوگوں کی مبارک باد قبول کر لی ہے تو اس صورت میں اس کا ولدیت سے انکار کرنے کا حق زائل ہو جائے گا۔

کارروائی قانونی

ولدیت سے انکار کرنے کی صورت میں زوجہ شوہر کو قاضی کے روبرو و باقاعدہ طور پر الزام بے عصمتی کے ثابت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ شرع محمدیؐ میں اس کارروائی کو لعان کہتے ہیں[2]۔

قانون انگلستان اور شرع محمدیؐ میں صحت نسب کا قیاس

قانون انگلستان کی رو سے ایسی اولاد جو اپنے والدین کے زمانۂ ازدواج میں پیدا ہوئی ہو گو حمل نکاح اصلی کے قبل قرار پائے صحیح النسب ہے۔ اس کے برعکس شرع محمدیؐ میں اولاد کے حلال ہونے کے لئے حمل کا بعد از نکاح قرار پانا ضرور ہے۔ اس باب میں شیعوں کا قانون توسنیوں کی شرع سے بھی

---

[1] دیکھو ضمیمہ متعلقہ۔
[2] دیکھو صفحہ ۷۰ مابعد

زیادہ سخت ہے یعنے ولدالحلال ہونے کے لئے طفل کا مناکحت واقع ہوکر اُس کی تکمیل کے چھ مہینے کے بعد پیدا ہونا لازمی ہے یعنے والدین کی مباشرتِ جائز کے کم سے کم چھ مہینے کے بعد اولاد پیدا ہونی چاہئے۔

اگرچہ قانون انگلستان کے اس قاعدہ پر قانون شہادت ہند کی دفعہ ۱۱۲ مبنی ہے لیکن اس دفعہ کی اصل عبارت یا اُس کی کسی تاویل کے ذریعہ سے قانون محمدی کے اِن قواعد میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

اگر نکاح اور خلوت صحیحہ واقع ہونے کے بعد کسی عورت کو طلاق دی جائے اور طلاق کے بعد اس کے لڑکا پیدا ہووے تو جو اولاد وقت طلاق سے دو سال کے اندر پیدا ہوگی وہ مطلقہ کے شوہر طلاق دہندہ کی متصور ہوگی۔

اشرف الدولہ احمد حسین خاں بنام حیدر حسین خاں

پریوی کونسل کی جوڈیشیل کمیٹی نے اشرف الدولہ احمد حسین خاں بنام حیدر حسین خاں کے مقدمہ[1] میں نہایت صراحت سے یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ شرع محمدی میں "ولدالحلال ہونے کا قیاس زوجیت کے بعد ہوتا ہے اور زوجیت سے پہلے نہیں ہوتا"

شرع محمدی میں اولاد حلال کی نسبت قیاس اس قدر قوی ہے کہ فتاوائے عالمگیری میں یہاں تک لکھا ہے کہ "صرف ایسی مباشرت کی اولاد جس میں مرد کو عورت پر زوجیت یا ملکیت کا حق ہو ولدالزنا ہو سکتی ہے" جو اولاد کنیز کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اس کی قانون محمدی میں قدیم زمانہ کے دوسرے نظامات قانونی سے زیادہ رعایت کی جاتی ہے اور اس باب میں شرع محمدی کے قواعد زیادہ انسانیت پر مبنی ہیں چنانچہ شمالی امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں تنسیخ غلامی کے پہلے اگر کسی شخص کو اُس کی کنیز کے بطن سے لڑکا پیدا ہوتا تو اس کی حیثیت باپ کی نہیں بلکہ ماں کی قرار پاتی تھی اور وہ اپنے باپ کی جائداد یا مال متصور ہو کر فروخت کیا جاتا تھا۔

---

[1] سنہ ۱۸۶۶ء مورز انڈین اپیلز جلد ۱۱ صفحہ ۹۴ و ۱۱۳۔

ولد الحلال کا قیاس کیونکر پیدا ہوتا ہے

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق صحت نسب اولاد کے حلالی ہونے کے لئے نکاح کا خواہ صحیح ہو کہ فاسد واقع ہونا لازمی ہے۔ مباشرت صحیحہ اور غیر صحیحہ کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا مثلاً اگر کوئی شخص محرمات شرعیہ میں سے کسی عورت سے محض غلطی سے یا سہواً نکاح کرے تو ایسا نکاح فی نفسہ باطل ہوگا مگر جو اولاد اُس سے پیدا ہوگی وہ حلال ہوگی۔ مگر ابو یوسف اور محمدؒ کو قول بالا سے اختلاف ہے اور ان دونوں کی رائے کو جو اس کتاب میں بیان کی جاتی ہے حنفیہ مانتے ہیں۔ لہذا حنفیہ صحت نسب کے حسب ذیل اسباب قرار دیتے ہیں۔ (۱) عقد جائز (۲) نکاح غیر صحیح (۳) کنیز سے تعلق پیدا کرنا۔ گواہوں کے بغیر نکاح کا ہونا۔ سالی کے ساتھ نکاح کرنا فاسد اور ناجائز نکاح کی مثالیں ہیں۔

فرق مابین نکاح فاسد و نکاح باطل

نکاح باطل اور نکاح فاسد میں بہت بڑا فرق ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص حرام ناتوں میں کی کسی عورت سے نکاح کرے تو ایسا نکاح باطل سمجھا جائے گا یعنے عاقدین کے درمیان نکاح ہی واقع نہیں ہوا۔ حنفی قانون میں ایسے نکاح کی اولاد حلالی نہ ہوگی خواہ نکاح کرنے میں فریقین بالکل اپنی قرابت محرمہ سے ناواقف ہی کیوں نہ رہے ہوں بشرطیکہ ناکحہ نے ناکح کو فریب دیا ہو۔

لیکن نکاح فاسد کی دوسری کیفیت ہے۔ اس نکاح میں تناکحین کو جو شرعی رکاوٹ پیش آتی ہے وہ مستقل نہیں ہے نہ اُن کا عدم جواز نکاح دائمی ہے اور نہ ایسی ناقابلیت ہمیشہ کے لئے اُن میں باقی رہتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں ممانعت شرعی کے زائل ہونے کا قرینہ پایا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص دو بہنوں سے عقد کرے تو اُس کا دوسرا نکاح فاسد ہے کیونکہ اُس کی پہلی زوجہ کی موت یا طلاق سے وہ جائز ہو جاتا ہے۔

فتاوائے عالمگیری میں لکھا ہے کہ نکاح فاسد بعض وجوہ سے نکاح صحیح سے مشابہت رکھتا ہے اور منجملہ اُن وجوہ کے ایک یہ ہے کہ

دونوں سے ولدیت ثابت ہوتی ہے۔

مقدمۂ مندرجۂ عنوان میں نہایت ادب سے لکھا جاتا ہے کہ

عزیز النسا خانم بنام کریم النسا خاتون[۱]

فاضل ججوں (ارکان عدالت العالیہ) کو قانون محمدیؐ کے متعلق غلط فہمی ہوئی جس کی بنا پر عدالت موصوفہ نے تجویز کی کہ جو شخص دو بہنوں سے عقد کرے اُس کے نکاح ثانی کی اولاد غیر صحیح النسب سمجھی جائے گی۔ میرے خیال میں اس قسم کے فیصلہ کا سبب جو صریحاً شرع محمدیؐ کے خلاف ہے ارکان موصوف کا دو متضاد مسائل کو غلط ملط کرنا ہے یعنے زوجۂ ثانیہ کے حق مہر کو اُس کی اولاد کی حیثیت یعنے حلالی و حرامی ہونے سے مخلوط کیا گیا ہے۔ بیشک زوجۂ ثانیہ مہر پانے کی مستحق نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس کی اولاد صحیح النسب ہے اگر کوئی مرد نیک نیتی سے کسی عورت کو بیوہ یا مطلقہ سمجھ کر اس کے ساتھ نکاح کرے گو اس کا شوہر حقیقت میں زندہ ہو یا اس کو طلاق نہ دی ہو تو ایسا نکاح فاسد ہوگا اور اس کے وہی اثرات ہوں گے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنے مرد پر کوئی حد جاری نہ ہوگی بلکہ جو اولاد اس کو اس منکوحہ سے پیدا ہوگی صحیح النسب ہوگی۔ اور جب فریقین نکاح نیک نیتی سے باور کریں کہ منکوحہ کا شوہر سابق مر گیا ہے یا اس نے طلاق دے دی ہے تو ایسے نکاح کی اولاد کا باپ شوہر ثانی سمجھا جائے گا۔

نکاح فاسد کی اولاد کا حق توریث

اگرچہ نکاح فاسد کی اولاد صحیح النسب سمجھی جاتی ہے اور وہ باپ کی میراث پانے کی مستحق ہے لیکن اُن کی ماں کو اس قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔ نکاح فاسد کا دوسرا اثر یہ ہے کہ تکمیل نکاح (یعنے زفاف) کے پہلے اگر قاضی نکاح کو فسخ کرا دے تو منکوحہ مہر پانے کی مستحق نہیں ہو سکتی مگر بعد تکمیل منکوحہ اپنا مہر مثل یا معینہ مہر جو ان دونوں میں کم ہو پانے کی مستحق ہے۔

---

[۱] ۱۸۹۵ء کلکتہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۳۰۔

عقد فاسد میں طلاق دینے کی ضرورت نہیں لیکن اگر زفاف واقع ہو جائے تو شوہر اپنے حق زوجیت سے طلاق دینے کے بغیر دست بردار ہو سکتا ہے اور زوجہ عدۃ میں بیٹھنے کی پابند نہیں ہے۔

صحت نسب کے متعلق شیعوں کا قانون

شیعوں کی شرع میں نسب نکاح صحیح اور نکاح فاسد (مشکوک) دونوں سے قائم ہو جاتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص نیک نیتی سے نکاح کرے اور وہ نکاح ناجائز ثابت ہو تو ایسے نکاح کی اولاد شرعاً صحیح النسب سمجھی جائے گی علیٰ ہذا القیاس ایسے تعلق کی اولاد جو ابتدا سے باطل اور ناجائز ہو حلالی متصور ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص ایسی عورت سے عقد کرے جو شرعاً اس پر حرام ہو یا جس سے نکاح کرنا حرام ہو خواہ اس وجہ سے کہ وہ عورت اس مرد کے اقربائے نسبی یا محرمات شرعیہ میں داخل ہو خواہ اور کسی اتفاقی سبب سے جیسا کہ رضاعت یا قرابت زوجیت ہے یا کسی اور سبب سے تو ایسے نکاح سے جو اولاد ہو گی وہ صحیح النسب ہو گی بشرطیکہ نکاح سہواً ہو گیا ہو اور متناکحین اُس حرمت شرعیہ سے واقف نہ ہوں اگر کوئی شخص محض سہواً ایسی عورت سے نکاح کرے جو اُس کے محرمات شرعیہ میں داخل ہو یعنے اقربائے نسبی سے ہو تو ایسا نکاح فی نفسہ ناجائز ہو گا لیکن اُس کی اولاد حرامی نہیں بلکہ صحیح النسب ہو گی۔

سنیوں کا قانون دربارۂ ولد الحرام

اہل سنت کے نزدیک ولد الحرام کا نسب اُس کی ماں اور اقربائے مادری میں قائم ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ اپنی ماں اور اُس کے اعزا کا ورثہ پا سکتا ہے اور ماں اور اُس کے عزیز واقارب ایسے ولد الحرام سے وارث ہو سکتے ہیں۔

شیعوں کا قانون دربارۂ ولد الحرام

شیعوں کے مذہب میں ولد الزنا کا نسب والدین میں سے کسی ایک میں بھی قائم نہیں ہوتا بلکہ ماں باپ کے بغیر ایسی اولاد کا پیدا ہونا متصور ہوتا ہے یعنے وہ کسی کی اولاد ہی نہیں۔ لہٰذا نہ تو باپ جو ایسی ناجائز اولاد کے پیدا کرنے کا باعث

ہوا اور نہ ماں جس نے ناجائز تعلق سے ایسی اولاد کو جنا اور نہ ان دونوں کے دوسرے اقربا و اعزا ایسی اولاد کے وارث ہو سکتے ہیں اور نہ یہ اولاد اپنے والدین اور اُن کے قرابت داروں کی توریث پا سکتی ہے[1]۔

قطع نسب بذریعۂ کارروائی عدالت

جب کوئی لڑکا عدالتی کارروائی کے ذریعہ سے ولد الحرام قرار پاتا ہے تو وہ صرف اپنی ماں اور اقربائے مادری کا وارث ہو سکتا ہے اس طرح یہ دونوں اس کی توریث پا سکتے ہیں۔ یہ کارروائی لعان کہلاتی ہے اور اس میں فریقین (یعنے والدین) حلف اٹھاتے ہیں۔ جس لڑکے کی نسبت لعان کیا جائے وہ ولد الملاعنہ کہلاتا ہے۔ ولد الملاعنہ کا نسب باپ سے منقطع لیکن ماں اور اقربائے مادری سے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے باقی رہتا ہے۔ سنی اور شیعہ دونوں میں ایسی اولاد کی حیثیت یعنے مادری نسب متفق علیہ ہے۔

جب مرد اور عورت کا نکاح ہو گیا ہو اور نکاح مشہور ہو جائے اور اس کا ثبوت بخوبی ہو سکتا ہو تو اولاد کے نسب میں جو نزاع پیدا ہو وہ صرف اس قدر باقی رہجاتی ہے کہ آیا یہ اولاد بحالت زوجیت شرعیہ پیدا ہوئی تھی اور اسی حالت میں اس کا حمل رہا تھا یا نہیں مگر بعض صورتوں میں نکاح باسانی نہیں ثابت ہو سکتا مثلاً اگر نکاح کسی دور دراز کے ملک میں ہوا ہو یا ایسے حالات میں ہوا ہو کہ واقعی نکاح کے متعلق شہادت تحریری و شہادت لسانی نہ بہم پہنچ سکے لہذا جب اس قسم کے اشکال پیش آئیں تو فریقین کا مستقل طور سے مل کر رہنا اور ان کے زناشوئی کے تعلقات اور شہرت سے نکاح کا شرعاً صحیح ہونا فرض کر لیا جائے گا بشرطیکہ ایسے فرض کا کوئی قوی امر مانع نہ ہو اور زن و شوہر میں جو تعلق ہے وہ سرسری اور چند روزہ نہ ہو بلکہ مستقل اور دائمی ہونا چاہیئے جس سے قیاس ہو سکے کہ ان کا عقد بپابندی احکام شرع ہوا تھا[2] مثلاً

---

[1] دیکھو ماقبل صفحہ ۶۲

[2] باقر حسین خاں بنام شرف النسا بیگم ۱۸۶۰ء مورز انڈین اپیلز جلد ۸ صفحہ ۱۳۶۔

دائمی یکجائی۔ استمرار مباشرت اگر کوئی عورت کسی مرد سے نکاح کرے اور اُس نے طلاق نہ دی ہو پھر وہ عورت دوسرے شخص سے تعلق کر لے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرے تو ایسی دائمی یکجائی سے نکاح کا گمان نہ کیا جائے گا کیونکہ ان دونوں کے نکاح کا مانع شرعی موجود ہے۔

فصل دوسری

تبنیت بذریعۂ اقرار

شرع محمدی میں کسی قسم کی تبنیت جبکہ متبنّیٰ کا پدر حقیقی کوئی دوسرا شخص نہ کہ متبنّی ہو جائز نہیں ہے[1]۔

اقرار شرع محمدی میں صرف ایک قسم کی تبنیت جائز رکھی گئی ہے یعنے ایسی تبنیت جو باپ کے اقرار سے پیدا ہو۔ سنیوں کے قانون میں صرف باپ کو ولدیت قائم کرنے کا حق حاصل ہے ماں اور دیگر عزیز و اقارب (بالکل اس سے خارج ہیں) کسی غیر شخص کی نسبت ایسا اقرار کر کے ولدیت نہیں قائم کر سکتے۔

کلکتہ ہائی کورٹ نے مسئلۂ اقرار کو مسلم خاندانوں کے قانون کا جزو لاینفک قرار دیا ہے اور جن صورتوں میں کہ اس کا نفاذ ہونا چاہیئے ان کا شرع محمدی سے نہ کہ قانون شہادت ہند سے تعین کیا جانا لازم ہے[2]۔ ایسا اقرار صریح ہوتا ہے یا ضمنی۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے

---

[1] دیکھو محمد اللہ داد بنام محمد اسمعیل ۱۸۸۸ء الہ آباد جلد ۱۰ صفحہ ۲۸۹ و صفحہ ۳۴۰۔
[2] فضیلت النسا بنام قمر النسا ۱۹۰۴ء کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۹ صفحہ ۳۵۲۔

متعلق صریح الفاظ میں ولدیت کا اقرار کر سکتا ہے یا باپ کے کردار اور سلوک قدیمی سے جو وہ اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس کو اپنی اولاد جانتا ہے[1] لیکن اقرار ولدیت شرعاً جائز اور موثر اس وقت ہوتا ہے جبکہ تین شرطوں کی تکمیل ہو۔

(۱) مقر اور مقرلہ دونوں کی عمریں ایسی ہوں کہ لوگ عقلاً ایک کو باپ اور دوسرے کو فرزند مان سکیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے اور دوسرے میں باپ بیٹے کا رشتہ نہیں قائم کر سکتا جب تک پہلا جو باپ بننا چاہتا ہے دوسرے سے جس کو بیٹا بنانا چاہتا ہے ساڑھے بارہ سال عمر میں بڑا ہو۔

(۲) مقرلہ یعنے وہ شخص جس کی ولدیت کا اقرار کیا جاتا ہے مجہول النسب ہونا چاہیئے یعنے اس کے باپ کا حال نہ معلوم ہو اگر اس کی ولدیت یا نسب معلوم ہو تو مقر کی طرف اُس کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

(۳) مقرلہ کو اس امر کا یقین ہونا چاہیئے کہ وہ مقر کی اولاد ہے یا کم سے کم وہ اقرار ولدیت سے رضامند ہے۔

لیکن ایسا کم سن لڑکا جو اس قرابت کی ماہیت کو نہ سمجھ سکتا ہو یا اپنی ولدیت کا اصلی حال بیان کرنے کا تمیز نہ رکھتا ہو تو اس کو اقرار کے منظور کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کی رضامندی جواز اقرار کے لئے شرط مقدم جیسا کہ کسی باشعور اور مسن شخص کی حالت میں سمجھی جاتی ہے متصور ہوگی۔

---

[1] خواجہ ہدایت اللہ بنام رائے جان خانم سنہ ۱۸۴۴ء مور صاحب مرافعات ہند جلد ۳ صفحہ ۲۹۵۔ احمد حسین خاں بنام حیدر حسین خاں سنہ ۱۸۶۶ء مور صاحب مرافعات ہند جلد ۱۱ صفحہ ۹۴۔ محمد عظمت علی خاں بنام لاڈلی بیگم سنہ ۱۸۸۱ء کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۴۲۲ صداقت حسین بنام محمد یوسف سنہ ۱۸۹۳ء کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۶۶۳۔ عبدالرزاق بنام آغا محمد جعفر دبندنیم سنہ ۱۸۹۳ء کلکتہ جلد ۲۱ صفحہ ۶۶۶ مرافعات ہند جلد ۲۱ صفحہ ۵۶۔ مسیت النسا بنام پٹھانی سنہ ۱۹۰۴ء الہ آباد جلد ۲۶ صفحہ ۲۹۵۔

(۴) اقرار صرف ایسی حالت میں جائز و صحیح ہوسکتا ہے جبکہ مقر شرعاً معاہدہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہو یعنے ذی شعور عاقل اور آزاد اور فاعل مختار ہو۔ اگر کوئی نابالغ (جو شخص ازروئے شرع محمدی سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو) یا ایسا شخص جس کو تخویف دلائی گئی ہو یا جس کا دماغ صحیح نہ ہو یعنے فاتر العقل ہو معاہدہ کرے تو وہ ناجائز ہے۔

اقرار کے نتائج قانونی

اقرار ولدیت کے وہی تمام اثرات قانونی ہوتے ہیں جو قدرتی ولدیت کے نتائج ہیں اور جس اولاد کی نسبت اقرار کیا جاتا ہے اس کو مقر کی جائداد میں حق توریث پیدا ہوتا ہے۔

ایک شخص کا دوسرے کو اپنی صحیح النسب اولاد بنانے کے لئے اقرار کرنے سے نہ صرف ایسی اولاد کا نسب قائم ہوتا ہے بلکہ اس کی ماں اس کے باپ کے ورثہ میں حصہ پانے کی مستحق ہوتی ہے کیونکہ اولاد کی صحت نسب کے اقرار سے والدین کا تعلق یعنے زوجیت شرعاً جائز متصور ہوتا ہے مثلاً الف اور ب زن و شوہر کی حیثیت سے ایک جا رہتے ہیں اور اُن کے ہاں کچھ اولاد بھی ہوئی ہے اگرچہ ان دونوں کے درمیان عقد ہونے کا کوئی ثبوت نہ ہو لیکن جائز عقد نکاح کے لئے ایسی حالت میں شرعاً کوئی خاص دشواری نہیں جو فوائد کہ نکاح سے حاصل ہوسکتے ہیں وہ الف کے ب کی اولاد کی نسبت اقرار ولدیت کرنے سے بہم پہنچتے ہیں مثلاً الف صریح لفظوں میں یا اپنے کردار سے ب کی اولاد کے متعلق اقرار کرتا ہے کہ "میری صحیح النسب اولاد ہے اس اقرار سے نہ صرف یہ اولاد حلالی قرار پاتی ہے بلکہ اس اولاد کو اور زوجہ ب کو الف کی جائداد میں حق توریث پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ اس شکل میں مرد اولاد کو بہ الفاظ صریح اپنی اولاد حلال بیان کرے بلکہ وہ اپنے رویہ اور کردار سے اولاد کا نسب قائم کرسکتا ہے چنانچہ ان صورتوں میں صحت نسب کا قیاس شرعاً اس قدر قوی ہے کہ اگر کوئی مرد یہ کہدے کہ "یہ میری اولاد ہے"

یہ نہ کہے کہ "اسے میں نے زنا سے پیدا کیا ہے" تو قانوناً ایسی اولاد حلال قیاس کی جائے گی۔[1]

قیاس نسب کے پیدا ہونے کے لئے تعلق زناشوئی کا مستقل ہونا لازم ہے

چونکہ اقرار صحت نسب ماں باپ کے سابق تعلق جائز کی بنا پر کیا جاتا ہے اس لئے اگر نکاح کا ادعا کیا جائے اور نکاح ثابت نہ ہو تو معنوی اقرار کا اثر جو محض باپ کے کردار سے مستنبط ہو سکتا ہے کم ہو جاتا ہے کیونکہ اقرار ولدیت اُسی وقت موثر ہو سکتا ہے جبکہ مقر خواہ بلا واسطہ ہو کہ بالواسطہ اولاد کو اپنی اولاد حلال بیان کرے۔[2]

اقرار کے ذریعہ سے اولاد کو صحیح النسب بنانے کا قاعدہ جو شرع میں رائج ہے اس کی بنا مفروضہ حلال زادگی پر رکھی گئی ہے یعنے اس قاعدہ کی رو سے اولاد کا حلالی ہونا فرض کر لیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ ایسی اولاد کے ماں باپ میں کوئی ناجائز تعلق نہیں تھا۔[3] جوڈیشل کمیٹی نے بمقدمۂ اشرف الدولہ احمد حسین بنام حیدر حسین ذیل کے الفاظ میں اس قاعدہ کو بیان کیا ہے "شرع محمدی کی رو سے جو اقرار ولدیت کیا جاتا ہے اس سے نہ صرف کسی شخص کی تبنیت مراد ہے بلکہ اُس سے اس شخص کی صحت نسب بھی قائم ہوتی ہے" اس لئے اگر کسی لڑکے کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ ولد الزنا یا ماں باپ کے چندروزہ یا حرام تعلق کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کے باپ کے اقرار نسب کرنے سے وہ حلال زادہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ماہ طلعت بی بی بنام شہزادہ حلیم الزمان سنہ ۱۸۸۱ء کلکتہ لا رپورٹ جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۳ ۔

[2] اس کے ساتھ نظائر ذیل کا مقابلہ کرو دھن بی بی بنام لالن بی بی سنہ ۱۹۰۰ء کلکتہ جلد ۲۸ صفحہ ۱۸۰۱ ۔ فضیلت النسا بنام قمر النسا سنہ ۱۹۰۴ء کلکتہ ویکلی نوٹس صفحہ ۳۵۲ جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہمیت النسا بنام پٹھانی سنہ ۱۹۰۴ء الہ آباد جلد ۲۶ صفحہ ۲۹۵ ۔ اس کے علاوہ دیکھو عمدی بی بنام سید شاہ جناب علی سنہ ۱۸۶۶ء ویکلی رپورٹر جلد ۵ صفحہ ۱۳۲ ۔

[3] محمد اللہ داد بنام محمد اسمٰعیل سابق میں حوالہ دیا گیا ہے ۔

جب باپ ایک مرتبہ کسی لڑکے کے نسب کا اقرار کرلے تو پھر اس سے انکار نہیں کرسکتا[1] کیونکہ جب باپ کے اقرار سے ضروریات قانونی کی تکمیل ہوکر اولاد کی صحت نسب قائم ہو جاتی ہے تو پھر باپ نہ اپنے اقرار کو منسوخ کرسکتا ہے اور نہ اس کے ورثا مقرلہ کے نسب سے انکار کرسکتے ہیں۔

تخذ عورت کا اقرار سینوں کا قانون شیعوں کا قول

سینوں کی شرع میں کسی شوہر دار عورت کا کسی اولاد کی نسبت اقرار کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ ایسے اقرار سے دوسرے شخص پر یعنے اس کے شوہر پر اثر پڑتا ہے اور جب تک زوجہ کے اقرار کی شوہر کے بیان سے تصدیق نہ ہو وہ معتبر نہیں سمجھا جاتا۔

شیعوں کے نزدیک ایسی عورت جس کا شوہر مرجائے کسی اولاد کے واسطے اقرار کرسکتی ہے کہ وہ میرے اور میرے شوہر کے نکاح کے بعد پیدا ہوئی اور ولد الحلال ہے۔ لیکن اگر کوئی بیوہ کسی لڑکے کو اپنے شوہر متوفی کی اولاد ثابت کرنے کی غرض سے اس کی ولدیت کا اقرار کرے تو ایسے اقرار کا اثر صرف اس بیوہ کے اُس حصۂ متروکہ پر جو اس کو اس کے شوہر کے ورثہ میں حاصل ہوا پڑے گا۔

جس ولدیت کو تبنیت کہتے ہیں وہ شرع محمدی کی رو سے ناجائز سمجھی جاتی ہے۔ متبنّٰی کا خواہ وہ لڑکا ہو کہ لڑکی اپنے متبنّی والدین کی جائداد میں کوئی حق نہیں پیدا ہوتا[2]۔

ولدیت کے سوائے دوسری قسم کی قرابتوں کے بابت اقرار

اقرار سے ولدیت کے سوائے بعض قرابتیں بھی قائم ہو جاتی ہیں اور ایسی صورتوں میں اس اقرار میں جو مرد کرتا ہے اور اُس اقرار میں جو عورت کرتی ہے کچھ فرق نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے کی نسبت یہ اقرار کرسکتا ہے کہ

---

[1] اشرف الدولہ احمد حسین بنام حیدر حسین سابق میں حوالہ دیا گیا ہے۔
[2] محمد اللہ داد بنام محمد اسمٰعیل حوالہ سابق میں دیا گیا۔

یہ میرا باپ یا ماں یا شوہر یا زوجہ یا بھائی یا پھوپھی یا خالہ ہے لہذا اگر ایسے اقرار کو مقرلہ مقر کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد قبول یا تصدیق کرلے تو جہاں تک اُن دونوں کا تعلق ہے وہاں تک وہ اقرار قرابت کے متعلق صحیح سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب تک مقرلہ اس طرح کے اقرار کو صریحاً قبول نہیں کرتا اُس وقت تک مقر اور مقرلہٗ میں صحیح قرابت نہیں پیدا ہوتی اور اگر اس کا قبول کرنا نہ ثابت ہو تو وہ اقرار باطل ہے اور اس سے طرفین کا ایک دوسرے پر کوئی حق قائم نہیں ہوتا۔

ایسی صورتوں میں فریقین کی ولدیت اور نسب سے لوگوں کا ناواقف رہنا ضرور ہے، اپنے اور بیگانے اس بات کو نہ جانتے ہوں کہ مقر اور مقرلہٗ کس کی اولاد ہیں ورنہ فریقین کی قرابت نسبی بذریعۂ اقرار کے ماننے میں دنیا کو شبہہ پیدا ہوگا۔

اگر کسی مقر کا کوئی ایسا وارث ہو جس کو مقر جانتا ہو اور اس علم کے بعد وہ کسی دوسرے شخص سے بذریعۂ اقرار قرابت نسبی پیدا کرلے اور گو اس وارث کی نسبت اقرار ولدیت نہ کرے تو بھی پہلا شخص خواہ وہ مرد ہو کہ عورت اپنے قدرتی حق وراثت سے محروم نہیں ہوسکتا الا ورنہ مقرلہ کو کسی قسم کا حق توریث مقر کی جائداد میں پیدا ہوسکتا ہے۔

باب دوم

اختیار پدری (ولایت جبری)

نکاح کی بابت ولایت جبری

اسلام کے کل فرقے اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ باپ اپنی اولاد کی اُن کی

اولاد کے نکاح کی نسبت باپ کا اختیار

رضامندی کے بغیر جس کے ساتھ چاہے شادی کرسکتا ہے۔ لیکن باپ کا یہ اختیار بیٹوں کی صورت میں صرف اس وقت تک عمل میں آسکتا ہے جب تک کہ وہ حدِ بلوغ کو نہ پہنچیں اور بعد بلوغ وہ باپ کے قید اختیار سے جہاں تک ان کے حقوق شخصی کا تعلق ہے آزاد ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنی شادی خود کرلینے کا اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن، اولاد اناث کی بابت اسلام کے اکثر فرقوں میں سخت اختلاف ہے۔ ہند کے قانون بلوغ (ایکٹ ۹ ۱۸۷۵ء) کی رو سے قانون محمدی کے احکام نکاح، مہر اور طلاق میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے لہذا جو مسلمان مرد یا عورت اپنے کو نکاح کرنے کے قابل بنانا چاہے اور متناکحین کی حیثیت قائم کرنے کا خواستگار ہو تو اس کے بلوغ اور اختیار نکاح کی بابت قانون محمدی سے تصفیہ کیا جاتا ہے۔

قیاس بلوغ۔ بلوغ نکاح۔

اسلام کے اکثر فرقوں کے نزدیک پندرھویں سال لڑکا بالغ ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے۔ بہر حال کلیہ یہ ہے کہ جو شخص پندرہ سال کی عمر کو پہنچتا ہے بلا لحاظ صنف (تذکیر و تانیث) وہ عاقل رشید اور بااختیار اور معاملات شرعی کو انجام دینے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ کسی ایسے لڑکے یا لڑکی کی جانب سے جس کی عمر پندرہ سال کی ہوگئی ہو جب تک

حنفی اور شیعہ مسائل

فریقین کی صریح رضامندی نہ حاصل کی جائے اُن کا نکاح صحیح نہیں ہو سکتا۔ حنفیہ اور شیعہ دونوں میں ایسی اولاد ذکور و اناث جو بلوغ کو پہنچ گئی ہو اپنے ولی کی رضامندی کے بغیر عقد نکاح کرنے کی مجاز ہے۔

لیکن اس کے برعکس مالکی اور شافعی مذہب میں باپ کا یہ جبری اختیار اولاد اناث کی نسبت اس وقت تک باقی رہتا ہے

مالکیہ اور شافعیہ کا قول

جب تک کہ ان کی شادی ہو جائے اور وہ باپ کے اختیار سے نکل جائیں لیکن یہ امر کہ اسلام کے کسی ایک

فرقہ سے آدمی دوسرے فرقہ میں کسی رسم کے ادا کرنے سے یا ایک عقیدہ کو ترک کرکے دوسرے کے اختیار کرنے سے با آسانی شامل ہو سکتا ہے یعنے کچھ مذہبی رسوم کی بجا آوری اور تبدیل عقیدہ سے ہر ایک شخص تبدیل مذہب کر سکتا ہے اس لیئے جو سختی باپ کے حق الجبر سے لڑکیوں پر شافعی اور مالکی مذہب میں پیدا ہوتی ہے وہ تبدیل مذہب سے کم ہو جاتی ہے[1]۔

باپ کی نااہلیت یا عدم قابلیت

جب خلل دماغ وغیرہ کی وجہ سے کوئی باپ اپنی بیٹی کی شادی کر دینے کے حق پر عمل نہ کر سکتا ہو تو جو شخص باپ کے بعد اس لڑکی کا ولی ہو سکتا ہے وہ اس اختیار کو عمل میں لا سکتا ہے[2]۔ علیٰ ہذا القیاس اگر باپ اپنے سکونتی مقام میں غیر رہے یا کسی وجہ سے بیٹی کے عقد میں شریک نہ ہو سکے جس کی وجہ سے عقد کے ملتوی ہونے کا احتمال ہو تو لڑکی کا ایسا ولی جس کا درجہ باپ کے بعد قرار پاتا ہے اس نابالغہ کو عقد نکاح میں دے سکتا ہے[3]۔ اگر باپ مرتد ہو جائے تو دین اسلام میں، اس کی نابالغہ لڑکی کے نکاح کے واسطے اس کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے[4]۔

ایک مقدمہ میں جبکہ باپ ایک طویل سزائے قید بھگت رہا تھا عدالت سے تجویز ہوئی کہ ماں اور دادی قیدی کی لڑکی کا نکاح کرا دینے کی مستحق ہیں[5]۔

حق الجبر یا نابالغ اولاد کی کتخدائی کا اختیار سب سے پہلے ایسے

---

[1] مقابلہ کرو محمد ابراہیم بنام غلام احمد سنہ ۱۸۶۴ء نظائر بمبئی ہائی کورٹ جلد ۱ صفحہ ۲۳۶ -

[2] کلو شیخ بنام غریب اللہ سنہ ۱۸۶۸ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۰ صفحہ ۱۲ -

[3] ردالمحتار -

[4] بمعاملہ ماہن بی بی سنہ ۱۸۷۴ء بنگال لا رپورٹ مقدمات ابتدائی جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۰ -

[5] کلو بنام غریب اللہ جس کا پہلے حوالہ دیا گیا ہے -

غیر مناسب و ناشایستہ نکاح کی نسبت قاضی کا حکم امتناعی جاری کرنا!

اقربائے پدری کو جو باپ سے بہت ہی نزدیک کا رشتہ رکھتے ہیں حاصل ہوتا ہے۔ اگر اقربائے پدری موجود نہ ہوں تو ایسے اقربائے مادری جو شرعًا نابالغہ کے محرم ہو سکتے ہیں نابالغہ کو عقد نکاح میں دے سکتے ہیں مثلاً چچا کی موجودگی میں جس کی ولایت کو دیگر اقربا کی ولایت پر ترجیح ہے ماں اور قرابت داران مادری کو نابالغ کے نکاح کر دینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر چچا نے نامناسب طور پر نابالغ کا نکاح کر دیا ہو تو ایسی صورت میں نابالغ کی ماں یا دوسرے مادری اقربا قاضی یا جج سے اس امر کی استدعا کر سکتے ہیں کہ ولی کو نابالغ کی جانب سے معاہدۂ نکاح کرانے سے منع کیا جائے۔ ولی پر ہی کیا موقوف ہے بلکہ یہ لوگ باپ کے خلاف بھی اگر وہ نابالغ کا عقد غیر واجبی اور نامناسب طور پر کسی دوسرے کے ساتھ کرنا چاہتا ہو حکم امتناعی جاری کرا سکتے ہیں۔

حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد نابالغ کا معاہدۂ نکاح کو منسوخ کرنے کا اختیار

اگر کسی نابالغ کی جانب سے بجز باپ اور دادا کے کسی دوسرے شخص نے عقد نکاح کیا ہو تو نابالغ کو سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد اختیار کامل حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے عقد کو بحال رکھے یا منسوخ کر دے[1]۔

اگر نابالغ کے باپ یا دادا نے طمع دنیا کے خیال سے نابالغ کا نکاح کسی ایسے شخص سے کر دیا ہے جس سے نابالغ کو نقصان پہنچتا ہے یا باپ دادا نے اپنی بدکرداری کے سبب سے نابالغ کو نامناسب طور پر نکاح میں دیا ہے اور جس سے بظاہر نابالغ کا نقصان ہوتا ہے تو بالغ ہونے کے بعد اُس نکاح پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا اختیار شرعًا نابالغ کو حاصل ہے۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۷۷ ما بعد ۱۲۔

باب سوم

بچّوں کی حراست یعنے حق حضانت

فتاوائے عالمگیری میں لکھا ہے کہ "حالت زوجیت میں اور اس کے منقطع ہونے کے بعد اولاد نابالغ کی حراست کی سب سے بڑھ کر ماں مستحق ہے۔"

نابالغ کی ولایت ذات۔ ماں کا سب سے بڑھ کر اولاد نابالغ کے لئے ولیہ ذات ہونا

ماں کو بحیثیت مادر یہ حق حاصل ہے اور کسی وجہ سے بجز ماں کے ایسی بداعمالی و بدکرداری کی وجہ سے جس سے محضون کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یہ حق زائل نہیں ہوتا۔

اور خواہ ماں مسلمہ ہو کہ غیر مسلمہ حضانت کا حق اُسی کو ملتا ہے۔

حنفیوں کے نزدیک ماں اپنی بیٹیوں کو اپنی حراست میں رکھنے کی سن بلوغ تک مجاز ہے۔ لیکن مالکیہ و شافعیہ اور حنفیہ میں ماں کی حراست ان پر ان کی شادی تک باقی رہتی ہے۔

لڑکیوں کی ولایت ذات کا حق۔ اس کی بابت مسلمانوں کے فرقوں میں اختلاف

لیکن اولاد ذکور کے باب میں ماں کی حراست کے متعلق اہل سنت کے فرقوں میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہے۔ مالکیہ کا قول ہے کہ حق حضانت اولاد ذکور پر ماں کو ان کے بلوغ کے زمانہ تک باقی رہتا ہے۔

شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک سات برس کے سن میں لڑکے کو

لے بمعاملہ طیب علی ۱۸۶۴ع ہائیکورٹ جلد ۲ صفحہ ۶۳ -

اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ چاہے باپ کے پاس رہے چاہے ماں کے پاس۔

قول حنفیہ اولاد ذکور کی ولایت ذات کی نسبت ماں کا حق

فقہائے حنفی کے نزدیک اولاد ذکور کی نسبت ماں کا حق حضانت اس وقت تمام ہوتا ہے جب لڑکے کا سن سات برس کا ہو جائے اس لئے طفل نرینہ کی حراست میں جس کی عمر سات سال سے کم ہو ماں کو باپ پر ترجیح دی جاتی ہے اور لڑکا ماں کے پاس رکھا جاتا ہے۔ حضانت کی نسبت جب ماں اور چچا میں مقابلہ ہو تو بدرجۂ اولی ماں کو چچا پر ترجیح دی جائے گی۔[۲]

شیعوں کا قول

شیعہ مذہب میں ماں کا حق حضانت صرف بچہ کی شیر خوارگی کے زمانہ تک خواہ وہ لڑکا ہو کہ لڑکی قائم رہتا ہے۔ دودھ پینے کے زمانہ میں جس کی مدت دو سال ہے بچوں کو ان کی ماں سے اس کی رضامندی کے بغیر کوئی شخص علیحدہ نہیں کر سکتا۔

شیر خوارگی ختم ہونے پر پسر کی حضانت کا مستحق باپ ہے اور دختر کی حضانت کی ماں۔ جب تک لڑکی سات سال کی نہ ہو جائے اس پر ماں کی حضانت (بشرطیکہ باپ کی زوجیت باقی رہے) قائم رہتی ہے۔ جب لڑکی سات سال کی ہو جاتی ہے تو ماں کے مقابلہ میں حضانت کا مستحق باپ ہے۔[۳]

اشخاص مستحق ولایت (ذات) اقوال حنفیہ

حنفی مذہب میں ان اشخاص کی جو اولاد نابالغ کی حضانت کے مستحق ہیں حسب ذیل ترتیب ہے:۔

(۱) ماں، (۲) نانی خواہ درجہ میں وہ کتنی ہی اونچی ہو، (۳) دادی خواہ رشتہ میں کتنی ہی بعید ہو، (۴) سگی بہن،

---

[۱] لاڈلی بیگم بنام محمد امیر خاں ۱۸۸۶ء کلکتہ جلد ۱۴ صفحہ ۶۱۵۔

[۲] چچا کے مقابلہ میں دادی کے حق حضانت کو ترجیح دی جاتی ہے دیکھو بھوجا بنام الٰہی بخش ۱۸۸۵ء کلکتہ جلد ۱۱ صفحہ ۵۷۴۔

[۳] فتح علی شاہ بنام محمد مخدوم الدین ۱۸۶۴ء ویکلی رپورٹر صفحہ ۱۳۱۔

(۵) اخیافی بہن، (۶) سوتیلی بہن، (۷) سگی بھانجی (۸) سوتیلی بھانجی،
(۹) خالائیں، (۱۰) اخیافی خالائیں، (۱۱) سوتیلی بھانجی، (۱۲) بھتیجیاں،
(۱۳) پھوپھیاں[۱]۔

اگر اقربائے اناث سے کوئی موجود نہ ہو یا موجود ہو تو حق حضانت کو عمل میں لانے کا شرعاً مجاز نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ حق (۱) باپ کو (۲) دادا کو چاہے وہ رشتہ میں کتنا ہی بعید ہو (۳) حقیقی بھائی کو (۴) سوتیلے بھائی کو (۵) سگے بھتیجہ کو (۶) سوتیلے بھتیجہ کو (۷) سگے چچازاد بھائی وغیرہ کو اسی ترتیب سے ملتا ہے۔

ان اقربا میں بھی قریب ہمیشہ بعید کا حاجب ہوتا ہے اور جب عصبات میں سے کوئی شخص نابالغ کو اپنی حراست میں رکھنے کا اہل نہ ہو تو حق حضانت مادری قرابت داروں میں منتقل ہوتا ہے۔

کوئی مرد کسی لڑکی کی حراست کا حق نہیں رکھتا ہے جب تک کہ وہ اس کا محرم شرعی نہ ہو یعنے ان محارم شرعیہ میں سے نہ ہو جن کا نکاح اس لڑکی سے حرام مطلق ہے۔

اگرچہ حق حضانت کے عام اصول کی نسبت شیعہ اور سینوں میں اتفاق ہے لیکن شیعہ مذہب میں جب ماں نہ ہو تو یہ حق باپ کو پہنچتا ہے اور جب باپ بھی نہ ہو تو دادا دادی اور دوسرے آبا و اجداد نابالغ کی حراست کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر آبا و اجداد بھی نہ ہوں تو حق حضانت ان اقربا کو پہنچتا ہے جو لڑکی کے محارم شرعیہ میں داخل ہیں اور قریب بعید کا حاجب ہوتا ہے۔

اگرچہ نابالغ کی ولایت (ذات) کا حق اس کے عزیز و اقارب کو بہ ترتیب متذکرۂ صدر ملتا ہے لیکن جب ایسے دو اشخاص کے درمیان کسی نابالغ کی حضانت کے متعلق نزاع ہو جن میں کے ایک کو دوسرے پر

---

[۱] علیم الدین بنام سیفور بی بی ۱۹۲۶ء ویکلی رپورٹر نظائر متفرقات جلد ۶ صفحہ ۱۲۵۔

ترجیح ہے تو قاضی (جج) کو لازم ہے کہ نہ صرف دونوں دعوے داروں کی اہلیت اور اوصاف کی نسبت غور کرے بلکہ صغیر کے حقوق اور صلاح و فلاح کا بھی لحاظ رکھے[1]۔

قانون ولایت ہند یعنے ایکٹ ۸ سنہ ۱۸۹۰ء میں نابالغ کی ذات و جائداد کے ولی مقرر کرنے کے قواعد درج ہیں۔ اس قانون میں جو ہدایت کہ عدالتوں کو نابالغ کے ولی مقرر کرلے کے وقت نابالغ کی بھلائی اور سود و بہبود کے متعلق کی گئی ہے وہ بالکل شرع محمدی کے مطابق ہے۔

سقوط حق حضانت اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک ذیل کی صورتوں میں حاضنہ کا حق ساقط ہو جاتا ہے:-

(۱) حاضنہ کا بعد میں کسی ایسے شخص[2] سے نکاح کرلینا جو نابالغہ کا محرم شرعی نہ ہو۔

(۲) اس کی ایسی بدچلنی کی وجہ سے جس سے محضون کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۳) اس کے مقام سکونت بدل دینے سے جس کے سبب سے باپ لڑکے پر ضروری نگرانی نہ کرسکے۔

(۴) ارتداد (زندقہ)۔ ارتداد سے بھی حق حضانت زائل ہو جاتا ہے۔

اگر کسی نابالغہ دختر کی شادی ہو جائے تو ماں کو شوہر سے زیادہ نابالغہ کو اپنی حراست میں رکھنے کا حق حاصل ہے جب تک کہ وہ حد بلوغ کو نہ پہنچ جائے[3]۔

---

[1] ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۳۔ عیدو بنام امیرن کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔ دیکھو معاملۂ امیر النسا سنہ ۱۸۶۹ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۱ صفحہ ۲۹۷۔ عباسی بنام مسٹر ڈن (کلکٹر) سنہ ۱۸۷۸ء الہ آباد جلد ۱ صفحہ ۵۹۸ اس مقدمہ میں تجویز ہوئی ہے کہ کوئی فاحشہ کسی نابالغ کی ولیہ (ذات) نہیں مقرر ہو سکتی۔

[2] یعنے حاضن مذکر اور اس کا مونث حاضنہ ہے۔ حاضن وہ شخص ہے جس کو حق حضانت حاصل ہو۔ بیدھن بی بی بنام فضل اللہ سنہ ۱۸۷۳ء ویکلی رپورٹر جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔ فصیحاً بنام کاجو سنہ ۱۸۸۳ء کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۔

[3] بمعاملہ ماہن بی بی سنہ ۱۸۷۴ء بنگال لا رپورٹ مقدمات ابتدائی جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۰۔

کلکتہ ہائیکورٹ نے تجویز کی ہے کہ اگر کوئی شخص ماں کی ہدایت اور ترغیب کی بنا پر کسی نابالغہ زوجہ کو اس کے شوہر کی حراست سے لیجائے تو یہ فعل "ولایت جائز" سے کسی نابالغ کو لیجانے کی اس تعریف میں جو مجموعۂ تعزیرات ہند میں درج ہے داخل نہیں ہے اور نہ اس پر بھگا لے جانے کی تعریف صادق آسکتی ہے۔[۱]

اولاد حرام اور لقیط کی حراست

اولاد غیر حلال کی حراست صرف اس کی ماں اور مادری اقربا کو ملتی ہے لیکن لقیط کی حضانت اس شخص سے جس نے اسے پڑا پایا ہے یا حکومت سے متعلق ہے۔ لقیط سے مراد ایسی اولاد ہے جس کو اس کے ماں باپ نے کہیں ڈال دیا ہو۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ مقابلہ کرد بمعاملہ خدیجہ بی بی ۱۸۷۰ء بنگال لا رپورٹ مقدمات ابتدائی جلد ۵ صفحہ ۵۵۷۔ نور قادر بنام زلیخا بی بی ۱۸۸۵ء کلکتہ جلد ۱۱ صفحہ ۶۴۹۔

[۱] قربان بنام شہنشاہ قیصر ہند ۱۹۰۵ء کلکتہ جلد ۳۲ صفحہ ۴۴۴۔

باب چہارم

نکاح اور متناکحین کی حیثیت

فصل پہلی

قابلیت اور طرز و صورت نکاح

"نکاح کا تعلق نظم معاشرت سے ہے اور وہ ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے جس کا سوسائٹی کی حفاظت کے لیئے حکم دیا گیا ہے اور جس کی غرض بنی نوع انسان کو حرام کاری اور معصیت کی آلودگی سے بچانا ہے۔"

نکاح ایک قسم کا معاہدہ ہے

"اگر نکاح کو معاہدہ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کے ذریعہ سے ایک ایسی مستقل قرابت مرد عورت میں پائی جاتی ہے جو فریقین کی رضامندی پر مبنی ہے بشرطیکہ ایسے تعلق جائز کے لیئے شرعاً کوئی امر مانع نہ ہو۔"

بلحاظ ادارہ معاشرتی شرع محمدی میں بھی نکاح کی ایک مخصوص دیوانی معاہدہ کی حیثیت ہے جو ایجاب و قبول کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ شیعوں کے نزدیک اس کے جواز کے لئے نہ شہادت تحریری کی ضرورت ہے اور نہ گواہوں کی موجودگی لازم ہے۔

قابلیت فریقین نکاح

جواز نکاح کے لئے شرعاً قابلیت فریقین کی ضرورت ہے معاہدۂ نکاح کی قابلیت چند شرائط پر منحصر رکھی گئی ہے۔ اولاً فریقین کا

فعل نکاح کی ماہیت سے واقف ہونا لازم ہے کیونکہ اگر ان میں سے ایک بھی فاترالعقل ہو یا معاہدہ کی اصلیت کے سمجھنے کے قابل نہ ہو تو ایسا معاہدہ ناجائز ہو گا۔ ثانیاً فریقین کا بالغ و ذی شعور (بشرطیکہ ان کا عقد نکاح ان کے اولیا کی جانب سے نہ کیا جائے) ہونا ضرور ہے اور جبر یا تخویف کی شکل پیدا نہ ہونی چاہیئے۔ فتاوائے عالمگیری میں لکھا ہے کہ "منجملہ ان شرائط کے جو جواز نکاح کے لئے ضروری ہیں ایک شرط متناکحین کا عاقل و بالغ اور آزاد ہونا ہے۔ لیکن ان شرائط میں صرف فرق اس قدر ہے کہ پہلی شرط جس کا عقل و شعور سے تعلق ہے دوسری شرطوں پر مقدم ہے کیونکہ مجنون یا بے عقل لڑکا اپنا نکاح آپ نہیں کر سکتا اور دوسری دو شرطیں یعنے بلوغ شرعی اور آزادی محض نکاح کے نافذ کرنے کے لئے لازم ہے اس لئے کہ جو نابالغ مگر عاقل لڑکا نکاح کرتا ہے اُس کا نفاذ اس کے ولی کی رضامندی پر منحصر ہے۔

نکاح کے متعلق جو شرائط کہ لڑکے کے لئے لازم قرار دئے گئے ہیں وہی قیود لڑکی کے واسطے بھی قائم کئے گئے ہیں یعنے لڑکی کا بلوغ و رشد کو پہنچنا ضرور ہے۔

بلوغ اور رشد کے سوائے قابلیت ازدواج کی جو شرط قائم کی گئی ہے اس سے مراد متناکحین میں کسی قسم کی شرعی ناقابلیت کا نہ ہونا یا ان کے تعلق کے واسطے کسی امر شرعی کا مانع نہ ہونا ہے یعنے :-

(الف) متناکحین ایک دوسرے کے محارم شرعیہ میں سے نہ ہوں یا کم سے کم ان میں ایسی قرابت نہ ہو جس کے سبب سے ان کا نکاح شرعاً ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

(ب) نکاح کرنے والی عورت کسی دوسرے شخص کی زوجہ نہ ہو۔

(ج) اور نہ مرد کے یہاں پہلے سے چار منکوحہ موجود ہوں۔

شرط (ج) چنداں سخت نہیں ہے اگر زوجہ کی موت یا طلاق سے

حالت نکاح باقی نہ رہے تو شوہر کے لیئے کوئی امر مانع شرعی باقی نہیں رہتا مثلاً مرد اپنی زوجہ متوفیہ کی بہن سے عقد کرسکتا ہے اور اس طرح پھر چار زوجاؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

فصل دوسری

موانع شرعی یا اسباب تحریم نکاح

اسباب تحریم بربنائے قرابت

ناقابلیت ازدواج جو قرابت کے سبب سے پیدا ہوتی ہے اُس کی چار قسمیں ہیں اولاً حلت یا حرمت جو نسب یعنے قرابت شرکت خون سے پیدا ہوتی ہے ثانیاً مصاہرت یعنے قرابت بذریعہ تزویج ثالثاً رضاعت یعنے دودھ پلانے سے۔

اسباب تحریم جن کا نسب سے تعلق ہے اُن میں سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں۔ اشخاص ذیل سے نکاح کرنا حرام ہے۔

(الف) اجداد سے، (ب) اولاد سے (ج) دوسرے طبقہ کے رشتہ داروں سے جیسے بھائی بہنیں اور ان کی اولاد سے، (د) چچا اور ماموں، پھوپھی اور خالہ سے۔ حرام کی اولاد اور اس کی اولاد سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ اپنے باپ کی زوجہ (سوتیلی ماں) اور دوسرے اجداد کی بیبیوں سے بیٹے کی زوجہ (بہو) یا اس کی اولاد کی زوجہ سے نکاح کرنا حرام ہے[۱]۔

بعض رشتہ داروں کے لیئے مصاہرت اور رضاعت کا اسباب موانع نکاح میں شمار کیا جاتا ہے مثلاً داماد اپنی ساس سے اور زوجہ اپنے

---

[۱] دیکھو ضمیمہ۔

زوج کے فرزند سے ابداً اور بہنوئی اپنی سالی سے تا نکاح قیام زوجہ نکاح نہیں کرسکتے۔ اسی طرح مرد کا اپنی دودھ بہن سے اور دودھ ماں کا اپنے بیٹے سے نکاح کرنا حرام ہے[1]۔

حرام تعلق کے سبب سے مصاہرت کا پیدا ہونا۔

شادی کرنے کے سبب سے جو مصاہرت یعنے قرابت بذریعۂ تزویج پیدا ہو کر متناکحین کو بعض رشتہ داروں سے نکاح کرنے کی مانع ہوتی ہے ویسی ہی مصاہرت مرد و زن میں اُن کے تعلق حرام کے بعد پیدا ہو جاتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص نکاح کے بغیر کسی عورت سے تعلق پیدا کرے تو اس عورت کی ماں اور لڑکی اُس پر حرام ہو جاتی ہیں اور اس لئے وہ ان سے نکاح نہیں کرسکتا۔ علیٰ ہذا القیاس تعلق ناجائز کے بعد عورت بھی اپنے مرد کے بیٹے اور باپ سے شرعاً نکاح نہیں کرسکتی۔

عورت اپنے پہلے نکاح کے دوران میں جب تک کہ وہ قائم ہے دوسرا نکاح نہیں کرسکتی۔ فرقۂ معتزلہ کے سوائے جن کے عقیدہ میں ایک سے زیادہ بیبیاں رکھنا ناجائز ہے اسلام کے تمام دوسرے فرقوں میں مرد ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ نکاح نہیں کرسکتا اور چار منکوحہ رکھنے کی اجازت بھی مشروط بہ عدل ہے۔ اگر مرد چار عورتوں میں عدل نہیں کرسکتا ہے تو اُس کو ایک ہی منکوحہ پر اکتفا کرنا لازم ہے۔

اسلام کے ایسے کل فرقوں کے نزدیک جو کثرت ازدواج کے معتقد ہیں ایک ہی زمانہ میں دو ایسی عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے جو باہم ایسی قرابت رکھتی ہوں کہ اگر ان میں سے ایک مرد ہوتا تو ان دونوں میں مناکحت شرعاً حرام ہوتی۔ لیکن اگر فی الواقع کسی مرد اور عورت میں اس طرح کا نکاح ہو جائے تو وہ باطل قرار پائے گا یعنے اگرچہ قاضی

---

[1] دیکھو ضمیمہ۔

ایسے متناکحین میں مفارقت پیدا کر سکتا ہے لیکن جو اولاد اس تعلق سے پیدا ہو وہ صحیح النسب متصور ہوگی۔[1]

مسلم کا غیر مسلمہ سے نکاح کرنا

سنت جماعت کے فرقوں میں مسلمان مرد کا کسی دین الہامی کی عورت سے یعنے کتابیہ سے جیسے یہودی اور عیسائی ہیں نکاح کرنا شرعاً جائز ہے لیکن بت پرست اور آتش پرست عورت سے نکاح کرنا حرام ہے۔[2]

مسلمہ کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح کرنا۔ سنت جماعت کے اقوال

مسلمہ کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی ممانعت اسلام میں محض سیاسی وجوہ کی بنا پر کی گئی ہے چنانچہ اس غرض سے دیگر نظامات قانونی میں ایک ملت وقوم کی عورتوں کو دوسری ملت وقوم کے مردوں سے نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی ہے پس جس ممانعت کا ذکر اس مقام پر ہوا ہے اس کی مثال دوسرے نظامات قانونی میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس شکل میں بھی بعض علما[3]

---

[1] دیکھو صفحہ ۶۸ ماسبق جہاں میں نے عظیم النسا اور کریم النسا کے مقدمہ کے فیصلہ کی صحت کے متعلق تنقید کی ہے۔

[2] زردشتی مذہب کے متعلق اسلام کے دو بڑے فرقوں (سنت جماعت اور شیعوں) میں اختلاف ہے۔ بعض فقہائے اسلام خصوصاً شیعوں کے علما کے نزدیک یہ مذہب ایک قسم کا دین الہامی ہے اور سنی علما خصوصاً اہل مغرب اُس کو مجوس مذہب یعنے آتش پرستی جانتے ہیں۔

[3] محیط اور منتقہ۔ اس قول کے مطابق اگرچہ قاضی شوہر و زوجہ میں مفارقت پیدا کر دیتا ہے لیکن جو اولاد تنسیخ نکاح کے پہلے پیدا ہو وہ حلالی متصور ہوتی ہے۔

کے اقوال کے مطابق گو نکاح ناجائز ہے لیکن کالعدم نہیں ہو سکتا۔

اقوال مذہب شیعہ

مسلم اور کتابیہ کے نکاح کے متعلق شیعوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ اخباری شیعوں اور معتزلہ نے اس مسئلہ میں حنفیہ سے اتفاق کیا ہے۔ مگر اصولی شیعوں کے مذہب میں مسلم کا کتابیہ کے ساتھ نکاح دائمی جائز نہیں ہے گو ان کے نزدیک بھی یہودیہ اور نصرانیہ اور مجوسیہ سے متعہ یعنے نکاح عارضی کرنا جائز ہے۔

بعض اخباری شیعہ غیر مسلمہ کے ساتھ صرف متعہ کرنا جائز سمجھتے ہیں[1]۔ بہر حال شیعوں میں کتابیہ کے ساتھ نکاح دائمی جو ناجائز سمجھا گیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ اگر فی الواقع اس طرح کے فریقین آپس میں عقد کرلیں تو وہ خلاف شرع اور باطل ہے۔

فصل تیسری

طرز (یا صورت) نکاح

کتب فقہ میں نکاح کے متعلق بعض ایسے شرائط پائے جاتے ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض تکلفات ظاہری ہیں لیکن شرائط ضروری حسب ذیل ہیں۔ مثلاً یہ ضرور ہے کہ (الف) فریقین

---

[1] لیکن شیعوں کے کل فرقے مسلمہ کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح کرنے کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں دیکھو اور مقابلہ کرو بخشی کشور پرشاد بنام ٹھاکر پرشاد الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۳۷۵۔

نکاح ایک دوسرے کے کلام کو سنیں یعنے شرائط نکاح کو طرفین سمجھ جائیں۔ (ب) اگر متناکحین عاقل و بالغ ہوں تو نکاح کی بابت اپنی حقیقی رضامندی کا اظہار کریں اور (ج) شوہر اور زوجہ کی بخوبی تصریح ہونی چاہئے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرنے میں انھیں کسی قسم کا شبہ نہ ہونے پائے۔

گواہوں کی موجودگی

سنی قانون کی رو سے نکاح کے وقت گواہوں کا موجود رہنا ضرور ہے تاکہ گواہ عقد نکاح کے واقعہ کی تصدیق کر سکیں۔ کم سے کم دو گواہ اس امر کا اعتراف کریں کہ نکاح باقاعدہ طور پر ان کی حضوری میں اور شرائط مندرجۂ بالا کی پابندی کے ساتھ باندھا گیا ہے۔ اگر زوجہ غیر مسلمہ ہے تو اس کے ہم مذہب اشخاص گواہان نکاح بن سکتے ہیں۔ لیکن جو نکاح گواہوں کی حضوری کے بغیر باندھا جاتا ہے وہ باطل نہیں ہے۔

شیعوں کے مذہب میں "نکاح کے متعلق کسی امر میں گواہوں کی حضوری کی ضرورت نہیں ہے"۔ بلکہ اس مذہب میں متناکحین کے وقت واحد میں ایجاب و قبول کر لینے سے (اور بلا استقرار قاضی یا مجتہد) نکاح ہو جاتا ہے اگرچہ فریقین نے آپس میں اس طرح کا معاہدہ نکاح کسی دور و دراز کے ملک میں ہی کیوں نہ کیا ہو لیکن جب ایک مرتبہ اقرار ہو جائے تو پھر اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور وہ اقرار ہمیشہ کے لئے صحیح سمجھا جاتا ہے یعنے شیعوں کے نزدیک قاضی یا وکیل کے ذریعہ سے نکاح پڑھوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عاقدین ایک ہی وقت میں ایجاب و قبول کر کے آپس میں جائز و شرعی ازدواج قائم کر سکتے ہیں اور متناکحین اپنی رضامندی کا صریحاً یا معناً اظہار کر سکتے ہیں۔

سنی اور شیعہ دونوں فرقوں میں متناکحین بذریعۂ نیابت یا وکالت عقد پڑھوا سکتے ہیں۔ نائبین اور وکلا کے مقرر کرنے کے لئے گواہوں کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے اور جو اختیارات کہ شوہر و زوجہ کی جانب سے وکلا کو دیئے جاتے ہیں وہ انھی قواعد قانونی کے تابع ہیں جن کا اطلاق دوسرے

معاہدات پر کیا جاتا ہے۔

اگر بذریعۂ وکیل یا مراسلت عقد نکاح عمل میں لایا جائے تو سنّی قانون کی رو سے رسید پیام یا خط پر جس میں ایجاب مندرج ہو دو گواہوں کی تصدیق کی ضرورت ہے اسی طرح رضامندیِ فریقین کی تصدیق بھی لازم ہے۔

ممالک اسلامی میں عقد خوانی کے متعلق بعض رسوم کی پابندی کیجاتی ہے چنانچہ عقد پڑھنے کے لئے مخصوص اشخاص جو ضروریات شرع اور شرائط شرعی سے واقف رہتے ہیں مقرر کئے جاتے ہیں اور جن کو عرف میں قاضی کہتے ہیں۔ قاضی کے عقد پڑھنے سے گویا ضابطہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے سوائے دو اور آدمی نکاح کی انجام دہی کے لئے متناکحین کی جانب سے مقرر کئے جاتے ہیں جو وکلاء کہلاتے ہیں۔ قاضی اور وکلاء کے علاوہ چند گواہ بھی جلسۂ نکاح میں شریک رہتے ہیں۔ عاقدین میں وکلاء کے ذریعہ سے جو شرائط طے ہوتے ہیں ان کا ایک دستاویز میں جو کابین نامہ یا مہر نامہ کہلاتی ہے اندراج کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے باضابطہ رسوم اُن غیر مسلمہ عورتوں کی عقد خوانی میں بجالائے جاتے ہیں جن کے ساتھ مسلم مرد نکاح کرتے ہیں۔ کرسچین میرج ایکٹ (نشان ۱۵ بابت ۱۸۷۲ء) یعنے ہند کا قانونِ نکاح نصاریٰ کی رو سے اگر عاقدین میں سے کوئی ایک فریق عیسائی ہو تو عقد اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتا جب تک ان احکام و شرائط کی باضابطہ بجا آوری نہو جو اس ایکٹ کی (دفعات ۴ و ۵) میں درج ہیں۔

فصل چوتھی

ثبوت نکاح

نکاح صریحی اور ضمنی دونوں طرح کی شہادت سے ثابت ہو سکتا ہے۔

طریقۂ اثبات نکاح صریحاً نکاح اس طرح ثابت ہو سکتا ہے کہ جن گواہوں کے سامنے نکاح ہوا تھا وہ اس کے واقع ہونے کی گواہی دیں

یا بصورت نکاح نامہ شہادت تحریری پیش کی جائے۔

زن و شوہر کے بیانات اور ان کے باہمی برتاؤ سے نکاح ضمناً ثابت کیا جا سکتا ہے چنانچہ فتاوائے عالمگیری میں لکھا ہے کہ "جب کوئی شخص مرد اور عورت کو ایک ہی مکان میں رہتے اور باہم زن و شوہر کا سا بے تکلف برتاؤ کرتے دیکھے تو اس کا شرعاً یہ گواہی دینا جائز ہے کہ یہ عورت اُس شخص کی زوجہ ہے"[1]۔

نتائج جو نکاح سے برآمد ہوتے ہیں

منجملہ اُن فوائد کثیرہ کے جو نکاح سے حاصل ہوتے ہیں ایک فائدہ یہ ہے کہ اُس کے ذریعہ سے مرد اور عورت کی ہم بستری جائز ہو جاتی ہے۔ شوہر پر ادائی مہر اور جو شرائط کہ نکاح سے پہلے طے ہو جاتے ہیں ان کا بجا لانا واجب ہو جاتا ہے اور طرفین کے حقوق وراثت قائم ہو جاتے ہیں اور فریقین پھر ایک دوسرے کے محرمات شرعی کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ زوجہ کے ساتھ عدل کرنا اور عزت و محبت سے پیش آنا شوہر پر فرض ہو جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں زوجہ کو شوہر کی اطاعت اور اس سے وفاداری کرنی لازم ہو جاتی ہے۔ وفاداری سے مراد زوجہ کا عصمت و عفت سے شوہر کے حصن میں بسر کرنا ہے۔

اگر نکاح کے وقت کوئی شرط فاسد قائم کی جائے تو اس سے فسخ نکاح لازم نہیں آتا بلکہ ایسی شرط کالعدم سمجھی جاتی ہے۔

اگر قبل نکاح شوہر و زوجہ یہ معاہدہ کریں کہ ایک کو دوسرے کی وراثت میں کچھ حصہ نہ ملے گا تو ایسا معاہدہ شرعاً ناجائز ہے اور جب دونوں میں سے پہلے جس کی موت واقع ہو دوسرا اس کے متروکہ میں حصہ پائے گا۔

اگر تکمیل نکاح کے قبل عاقدین میں سے ایک مر جائے تو دوسرا اس کی جائداد میں حصہ پانے کا مستحق ہوگا۔

---

[1] مقابلہ کرو ہدایت اللہ بنام رائے جان خانم ۱۸۴۲ء مورز انڈین اپیلز جلد ۳ صفحہ ۲۹۵۔ ماہ طلعت بی بی بنام احمد حلیم الزماں ۱۸۸۱ء کلکتہ لارپورٹ جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۳ وائنز بنام صندل النسا چودھرانی ۱۸۸۶ء مورز انڈین اپیلز جلد ۱۱ صفحہ ۱۷۷۔ نواب لنسا بنام فضل النسا ۱۸۶۳ء مارشل صفحہ ۴۲۸۔

فصل پانچویں

نان و نفقہ

زوجہ کے نان و نفقہ اور سکونت کے متعلق جو شرائط طے پاتے ہیں وہ عموماً ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں لیکن اگر ان کے متعلق کوئی تحریر نہ ہو تو بھی زوجیت کے دوران میں شوہر اپنی زوجہ کو اپنی حیثیت اور آمدنی کے مطابق نفقہ دینے کا شرعاً پابند ہے۔ شوہر پر نفقہ کا دینا خواہ زوجہ مسلمہ ہو کہ غیر مسلمہ فرض ہے۔

مگر زوجہ کا حقِ نفقہ ایک شرط کے تابع ہے۔ نفقہ پانے کے لئے عورت کو مرد کی فرماں برداری کرنی ضرور ہے اور کسی جائز اور معقول وجہ کے بغیر وہ شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار نہیں کر سکتی لیکن اگر شوہر نے مہر معجل نہ ادا کیا ہو تو زوجہ کا اس صحیح اور معقول عذر کی بنا پر اُس کے ساتھ رہنے سے انکار کرنا جائز ہے۔

اگر زوجہ کی نابالغی کے سبب سے فریقین میں تکمیل نکاح نہ ہوا ہو تو حنفی اور شیعہ مذاہب میں شوہر کا زوجہ کو نفقہ دینا فرض شرعی نہیں ہے۔

علیٰ ہذا القیاس حنفیہ اور شیعوں کے نزدیک جبکہ زوجہ کی نابالغی کے سبب سے شوہر حق حراست زوجہ کا مستحق نہ ہو یعنے نابالغی کے سبب سے زوجہ شوہر کے پاس اور اُس کے زیر پرورش نہ رہتی ہو بلکہ اپنے کسی ولی کے ہاں رہتی ہو تو شرعاً شوہر اس کو نفقہ دینے کا ذمہ دار نہیں ہے[1]۔

لیکن شافعی مذہب میں خواہ زوجہ نابالغہ ہو کہ نہیں شوہر پر نفقہ دینا دونوں حالتوں میں فرض ہے۔

---

[1] بمعاملۂ خدیجہ بی بی جس کا حوالہ صفحہ۷۷ پر دیا گیا ہے۔

اگر شوہر زوجہ کے لئے کسی قسم کا ذریعۂ معاش مہیّا کرنے کے بغیر زوجہ سے ترک تعلقات کردے اور اس کی خبرگیری نہ کرے تو شافعیہ کے نزدیک زوجہ عدم خبرگیری کی بنا پر نکاح فسخ کرا سکتی ہے اور اگر صحیح طور پر فسخ نکاح کا حکم صادر ہو تو حنفی قاضی اس کی تعمیل کرا سکتا ہے[1]۔

زوجۂ مطلقہ عدۃ کے زمانہ میں نفقہ پانے کی مستحق ہے اور اس کے برعکس بیوہ کو نفقہ پانے کا حق نہیں ہے۔ پریوی کونسل کی جوڈیشیل کمیٹی نے ایک مقدمہ میں جس کا کسی قدر پہلے حوالہ دیا گیا ہے تجویز کی ہے کہ مسلمان بیوہ[2] کو اپنے شوہر متوفی کی جائداد سے بجز میراث پانے کے کسی قسم کے نفقہ کا حق نہیں ہے۔

نفقہ کے متعلق اگر کسی مقدار رقم کا خاص معاہدہ نہ ہوا ہو تو ڈگری (حکم) صادر ہونے کی تاریخ سے زوجہ نفقہ پانے کی مستحق ہے لیکن جس زمانہ میں کہ نفقہ نہ ملا ہو اس کے لئے یا اُس کے بقایا کے وصول کرنے کے متعلق زوجہ عدالت سے کوئی حکم حاصل نہیں کر سکتی[3]۔

زوجہ نفقہ کا دعویٰ کسی عدالت دیوانی میں یا (کسی مخصوص معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں) عدالت فوجداری میں دفعہ ۴۸۸ ضابطۂ فوجداری ہند کے تحت میں پیش کر سکتی ہے۔

جو حکم (منجانب عدالت) مطلقہ کے نفقہ کے واسطے جاری ہوتا ہے وہ زمانۂ عدۃ کے ختم ہونے پر موقوف ہو جاتا ہے[4]۔

---

[1] دیکھو مابعد صفحہ ۹۳۔

[2] آغا محمد جعفر بندیم بنام کلثوم بی بی ۱۸۹۹ء کلکتہ جلد ۲۵ صفحہ ۹۔ دیکھو کلکتہ ویکلی نوٹ جلد ۱ صفحہ ۴۴۹۔

[3] عبدالفتح مولوی بنام زیب النساخاتون ۱۸۸۱ء کلکتہ جلد ۶ صفحہ ۶۳۱ اور یہی فیصلہ کلکتہ لا رپورٹ جلد ۸ صفحہ ۲۴۲ پر شائع ہوا ہے۔

[4] دیکھو شاہ ابو الیاس بنام الفت بی بی ۱۸۹۶ء الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۵۰ اور جن نظائر کا اُس فیصلہ میں حوالہ دیا گیا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہیں۔

چونکہ شیعوں کے مذہب میں متعہ جائز ہے اس لئے ممتوعہ زمانہ متعہ میں بشرطیکہ صیغۂ متعہ کے وقت مقدار نفقہ نہ معین کی گئی ہو اور اس کی ادائی کا وعدہ شوہر نے نہ کیا ہو نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے ۔ لیکن شیعوں کے اس مخصوص قاعدہ کے سبب سے عموماً زوجہ کو نفقہ پانے کا حق جو ضابطۂ فوجداری ہند کی رو سے عطا ہوا ہے وہ زائل نہیں ہو سکتا اور اس لئے ممتوعہ بھی گو بوقت تزویج اس نے نفقہ کے متعلق شوہر سے کوئی خاص وعدہ نہ لیا ہو اس قانون موضوعہ کے زیر اثر نفقہ پا سکتی ہے[1] ۔

فصل چھٹی

غیر مشروع اور ناجائز نکاح

تعلقات ناجائز چونکہ زناشوئی کے ناجائز اور خلاف شرع تعلقات سے مرد اور عورت میں نکاح کی حیثیت نہیں پیدا ہوتی لہذا جو نکاح خلاف شرع اور ناجائز طور پر کیا جائے وہ بنفسہ کالعدم اور باطل ہے اور اس کے ذریعہ سے متناکحین کے درمیان کسی قسم کے حقوق و فرائض نہیں پیدا ہوتے ہیں ۔ نہ زوجہ کو شوہر پر مہر کا حق ہوتا ہے گو نکاح کی تکمیل ہو جائے یعنی نکاح باقی رہنے کے زمانہ میں اور فسخ نکاح واقع ہونے کے باوجود اگر دونوں میں سے ایک مر بھی جائے تو دوسرا اُس کا وارث نہیں ہو سکتا ۔ اس قسم کا نکاح تاریخ وقوع سے خلاف شرع سمجھا جاتا ہے "شرعاً اور حقیقتاً" دونوں طرح سے اس طرح کا نکاح معدوم محض متصور ہوتا ہے ۔

---

[1] بمقابلہ عرضی لڈن صاحبہ بنام قمر قدر ۱۸۸۲ء کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۳۷۹ دیکھو کلکتہ لاء رپورٹ جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۳ ۔

تمثیل شرع محمدی میں جو ناتے رشتے نکاح کے لئے حرام قرار دیے گئے ہیں اگر ان رشتوں میں تزویج ہونے کے سبب سے نکاح ناجائز ہو گیا ہے تو از روئے شرع اس طرح کا نکاح باطل سمجھا جاتا ہے اور اس طرح کے باطل نکاح کی وجہ سے شرع حنفی کے مطابق زن و شوہر کے درمیان کسی قسم کے حقوق نہیں پیدا ہوتے اور نہ ان کا کوئی اثر یا نتیجۂ شرعی برآمد ہو سکتا ہے۔ لیکن جس صورت میں کہ نکاح ناجائز کی تکمیل ہو جاتی ہے اُس حالت میں منکوحہ اپنا مہر المثل پانے کی مستحق ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت سے جو دوسرے کے نکاح میں ہو عقد کرلے خواہ اس کو حقیقۃً اس بات کا علم ہو کہ نہ ہو تو ایسا نکاح حرام مطلق ہے۔

نکاح ناجائز مگر جو نکاح اس قسم کے عیب سے جس کا ذکر فقرۂ بالا میں کیا گیا ہے فاسد اور باطل نہ ہو اُس کی ایک دوسری کیفیت ہے۔ ایسے نکاحوں میں جو عیب شرعی کہ اُن کے جواز کا مانع ہے وہ زفاف سے رفع ہو جاتا ہے اور دوران نکاح میں جس اولاد کا حمل رہے یا جو اولاد پیدا ہو وہ حلالی سمجھی جاتی ہے اور زوجہ مہر پانے کی جیسا کہ نکاح جائز کے بعد اس کو حق حاصل ہوتا ہے مستحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک وقت میں ایسی دو عورتوں سے نکاح کرے جو آپس میں ایسی قرابت رکھتی ہوں کہ اگر ان میں ایک مرد ہوتا تو دوسرے کے ساتھ اس کا نکاح خلاف شرع ہوتا تو ایسا نکاح ناجائز ہے کیونکہ پہلی زوجہ کی موت یا طلاق سے دوسری زوجہ بغیر کسی رسم شرعی کی ادائی کے شوہر پر حلال ہو سکتی ہے[1]۔

اسی طرح اگر کوئی مرد کسی غیر کتابیہ سے جیسا کہ متعدد مرتبہ بیان کیا گیا ہے نکاح کرلے تو اس کا نکاح صرف ناجائز ہے لیکن خلاف شرع نہیں ہے کیونکہ بعد از نکاح اُس عورت کو دین اسلام اختیار کرنے کا ہر وقت موقع حاصل ہے[2]۔

---

[1] اس طرح کے نکاح کی اولاد کی صحت نسب کے متعلق دیکھو ماسبق صفحہ ۵۶۔

[2] عبداللطیف خاں بنام نیاز احمد خاں ۱۹۰۹ء الہ آباد جلد ۳۱ صفحہ ۳۴۳۔

فصل ساتویں

خیار البلوغ

اگر کسی نابالغ کا عقد اس کے باپ یا دادا کسی ہم کفو کے ساتھ کر دے یعنے ہر ایک پہلو سے نابالغ کی یہ شادی موزوں و مناسب ہو تو حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد اس کی نسبت نابالغ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے۔

نکاح نابالغ حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد نابالغ کا اختیار تنسیخ

جب کسی نابالغ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوائے کسی دوسرے شخص نے کر دیا ہو تو نابالغ کو خواہ مرد ہو کہ عورت بعد بلوغ معاہدۂ نکاح کو بلا لحاظ نقصان و ضرر منظور یا منسوخ کرنے کا اختیار ہے[1]۔ سنیوں کے مذہب میں اس طرح کا عقد جب تک کہ وہ فسخ نکیا جائے بحال و قائم رہتا ہے لیکن شیعوں کے قانون کی رو سے اس طرح کا نکاح جس کو عقد فضولی کہتے ہیں اس وقت تک بالکل معطل رہتا ہے جب تک کہ طرفین بعد بلوغ اُس سے اپنی صریحی یا ضمنی رضامندی کا اظہار نہ کریں۔

اقوال سنی و شیعہ

ایسے نکاح کے بعد اگر منکوحہ بالغ ہونے کے بعد چپ رہے تو اگر وہ باکرہ ہے اور اُس کو اپنے نکاح کا علم ہے تو اُس کا خیار بلوغ ساقط ہو جاتا ہے اور اگر اُس کو بوقت بلوغ اپنے نکاح کا علم نہو تو اُس کو بوقت علم نکاح خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے پس اگر وہ بعد علم نکاح چپ رہے تو اُس کا خیار بلوغ ساقط ہو جاتا ہے اور اگر منکوحہ شیعہ ہو تو تاوقتیکہ وہ اپنی زبان سے اپنی رضامندی ظاہر

---

[1] دیکھو بدل عورت بنام ملکہ قیصرہ ہند ۱۸۹۱ء کلکتہ جلد ۱۹ صفحہ ۷۹۔

نکرے یا ایسا فعل[1] نہ کرے جس سے اُس کی رضا مندی ظاہر اُس کا خیارِ بلوغ ساقط نہیں ہوتا۔

عدالت سے تنسیخ نکاح کے اختیار کے استقرار کرانے کی ضرورت کا سبب

سنیوں کے مذہب کی رو سے تنسیخ نکاح کا اختیار جو نابالغ متناکحین کو بعد بلوغ حاصل ہوتا ہے مشروط ہے جب تک اس اختیار کے متعلق قاضی کا فیصلہ حاصل نہ کر لیا جائے فریقین سے کسی فریق کا خیار البلوغ پر عمل کرنا جائز نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے قاضی یا جج کے فیصلہ کی ضرورت ہے۔

سنیوں کے مذہب میں جب فریقین حق خیار البلوغ کو عمل میں لا کر نکاح کو فسخ کرنا چاہیں تو قاضی کا حکم لے لینا ضرور ہے جب تک قاضی کا حکم نہ لیا جائے اس وقت تک نکاح بجال خود باقی رہتا ہے۔ اگر قاضی کا حکم حاصل کرنے کے پہلے شوہر یا زوجہ مر جائے تو جو زندہ رہ گیا ہے وہ متوفی کی میراث پائے گا۔ اگرچہ اس معاملہ میں قاضی سے رجوع کرنے کی نسبت کوئی میعاد مقرر نہیں ہے لیکن حقِ خیار البلوغ پر فریقین بلوغ کو پہنچتے ہی عمل کر سکتے ہیں۔

مگر قاضی کے حکم پر فسخ نکاح کا جواز منحصر نہیں ہے کیونکہ عدالت کی جانب سے جو استقرار حق الفساخ کی ڈگری دی جاتی ہے اس کی غرض محض عدالت کو گواہ قرار دینا ہے اور یہ اس لئے کہ آئندہ فریقین کے درمیان نکاح کی بابت کسی قسم کی نزاع پیدا نہ ہونے پائے[2]۔ لہذا اگر ایسی ایک لڑکی جس کا نابالغی میں کسی مرد کے ساتھ اس کی ماں نے نکاح کر دیا تھا بالغ ہونے کے بعد پہلے عقد کو فسخ کر کے کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر لے تو اُس پر دو شوہر کرنے کا الزام نہیں قائم ہو سکتا دراں حالیکہ

---

[1] ملکہ جہاں صاحبہ بنام محمد عسکری خاں ۱۸۷۳ء ۶ لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد جو بطور ضمیمہ شائع ہوئی ہے صفحہ ۱۹۲۔

[2] ردالمختار جلد ۲ صفحہ ۵۰۲۔

قاضی نے فسخ نکاح کی نسبت کوئی حکم صادر نہ کیا ہو[1]۔

سنیوں کے نزدیک اس طرح کے نکاح کے بعد جب عورت بالغ ہو جائے اور علم رکھنے کے باوجود تکمیل نکاح یعنے بوقت زفاف "خاموش" رہے تو ایسے سکوت سے رضامندی کا قیاس کیا جاتا ہے۔

شیعوں کا قانون

شیعوں کے مذہب میں جو نکاح کسی شخص غیر مجاز نے نابالغ کی طرف سے کر دیا ہو یعنے عقد فضولی اُس وقت تک بالکل معطل رہتا ہے جب تک طرفین بالغ ہو کر اس کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار نکریں یعنے ایسے عقد سے کوئی نتیجۂ شرعی مترتب نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کی تصدیق نہ کر دیجائے اور اگر ایسے نکاح کی تصدیق کرنے کے پہلے شوہر یا زوجہ میں سے کوئی ایک مرجائے تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور جو ان میں سے زندہ رہتا ہے وہ متوفی کی میراث نہیں پا سکتا۔

حنفیہ اور شیعہ دونوں کے قول کے موجب عاقلہ اور بالغہ عورت جس شخص سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر طرفین ہم کفو[2] نہ ہوں تو عورت کے عُصبات میں سے کسی ایک کے قاضی سے شکایت کرنے پر ایسا نکاح قبل اس کے کہ اُس نکاح کے ذریعہ سے کوئی اولاد پیدا ہو فسخ کرایا جا سکتا ہے۔

فصل آٹھویں

متعہ یا عقد عارضی

شیعوں کے بعض فرقوں میں خصوصًا اخباریوں کے نزدیک عقد نکاح عارضی

---

[1] بدل عورت بنام ملکہ قیصرہ جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

[2] شیعوں میں مسئلۂ کفو پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ میری دانست میں اس مقام پر مؤلف صاحب سے لغزش قلم واقع ہوئی ہے جس کی بنا پر انھوں نے اس فقرہ میں حنفیہ کے ساتھ شیعوں کو بھی شریک فرما دیا ہے۔ از مترجم۔

یعنے متعہ جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کا نکاح زمانۂ جاہلیت کے اعراب اور Sabians قوم میں رائج تھا۔ پیغمبر عربی نے بھی ایک خاص وقت کے لئے اس قسم کی تزویج کی اجازت دی تھی۔ بہرحال سنہ ہجری سے متعہ کی ممانعت ہوگئی ہے لیکن اس پر بھی اس اجازت کا اثر اخباری شیعوں کے دماغوں میں سما گیا ہے اور ان کے احادیث و اقوال اس کے ذکر سے پُر ہیں۔ ان کے قول کے مطابق ایسے مرد و عورت جن میں تزویج کی قابلیت ہو مدت معینہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ عقد نکاح کر سکتے ہیں۔ مدت کا کوئی تعین نہیں ہے بلکہ طرفین جس قدر مدت چاہیں مقرر کر سکتے ہیں۔ اس طرح کا نکاح مدت کے ختم ہونے سے یا قبل از وقت بتراضی طرفین منقطع ہو سکتا ہے۔

اگرچہ اس قسم کے ازدواج میں طلاق کی ضرورت نہیں ہے اور طلاق کے بغیر اس طرح کا نکاح ختم ہو جاتا ہے لیکن اخباریوں کے بعض فقہا کے نزدیک شوہر بلا رضامندی زوجہ مدت عقد کو "فسخ کر سکتا ہے"۔ برایں ہم یہ اصول جس کو ایک مقدمہ میں کلکتہ ہائی کورٹ[1] نے ملحوظ رکھا ہے معاہدۂ متعہ کی اصلیت اور حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح کا معاہدہ طرفین کی رضامندی سے وقوع میں آتا ہے۔ اس کے سوائے اس تجویز کی بنا ایک غلط دلیل ہے اس لئے کہ اس فیصلہ میں عدالت نے زوجہ (ممتوعہ) کو داین اور شوہر کو مدیون تصور کیا ہے جس کی وجہ سے عدالت کو خیال کرنا پڑا کہ جب مدیون چاہے بلا رضامندی داین اس کا قرضہ بیباق کر دے سکتا ہے حالانکہ متعہ کے مسئلہ کے متعلق اس طرح رائے قائم کرنی اکثر فقہائے شیعہ کے اقوال کے خلاف ہے۔

جو اولاد اس قسم کے نکاح سے پیدا ہوتی ہے وہ صحیح النسب سمجھی جاتی ہے اور اپنے والدین کا ورثہ پاتی ہے حالانکہ فریقین متعہ جب تک اُن میں حق توریث کی نسبت کوئی معاہدہ نہ کیا جائے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ہیں۔

---

[1] قمر قدر بنام لڈن صاحبہ ۱۸۸۶ء کلکتہ جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۶۔

حنفی مذہب میں ایسا نکاح جو کسی مدت معینہ کے لئے کیا جاتا ہے ناجائز

قول حنفیہ

ہے لیکن اگر طرفین زن و شوہر کی حیثیت سے ایک معقول مدت تک ایک جا بسر کریں تو اُس سے ان میں نکاح دائمی کے ہونے کا قیاس کیا جاتا ہے اور جو نتائج اور اثرات کہ نکاح جائز کے ہیں وہی اثرات اس طرح زن و مرد کے ایک جا رہنے سے مستخرج ہوتے ہیں۔

جس طرح اوپر کسی مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ اگر نکاح کے ساتھ کوئی خلاف شرع شرط قائم کی جائے تو اس سے نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ شرط بہ نفسہ کالعدم سمجھی جاتی ہے اسی طرح ناجائز اور خلاف شرع شرط کے قائم کرنے سے متعہ نہیں ٹوٹتا بلکہ شرط کالعدم اور باطل قرار پاتی ہے۔

فصل نویں

تبدیل مذہب (مرتد ہونے) کا اثر نکاح پر

دیسی کرسٹانوں کے قانون انفساخ نکاح (ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۶ء) کو جاری کرنے سے خصوصاً ایسے مذہب والوں کو فسخ نکاح کا موقع ملا ہے جن کے نظامات قانونی میں عقد ہونے کے بعد بلا اعانتِ عدالت فریقین اپنی ذات سے انفساخ نکاح نہیں کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی دشواری جیسا کہ ہندووں اور اسی قسم کی دوسری شریعتوں میں ہے اور اسی لئے قانون مذکور اُن دیسی کرسٹانوں کی تنسیخ تزویج کی سہولت کی غرض سے وضع کیا گیا ہے جو ہندو مذہب سے نکل کر دین مسیحی میں داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کے اثر سے ہند کے عیسائی مسلمان اور یہودی باشندے مستثنیٰ ہیں۔ اس قانون میں "دیسی شوہر" سے مراد ایسا کتخدا شخص ہے جو ہند میں سکونت مستقل رکھتا ہے اور جس نے اپنی عمر کا سولھواں سال ختم کیا ہے اور عیسائی مسلمان

اور یہودی نہ ہو" دیسی زوجہ" سے مراد ایسی کتخدا عورت ہے جو برطانوی ہند میں سکونت مستقل رکھتی ہے اور جس کی کامل سولہ سال کی عمر ہو گئی ہے اور جو نصرانیہ، مسلمہ یا یہودیہ نہیں ہے۔ ایسا ہی اس ایکٹ میں دیسی قانون سے مراد اُن لوگوں کا شخصی قانون اور رسم ہے جو برطانوی ہند میں سکونت مستقل رکھتے ہیں اور عیسائی، مسلمان اور یہودی نہیں ہیں۔

ترک اسلام

بعض فقہائے اسلام کا جیسا کہ صاحب ہدایہ میں قول ہے کہ شوہر یا زوجہ کے دین اسلام ترک کرنے یعنے مرتد ہو جانے سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ بہرحال موجودہ حالات کے نظر کرتے اب اس قول میں ترمیم ہو گئی ہے۔ بلخ اور سمرقند کے علما کے اس خیال کے متعلق جن کے اقوال پر ہند کے اہل سنت عمل کرتے ہیں حسب ذیل فتاوے ہیں:۔

(الف) جب مسلمان شوہر و زوجہ دونوں کے دونوں اسلام کو ترک کر کے کوئی دوسرا دین اختیار کر لیں یعنے مرتد ہو جائیں تو اُن کے ارتداد سے ان کا نکاح باطل نہیں ہوتا۔

(ب) اگر زن و شوہر مسلمان ہوں اور زوجہ اسلام ترک کر کے کوئی دوسرا دین الہامی اختیار کر لے یعنے نصاریٰ یا یہودیوں کے دین میں شامل ہو جائے تو ان کا نکاح فسخ نہیں ہوتا[1]۔

(ج) لیکن جب شوہر اسلام ترک کرے اور زوجہ اسی دین پر قائم رہے تو اس کا اثر نکاح پر ایک دوسری طرح سے پڑتا ہے۔ اس کے متعلق جو قول اکثر علما کا مسلمہ و مقبولہ ہے وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں زن و شوہر کا تعلق حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر شوہر بعد ارتداد اور قبل اختتام عدۃ جس مدت کے بعد کہ قطعی طور پر نکاح فسخ ہو جاتا ہے پھر دین اسلام اختیار کر لے تو فریقین کو دوبارہ عقد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] نہر الفایق۔ ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۳۶۴۔ فتح القادر ۱۲۔

اسلام اختیار کرنا

اگر زن و شوہر کا کسی دین الہامی سے تعلق ہے (یعنے وہ یہودی، نصرانی یا زردشتی ہیں) اور صرف شوہر دین اسلام اختیار کرلے تو جو نکاح کہ فریقین میں ان کے مذہب سابق کے مطابق ہوا تھا اور زوجہ کے دین سابق پر قائم رہنے کے باوجود وہ فسخ نہیں ہوتا۔
مثلاً اگر کوئی عیسائی یا یہودی مسلمان ہوجائے اور اس کی زوجہ اپنے موروثی مذہب پر قائم رہے تو ان کا نکاح جائز اور موثر ہے۔
جب کوئی غیر کتابی شوہر جس کا عقد کسی غیر کتابیہ زوجہ سے ہوا ہو مشرف بہ اسلام ہوجائے اور اس کی زوجہ دین اسلام قبول کرنے سے انکار کرے تو اُس کا نکاح سابق فسخ کرادیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی شکل میں اگر زوجہ بھی اسلام اختیار کرلے تو نکاح بحال خود باقی رہتا ہے اور اگر وہ اسلام لانے سے انکار کرے تو شرع کے حکم سے نکاح فسخ کرادیا جاتا ہے۔ لیکن جب تک کہ انفساخ نہ ہوجائے نکاح (تعلق زناشوئی) ناجائز سمجھا جاتا ہے مگر کالعدم نہیں ہوتا اور اس لئے جو نتائج کہ نکاح ناجائز سے پیدا ہوتے ہیں وہی اثرات اس طرح کے نکاح سے بھی مستخرج ہوتے ہیں اور یہ دوسرا قول اسلام کے کل فرقوں کے نزدیک معتبر ہے۔
جب کوئی غیر مسلمہ عورت خواہ کتابیہ ہو کہ نہ ہو کسی غیر مسلم مرد سے عقد کرنے کے بعد اسلام قبول کرتی ہے تو اس کا نکاح مندرجۂ ذیل صورتوں میں فسخ ہوجاتا ہے:۔
(الف) اگر زوجہ نے ایسے ملک میں رہ کر جہاں قوانین اسلام پر عمل ہوتا ہے یعنے دارالاسلام کے قیام میں دین اسلام اختیار کیا ہے تو اُس کو قاضی سے رجوع کرنا لازم ہے اور قاضی شوہر کو بذریعۂ حکمنامہ طلب کرکے اسلام قبول کرنے کی نسبت فہمائش دے گا اور اگر شوہر اس سے انکار کرے تو نکاح فسخ کردیا جائے گا۔
(ب) اگر زوجہ کسی غیر مسلم یا ملک غیر میں یعنے دارالحرب میں رہ کر مسلمان ہوئی ہے تو اس کا عقد اسلام لانے کی تاریخ سے تین حیض کے بعد

فسخ ہو جائے گا۔ کلکتہ ہائی کورٹ[1] نے تجویز کی ہے کہ ہند غیر مسلم ملک (یعنی دار الحرب) نہیں ہے اس لئے اگر کوئی کتخدا غیر مسلمہ عورت دین اسلام اختیار کرے اور بعد ازاں کسی جج یا مجسٹریٹ کے توسط سے اپنے پہلے شوہر کو طلب کرا کے اسلام اختیار کرنے کے متعلق فہمائش نہ دلوا سکے اور بجائے اس کارروائی کے ایک تازہ عقد کر لے تو اس پر ایک وقت میں دو نکاح کرنے کا الزام قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عدالت موصوفہ نے ایسی صورتوں کے لئے جبکہ جج یا مجسٹریٹ نے زوجہ کی درخواست کی شنوائی سے یا شوہر کے طلب ہونے کے بعد اس کے دین اسلام قبول کرنے سے انکار کرنے پر کوئی چارہ کار نہیں بتلایا۔ لہٰذا میرے خیال میں جب ایسی مسلمہ زوجہ عدالت سے اپنے شوہر غیر مسلم کی طلبی اور اس کو اسلام قبول کرنے کے لئے فہمائش نامہ کی اجرائی کے واسطے درخواست کرے اور عدالت ایسی درخواست کو نامنظور کر دے تو سمجھنا چاہیئے کہ عدالت نے درخواست گزارہ کی حالت سے اطمینان کر لیا اور جب اسلام قبول کرنے کی تاریخ سے تین مہینے گزر جائیں تو سائلہ کا پہلا عقد فسخ ہو گیا سمجھنا چاہیئے۔

جب کوئی غیر مسلمہ کسی غیر مسلم کے عقد میں رہ کر اسلام قبول کرے اور اس بنا پر حسب احکام شرع محمدی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ایسی تزویج فسخ ہو جائے تو اُس کا اسلامی رسوم کے مطابق دوسرا نکاح کرنا جائز ہے اور اس دوسرے نکاح سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ صحیح النسب متصور ہوتی ہے۔ لہٰذا جو فیصلہ سندری لیتانی بنام تیمری لیتانی[2] میں کیا گیا ہے شرع محمدی کے اُس مسلمہ قاعدہ کے خلاف ہے۔

جب کوئی غیر مسلم مرد اور عورت اپنے مذہب کے رسوم کے مطابق تزویج کر لیں اور اس کے بعد اسلام قبول کریں تو اُن کی پہلی شادی بذات خود باقی رہتی ہے لیکن اسلامی رسوم کے مطابق اُن کا دوبارہ نکاح ہونا مناسب و ضروری

---

[1] بمقابلہ عرضی رام کنواری ۱۸۹۱ء کلکتہ جلد ۱۸ صفحہ ۲۶۴۔
[2] ۱۹۰۵ء کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۹ صفحہ ۱۰۰۳۔

سمجھا جاتا ہے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد زن و شوہر کے حقوق اور اُن کی حیثیت قانونی شرع محمدی کے تابع ہو جاتی ہیں چنانچہ پریوی کونسل کی جوڈیشیل کمیٹی نے اسکنر بنام اسکنر[1] کے مقدمہ کے فیصلہ میں اس اصول پر عمل کیا ہے۔

اس مقدمہ کے واقعات یہ ہیں کہ ایک مرد اور عورت نے اپنے کو دین مسیحی کا پیرو ظاہر کر کے ایک گرجا میں عیسائی طرز کا عقد کیا تھا اور بعد ازاں اُن دونوں نے دین اسلام اختیار کر کے اسلامی طرز کا نکاح کر لیا۔ شوہر نے مرنے کے پہلے ایک وصیت کے ذریعہ سے زوجہ کو اپنی جائداد میں حصہ پانے سے محروم کر دیا تھا لیکن جب مقدمہ آخری فیصلہ کے لئے پریوی کونسل میں پیش ہوا تو اس کے معزز ارکان نے طے فرمایا کہ متوفی کی حیثیت شخصی مرنے کے وقت ایک مسلم کی سی ہو گئی تھی یعنے مرنے کے پہلے وہ مسلمان ہو گیا تھا اور چونکہ مدعیہ کی حیثیت شخصی شرع محمدی کی رو سے متوفی کی زوجہ کی ہے لہذا مدعیہ وصیت کے ذریعہ سے محروم کئے جانے کے باوجود شرع محمدی کی رو سے شوہر متوفی کی میراث میں حصہ پانے کی مستحق ہے اور ایسی وصیت جس کے ذریعہ سے شوہر متوفی نے مدعیہ کو محروم الارث قرار دیا ہے قانون مذکور میں غیر موثر سمجھی جاتی ہے۔

باب پنجم

فصل پہلی

مشاہدات عام

بلحاظ اثرات قانونی مسلمانوں کا مہر اکثر حالات میں رومنوں کے عطیہ عقد صحیح

---

[1] سنہ ۱۸۹۷ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۲۵ صفحہ ۳۴ دیکھو انڈین لا رپورٹ سلسلہ کلکتہ جلد ۲۵ صفحہ ۵۳۱ اور کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۲ صفحہ ۲۱۹۔

جوازِ نکاح کسی صریح معاہدۂ مہر پر منحصر نہیں ہے

(مہر) کے مشابہ ہے۔ مہر ایک قسم کی تملیک ہے جو زوجہ کے فائدہ کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے اور جس کا تعین قبل تکمیل نکاح بمعاوضۂ نکاح کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مہر کا طے پانا ایک ضروری شرطِ نکاح ہے لیکن جوازِ نکاح اس کے اظہارِ صریح پر منحصر نہیں ہے لہٰذا اگر عقدِ نکاح کے وقت مہر نہ باندھا جائے یعنے کسی قسم کا مہر معین نہ کیا جائے تو اس سے نکاح کے جواز پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ مہر کے مقرر نہ کئے جانے کے باوجود زوجہ اُس کے پانے کی مستحق ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں اُس کو اس قدر مہر دلایا جاتا ہے جو اُس کے خاندان میں رائج ہے۔ لیکن مہر نکاح کے لئے اس قدر ضروری شئے ہے کہ اُس کے نہ معین اور نہ ادا کئے جانے کے متعلق کسی شرط کے قائم ہونے کے باوجود شرعاً شوہر پر اُس کی ادائی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مہر کی مقدار مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ مہر کی سب سے بڑی مقدار اور تعداد کی بابت کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے۔ اس کی مقدار متناکحین کے حالات خاندانی ورتبۂ معاشرتی پر منحصر ہے۔ سوسائٹی کے جس طبقہ سے ان کا تعلق ہوتا ہے اس کی مالی اور معاشرتی حالت کے اندازہ سے مہر باندھا جاتا ہے۔

فصل دوسری

اقسامِ مہر

مہر المثل

جب نکاح کے وقت کچھ مہر نہ باندھا گیا ہو یا قبل یا بعد نکاح مہر کی مقدار کی تصریح و تعین نہ کی جائے یا مہر عمداً یا سہواً چھوڑ دیا گیا ہو تو عورت اس مہر کی مستحق ہو گی جو شرع میں مہر المثل یعنے اس کے

امثال و اقران کا مہر کہلاتا ہے۔

اگرچہ مہر المثل کی کوئی تعداد شرع میں معین نہیں ہے لیکن عرفاً زوجہ کے حالات خاندانی اور اس کے ذاتی اوصاف اور اس کے مرتبہ اور حیثیت کے لحاظ سے اُس کی مقدار مقرر کی جاتی ہے۔

ادائی مہر کی مدت

سنت جماعت کے کل فرقوں میں تکمیل نکاح یعنے زفاف کے بعد ہی خواہ وہ حقیقتہً یا مجازاً وقوع میں آئے پورے مہر کی ادائی شوہر پر لازم ہو جاتی ہے۔ نکاح کے بعد زوجین میں ایسی تنہائی ہونے سے جس میں کوئی امر شرعی یا حسّی مانع وطی نہو وطی ہو جانے کا قیاس پیدا ہو جاتا ہے ایسی تنہائی کو اصطلاح میں خلوت صحیحہ کہتے ہیں۔

شیعوں کا قول

شیعوں کے مذہب میں تکمیل نکاح یعنے زفاف کے بعد ہی مہر واجب الادا ہو جاتا ہے۔ اہل اسلام میں عموماً دستور ہے کہ مہر کا کچھ حصہ طلب کرنے پر وہ قابل ادائی ہو جاتا ہے اور باقی حصہ فسخ نکاح کے بعد ادا کیا جاتا ہے۔ مہر کا جو حصہ فوراً طلب کرنے پر قابل ادائی ہے اس کو مہر معجل کہتے ہیں اور اگر یہ حصۂ مہر نہ ادا کیا جائے تو زوجہ شوہر کے سکونتی مقام میں داخل ہونے سے انکار کر سکتی ہے۔ مہر کا دوسرا حصہ مہر مؤجل کہلاتا ہے اور فسخ نکاح کے بعد خواہ انفساخ موت کے ذریعہ سے خواہ طلاق کے سبب سے واقع ہو قابل ادائی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں دستور ہے کہ نصف مہر معجل اور باقی نصف مؤجل باندھا کرتے ہیں لیکن متناکحین کو اس کے سوائے کوئی دوسری شرط بھی قرار دینے کا اختیار ہے۔

جب مہر ادا کرنے کی بابت کسی مدت کا تعین نہ کیا جائے یا مہر ایسے عام لفظوں میں باندھا جائے جن سے اس کی ان دونوں قسموں کا اندازہ نہو سکتا ہو اور عقد نکاح میں اس امر کا ذکر بھی نہ کیا جائے کہ مہر کا کس قدر حصہ معجل اور کس قدر حصہ مؤجل ہے تو اس کے تصفیہ کے لئے اس امر کا لحاظ کرنا لازم ہے کہ متناکحین کا سوسائٹی میں کس طبقہ سے تعلق ہے اور اُس فریق میں مہر باندھنے کا

کیا رواج ہے[1]۔

انفساخ نکاح قبل تکمیل

اگر نکاح قبل تکمیل یعنے خلوت صحیحہ ہونے کے بغیر فسخ ہو جائے تو سنت جماعت کے نزدیک زوجہ نصف مہر پانے کی مستحق ہے۔

لیکن شیعوں میں اس کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ ان کے بعض علما اس مسئلہ میں سنیوں سے متفق ہیں اور بعضوں کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں زوجہ صرف کچھ انعام پانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ شیعوں کے ان دونوں اقوال میں پہلا قول زیادہ معتبر ہے۔

شوہر جب زوجہ کو مہر ادا کرنے کے عوض کوئی جائداد اُس کے حوالہ کر دیتا ہے تو جائداد کو اس طریقہ سے منتقل کرنا بیع مکاسہ کہلاتا ہے۔

زوجہ کا حق انکار ہم بستری

سنیوں کے نزدیک مہر معجل کی صورت میں زوجہ جب تک کہ مہر ادا نہ کیا جائے ہم بستری سے انکار کر سکتی ہے اور شوہر بغیر ادائے مہر طلب زوجہ کی نالش کرنے کا مجاز نہیں ہے[2]۔

اگر زوجہ کی جانب سے مہر معجل پانے کا دعویٰ ہو جائے تو شوہر مہر کی مقدار معینہ ادا کر کے طلب زوجہ کی ڈگری پانے کا مستحق ہو سکتا ہے[3]۔

---

[1] مقابلہ کرو توفیق النسا بنام غلام قنبر ۱۸۷۶ء الہ آباد جلد ا صفحہ ۵۰۶ - عیدن بنام مظہر حسین ۱۸۷۷ء الہ آباد جلد ا صفحہ ۴۸۳۔

[2] عیدن بنام مظہر حسین ۱۸۷۷ء۔ اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ولایت حسین بنام اللہ رکھی ۱۸۸۰ء الہ آباد جلد ۲ صفحہ ۸۳۱۔

[3] عبد القادر بنام سلیمہ ۱۸۸۶ء الہ آباد جلد ۸ صفحہ ۱۴۹ اس مقدمہ میں ہائی کورٹ الہ آباد نے تجویز کی ہے کہ طلب زوجہ کے دعوے میں زوجہ کی جانب سے تکمیل نکاح کے بعد مہر نہ ادا کئے جانے کی جواب دہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ معزز ارکان عدالت العالیہ کی یہ رائے نہایت عجیب و غریب ہے۔ اسی تجویز پر ہائی کورٹ مدراس نے کنہی بنام محی الدین ۱۸۸۴ء مدراس جلد ۱۱ صفحہ ۳۲۷ اور ہائی کورٹ بمبئی نے بائی حسنہ بنام عبد اللہ مصطفیٰ ۱۹۰۵ء بمبئی جلد ۳۰ صفحہ ۱۲۲ میں عمل کیا ہے ان کے علاوہ دیکھو حمید النسا بنام ظہیر الدین ۱۸۹۰ء کلکتہ جلد ۱۷ صفحہ ۶۷۰ دیکھو شرع محمدی (مولفہ سید امیر علی) جلد ۲ صفحہ ۴۹۴ (مطبوعہ انگریزی) جہاں ان مقدمات کے فیصلوں کی تنقیح کی گئی ہے۔

زوجہ کا حق مہر شوہر کی جائداد پر ایک قسم کا دین ہے اور اس کو شوہر کے وصایا اور دوسرے ورثا کے حقوق پر ترجیح ہے لیکن شوہر کی کسی خاص جائداد پر زوجہ کو حق کفالت حاصل نہیں ہے اور اگر زوجہ بادعائے مہر شوہر کی جائداد پر فی الواقع قبضہ کرلے تو اس پر وہ اس وقت تک قابض رہ سکتی ہے جب تک کہ اُس کا مہر ادا نہ ہوجائے لیکن ایسی صورت میں زوجہ شوہر کے دوسرے ورثا کو جائداد مقبوضہ کی نسبت حساب سمجھانے کے لئے ذمہ دار ہے[1]۔

جو حق کفالت مسلمہ زوجہ کو شوہر متوفی کی جائداد پر بصورت عدم ادائی مہر حاصل ہوتا ہے وہ بالکل ایک قسم کا شخصی حق ہے اور اس کے بعد اس کے ورثا کو نہیں پہنچتا حالانکہ حق مہر توریثاً ان کو منتقل ہوتا ہے۔ جس صورت میں زوجہ بر بنائے مہر شوہر کی جائداد پر قابض ہوجاتی ہے وہ اس کو رہن کرنے کی مجاز نہیں ہے[2]۔

اگر زوجہ اپنے مہر کے معاوضہ میں شوہر متوفی کی کسی جائداد پر قبضہ کرلے تو شوہر کے دوسرے ورثا اس عذر کی بنا پر کہ جائداد کے استعمال اور اُس کی پیداوار کے تصرف سے زوجہ نے اپنا مہر پالیا ہے زوجہ کے خلاف تخلیہ کی نالش کرسکتے ہیں۔

الہ آباد کے ہائی کورٹ نے طے کیا ہے کہ ایسی مسلمان بیوہ کی حیثیت جو اپنے دین مہر کے عوض شوہر متوفی کی جائداد پر فی الواقع قابض ہوجاتی ہے مرتہن کی ہے[3]۔

لیکن ایک مقدمہ میں جب کہ شوہر نے اپنی جائداد کو دین مہر کی ادائی کے لئے مخصوص نہیں کیا تھا لیکن شوہر کی وفات کے بعد زوجہ نے دین مہر کی بنا پر اس جائداد پر قبضہ کرلیا اور مرتہن نے رہن کی ڈگری حاصل کرکے بصیغۂ تعمیل

---

[1] مسماۃ بی بی بچن بنام شیخ حامد حسین ۱۸۷۱ء مورز انڈین اپیلز جلد ۱۴ صفحہ ۳۹۸ - دیکھو امانت النسا بنام بشیر النسا ۱۸۹۴ء الہ آباد جلد ۱۷ صفحہ ۷۷ - محمد کریم اللہ خاں بنام امانی بیگم ۱۸۹۵ء الہ آباد جلد ۱۷ صفحہ ۹۳ -

[2] ہادی علی بنام اکبر علی ۱۸۹۸ء الہ آباد جلد ۲۰ صفحہ ۹۱ -

[3] چھوٹی بی بی بنام شمس النسا بی بی ۱۸۹۴ء الہ آباد جلد ۱۷ صفحہ ۱۹ -

اُس کو نیلام کرایا اور ایک دوسرے شخص نے اُس جائداد کو خرید لیا تو مدراس ہائی کورٹ نے طے کیا کہ جائداد پر قبضہ کر لینے سے بیوہ کو اُس جائداد پر کوئی حق نہیں پیدا ہوا[1]۔

شوہر متوفی کی جائداد پر بمعاوضۂ مہر زوجہ کے قبضہ کر لینے سے وہ شوہر کے دوسرے ورثاء پر مہر کا دعویٰ کرنے سے محروم نہیں ہوسکتی ہے لیکن اگر زوجہ شوہر کی جائداد پر قابض ہونے کے بعد اُس کے دوسرے ورثاء پر اپنے مہر کے پانے کے لیے نالش کرے تو اُس کو جائداد مقبوضہ کی آمدنی کا حساب جیساکہ رقم کرایہ، مالگذاری یا اُس جائداد کا کسی اور قسم کا منافع جو اُس کو اُس کے زمانۂ قبضہ میں ملا ہے بتلانا ضرور ہے[2]۔

عروض تمادی جب طرفین میں سے کوئی ایک مرجائے یا طلاق واقع ہو تو مہر موجل کے خلاف اس وقت تک تمادی عارض نہیں ہوتی جب تک ایسا مہر قابل ادائی نہ ہو۔ لیکن مہر معجل "ایسا دین ہے جو نکاح کی حالت میں ہر وقت قابل ادائی ہے اور اس کا ہر وقت مطالبہ کیا جاسکتا ہے"۔ اگر زوجہ صاف الفاظ میں اور صریح طور پر شوہر سے مہر معجل کی ادائی کی طالب ہو اور شوہر اس کے دینے سے انکار کرے تو زوجہ کو حق نالش پیدا ہو جاتا ہے اور تاریخ انکار سے میعاد سماعت شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر زوجہ کی جانب سے مہر معجل پانے کا صریح مطالبہ کیا جائے تو میعادِ سماعت کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زوجہ کو شوہر کی زندگی میں مہر طلب کرنے کا اختیار حاصل ہے اور جب چاہے وہ طلب کرسکتی ہے[3]۔

---

[1] امیر اٹل بنام لنکرانارائن چیٹی ۱۹۰۱ء مدراس جلد ۲۸ صفحہ ۶۵۸۔
[2] غلام علی بنام صغیر النسا ۱۹۰۱ء الہ آباد جلد ۲۳ صفحہ ۴۳۲۔
[3] حضور النسا بنام سیف اللہ خاں ۱۸۷۵ء بنگال لارپورٹ اپیل کیسیز جلد ۱۵ صفحہ ۳۰۵ دیکھو نیز خضر النسا بنام رئیس النسا ۱۸۷۰ء بنگال لارپورٹ جلد ۵ صفحہ ۸۴ اس مقدمہ میں میعاد عارض ہوگئی تھی۔ امیر النسا بنام مراد النسا مورز انڈین اپیلز جلد ۶ صفحہ ۲۶۱۔

ایکٹ ۵ ا ۱۸۷۷ء (جدول ۲ مدات ۱۰۳ و ۱۰۴) کی رو سے مہر معجل اور مہر موجل کے متعلق میعاد سماعت معین کی گئی ہے۔

باب ششم

فسخ عقدِ نکاح

پہلی فصل

مشاہدات عام

طرفین کا معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنیکا اختیار

اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک مخصوص حالات و اشکال میں طرفین کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے۔

اختیارات قاضی

متناکحین میں سے کسی ایک کی درخواست پر قاضی کو نکاح کے فسخ کرا دینے کا اختیار ہے۔ لیکن شوہر و زوجہ کو مخصوص وجوہ بیان کرنا لازم ہے۔ مثلاً زوجہ کو شوہر کے ظلم و زیادتی کی شکایت کرنی چاہئے یا یہ بیان کرنا ضرور ہے کہ شوہر نے اُس کو چھوڑ دیا ہے اور نان و نفقہ نہیں دیتا یا ایسا ہی کوئی دوسرا عذر کرنا لازم ہے اس کے علاوہ فریقین کی ناقابلیت تکمیل نکاح سے قاضی اس کے فسخ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے اور اسی طرح جو نکاح داب ناجائز یا فریب سے کیا جاتا ہے اُس کو بھی قاضی منسوخ کر سکتا ہے۔

طلاق جب شوہر کی جانب سے نکاح فسخ کیا جاتا ہے تو اُس کو طلاق کہتے ہیں۔

خلع زوجہ کی خواہش پر معاوضہ مال جو فسخ نکاح منجانب زوج کیا جاتا ہے خلع کہلاتا ہے

زوجہ کی خواہش پر اگر منجانب زوج اس شرط پر نکاح فسخ کیا جاتا ہے کہ زوجین نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حقوق سے بری کر دیا تو وہ مبارات کہلاتا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سنت جماعت اور اکثر شیعوں کے نزدیک فسخ نکاح کے لئے قاضی کا حکم ضروری نہیں ہے صرف فریقین اپنے فعل سے نکاح فسخ کر سکتے ہیں بشرطیکہ تمام ضروری شرائطِ طلاق کی تعمیل کی جائے۔

اس پر بھی قرآن مجید میں تاکید سے ہدایت کی گئی ہے کہ زن و شوہر اپنی نزاعات کو پنچوں کے سپرد کر کے اپنا تصفیہ کرا لیا کریں اور ایسے پنچ بعض شوہر کے خاندان سے اور بعض زوجہ کے خاندان سے مقرر ہوا کریں۔

پیغمبر برحق نے بھی طلاق کی مذمت فرمائی ہے حدیث شریف میں ہے کہ خدا لعنت کرتا ہے اُس شخص پر جو اپنی زوجہ کو بلا وجہ طلاق دیتا ہے۔ دوسرے مقام پر آنحضرت فرماتے ہیں کہ "افعال جائز میں سب سے زیادہ مذموم فعل طلاق ہے۔

قول معتزلی معتزلی کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک عذر کی اصلیت اور عدم اصلیت کا تصفیہ جس کی بنا پر زن و شوہر فسخ نکاح کرنا چاہتے ہوں قاضی کی جانب سے ہونا چاہیئے۔

دوسری فصل
طلاق

حنفی مذہب میں بلحاظ وقت و حالات زوجہ کے طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) احسن۔ (۲) حسن۔ (۳) بدعی۔

(۱) احسن ایسی ایک طلاق کو کہتے ہیں جو زوجہ مدخولہ کو ایسے طہر میں دی جاتی ہے جس میں اس سے وطی نہ کی گئی ہو اور اس سے رجعت نہیں کی جاتی

یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔

(۲) حسن ایسی تین طلاقوں کو کہتے ہیں جو زوجۂ مدخولہ کو ایسے تین طہروں میں (اگر زوجہ صاحب حیض ہو) دی جاتی ہے جن میں اُس سے وطی نکی گئی ہو، اور نیز ایسی ہر طلاق کو جو زوجۂ غیر مدخولہ کو دی جاتی ہے حسن کہتے ہیں اگرچہ بزمانۂ حیض دی جائے۔

(۳) بدعی ایسی تین طلاقوں کو کہتے ہیں جو بذریعۂ کلمۂ واحد دی جاتی ہیں اور ایسی ایک سے زیادہ طلاقوں کو بھی بدعی کہتے ہیں جو ایک طہر میں دی جاتی ہیں اور ایسی طلاق کو بھی کہتے ہیں جو ایسے طہر میں دی جاتی ہے جس میں مطلقہ سے وطی کی گئی ہو بدعی کہتے ہیں اور نیز ایسی ہر طلاق کو بھی جو زوجۂ مدخولہ کو بزمانۂ حیض دی جائے بدعی کہتے ہیں۔

طلاق بدعی واقع اور نافذ ہو جاتی ہے گو اس کا دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔

اگرچہ سابق میں بھی بیان کیا گیا ہے لیکن ضمناً پھر ذکر کیا جاتا ہے کہ شیعوں کے ہاں صرف انھیں دو قسم کی طلاق معتبر ہے۔

طلاق البدعت میں شوہر تین صیغوں کو ایک ہی وقت میں پڑھ سکتا

غیر مناسب طلاق

ہے خواہ زوجہ حالت طہر میں ہو کہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں عورت کی عدۃ[1] کی مدت ختم ہونے کے بعد طلاق مؤثر ہوتی ہے۔

سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک رجوع بعد طلاق جائز ہے اگر زوج نے بالفاظ صریح ایک یا دو طلاقیں دی ہوں تو زوج کو مطلقہ صاحب حیض سے تین حیض ختم ہونے سے قبل اور مطلقہ غیر صاحب حیض سے تین ماہ ختم ہونے سے قبل

---

[1] عدۃ سے مراد وہ تین مہینے ہیں جن میں زوجہ طلاق لینے کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی اور اس مدت میں اس امر کی تحقیق کی جاتی ہے کہ مطلقہ اس شخص سے جس کے نکاح میں تھی حاملہ ہوئی ہے کہ نہیں۔ طلاق البدعت کے جواز کی نسبت دیکھو فرزند حسین بنام تانو بی بی ۱۸۷۸ء کلکتہ جلد ۴ صفحہ ۵۸۸۔ حمید علی بنام امتیازن ۱۸۷۸ء الہ آباد جلد ۲ صفحہ ۷۱۔ ابراہیم بنام سید بی بی ۱۸۸۸ء مدراس جلد ۱۲ صفحہ ۶۳۔

رجوع کر لینے کا اختیار رہے۔

طلاق بائن اور طلاق رجعی

جب رجوع کا اختیار جاتا رہے تو طلاق بائن ہو جاتی ہے اور جب تک رجوع کا اختیار باقی ہے طلاق رجعی یعنے لائق منسوخی سمجھی جاتی ہے۔ رجوع یعنے طلاق کی تنسیخ صاف الفاظ میں یا صریح طور پر یا تعلقات زوجیت کے دوبارہ قائم کرنے سے ہو سکتی ہے۔

طلاق رجعی کا اثر قانونی

مکمل اور باقاعدہ طلاق واقع ہونے کے بعد طرفین دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے ہیں بجز اس کے کہ مطلقہ کسی دوسرے مرد سے باقاعدہ نکاح کر کے طلاق لے لے اور اس دوسری طلاق کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے۔

غرض و غایت قاعدۂ مذکور

چونکہ عرب میں طلاق دینے کا عام مرض پھیل گیا تھا اور مرد کثرت سے اپنی بیبیوں کو طلاق دیتے تھے اس لئے یہ قاعدہ جاری کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ایک حاسد زود رنج اور نیم وحشی قوم کے جذبۂ ناموس کو جوش میں لایا جائے اور اُس قوم کے مرد اپنی آبرو کا پاس کر کے من مانے اور کثرت سے طلاق دینے سے باز رکھے جائیں۔

سنیوں کے مذہب میں شیعوں کے مذہب سے زیادہ طلاق دینے کا اختیار ہے۔

قول سنت جماعت جواز طلاق بالکنایہ

سنت جماعت کے ہاں طلاق صریحاً بھی ہو سکتی ہے ایسے الفاظ کے ذریعہ سے طلاق دی جاتی ہے جن سے طلاق کے ارادہ کی بابت کسی قسم کا شک و شبہ نہ پایا جائے اور دوسرے مذبذب یا اشارہ کے الفاظ میں طلاق دی جاتی ہے۔ پہلی قسم کی طلاق صریح اور دوسری قسم کی طلاق بالکنایہ کہلاتی ہے[1]۔

---

[1] حمید علی بنام امتیازن کے مقدمہ میں جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے مرد نے اپنی زوجہ سے کہا کہ "اگر تو اپنے باپ کے مکان کو میری اجازت کے بغیر جائے تو میری چچیری بہن ہے"

مثلاً اگر زوج زوجہ سے یہ کہدے کہ میں نے تجھے چھوڑ دیا تو اگر ایسا کہنے سے زوج کی نیت طلاق دینے کی ہو تو زوجہ پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

مرد چاہے الفاظ کسی قسم کے استعمال کرے لیکن اس کی طرز گفتگو سے اس امر کی صراحت ہونی لازم ہے کہ جو الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے ان سے ایک مخصوص شخص مراد ہے یعنے مرد کی گفتگو سننے سے حاضرین سمجھ جائیں کہ شوہر کا روئے سخن زوجہ کی جانب ہے[1]۔

شیعوں کا قول عدم جواز طلاق بالکنایہ

شیعوں کے نزدیک جو طلاق اشارے کنایہ یا ذومعنی یا مذبذب الفاظ میں دی جائے وہ صحیح نہیں ہے خواہ اس طرح کے الفاظ کہنے سے شوہر کا ارادہ پایا جاتا ہو کہ نہ ہو اور نہ اس طرح کی طلاق جو کسی شرط پر مبنی ہو اُن کے ہاں جائز ہے۔

عدم ضرورت حضوری زوجہ

سنی اور شیعہ (بجز بعض علمائے شیعۂ اصولی) اس امر پر متفق ہیں کہ زوجہ کی حضوری و موجودگی میں مرد کو طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب تک زوجہ کو طلاق کا علم نہ ہو وہ نفقہ پانے کی مستحق ہے۔

تیسری فصل

قابلیت طلاق

شیعوں کے مذہب میں جواز طلاق کی چار شرطیں ہیں۔ (۱) شوہر کا حدِ بلوغ کو پہنچنا (۲) شوہر کا صحیح العقل والرشد یعنے عاقل اور صاحب رشد ہونا،

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ عدالت نے صرف اس قدر کہنے کو طلاق جاری ہونے کے لئے کافی قرار دیا۔ چونکہ چچازاد ہمشیر محرمات شرعیہ میں داخل نہیں ہے لہذا اس فیصلہ کی صحت قابل اعتراض ہے۔

[1] فرزند حسین بنام جانو بی بی جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

مذہب شیعہ۔ شرائط جواز طلاق

(۳) شوہر کا طلاق کو برضا و رغبت خود اور کسی دوسرے کے جبر و اکراہ کے بغیر جاری کرنا، (۴) طلاق دینے کے لئے شوہر کا ارادۂ صریح رکھنا۔

جو طلاق حالت جبر میں دی جائے وہ شیعوں کے مذہب میں ناجائز اور غیر موثر ہے۔ اسی طرح مکر و فریب یا داب ناجائز سے اگر طلاق دی جائے تو شیعہ اس کو بھی ناجائز خیال کرتے ہیں۔ ہر ایک قسم کی طلاق کے جائز ہونے کے لئے نیت (اور ارادہ) ضروری شئے ہے۔

جو طلاق حالت نشہ میں دی جائے یا ایسی حالت میں جبکہ مرد کا دماغ کسی خواب آور دوا کے اثر سے مختل ہو گیا ہو یا کسی وجہ سے جبکہ شوہر کی حقیقت میں نیت نہ ہو اور وہ طلاق دے دے تو اس طرح کی طلاق جائز نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس غلطی، بے پروائی اور غصہ کی حالت میں یا ہنسی مذاق کی غرض سے یا نیند میں مرد طلاق کے الفاظ کہدے تو وہ طلاق جائز نہیں ہے۔

اقوال سنت جماعت

حنفیہ کے نزدیک جو طلاق کسی بالغ و عاقل شوہر نے دی ہو شرعاً موثر ہے خواہ وہ آزاد ہو کہ غلام اور خواہ اپنی رضا و رغبت سے خواہ دوسروں کے جبر و تعدی سے یا خواہ دل لگی اور غلطی سے ہی یا حنفی مذہب کے مطابق اگر شوہر حالت نشہ میں طلاق دے حالانکہ خمر یا ایسی منشی دوا اُس کے خلاف مرضی ہی اُس کو پلائی گئی ہو یا بطور علاج اُس نے خود پی ہو طلاق جائز ہے۔

ابراہیم ملا بنام عنایت الرحمٰن[۱] کے مقدمہ میں ہائی کورٹ کلکتہ نے تجویز کی ہے کہ "طلاق جو حالت جبر میں دی جائے وہ موثر ہے" بہرحال جو اصول کہ اس فیصلہ میں طے کیا گیا ہے اس کا تعلق محض فرقۂ حنفیہ سے ہے۔

سنت جماعت کے کل علما اس امر پر متفق ہیں کہ نابالغ شوہر کا گو وہ صاحب رشد ہی کیوں نہ ہو طلاق دینا غیر موثر ہے۔

---

[۱] ۱۸۶۹ء بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۴ صفحہ ۱۳ دیکھو ویکلی رپورٹر۔ جلد ۱۲ ص ۴۶۰

شیعوں کے نزدیک صیغۂ طلاق جاری کرنے کے وقت دو معتبر گواہوں کا

مذہب شیعہ ضرورتِ شہادت موجود رہنا ضرور ہے۔ اس کے علاوہ دونوں گواہوں کا وقت واحد میں حاضر رہنا لازم ہے۔

سنیوں کا قول اس کے برعکس سنت جماعت کے یہاں گواہوں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

شیعوں کے مذہب میں ایسی طلاق جو حالت غیظ وغضب میں جبکہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا ہے جاری کی جائے ناجائز ہے۔ مگر سنی اس طرح کی طلاق کو جائز سمجھتے ہیں۔

لیکن فریقین کے نزدیک یعنے سنی اور شیعوں میں طلاق پڑھتے وقت زوجہ کی حاضری کی ضرورت نہیں ہے اور شوہر جب طلاق نامہ پر بعدم موجودگی زوجہ دستخط کر کے اُس کی تکمیل کرتا ہے وہ جائز اور صحیح سمجھا جاتا ہے[۱]۔

طلاق بذریعہ تفویض بوقت نکاح زوجہ شوہر سے یہ امر طے کرا سکتی ہے کہ اُن شرائط کی عدم تکمیل یا خلاف ورزی کی صورت میں جو قبل نکاح طے ہوتے ہیں شوہر کو طلاق دینے کے لئے مجبور کر سکے گی اور شوہر اپنے اس اختیار طلاق کو زوجہ کے سپرد کرنے کا مجاز ہے۔ زوجہ کو طلاق لینے کا اختیار جو اس طرح حاصل ہوتا ہے اُس کو شرع محمدی میں تفویض کہتے ہیں[۲]۔

جو طلاق مرض الموت میں دی جاتی ہے یعنے شوہر اپنے مرنے کے قبل اور حالت بیماری میں زوجہ کو طلاق دے تو اس کے مرنے کے بعد زوجہ اُس کی

---

[۱] واج بی بی بنام عظمت علی سنہ ۱۸۹۶ء ویکلی رپورٹر جلد ۸ صفحہ ۲۳ سارا بائی بنام رابعہ بی بی سنہ ۱۹۰۵ء بمبئی جلد ۳۰ صفحہ ۵۳۷۔

[۲] اشرف علی بنام ارشد علی سنہ ۱۸۷۱ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۶ صفحہ ۲۶۰۔ بدرالنسا بی بی بنام مقیت اللہ سنہ ۱۸۷۱ء بنگال لا رپورٹس جلد ۷ صفحہ ۴۴۲ دیکھو ویکلی رپورٹر جلد ۱۵ صفحہ ۵۵۵۔ اس کے علاوہ دیکھو بونو بی بی بنام فیض بخش سنہ ۱۸۷۵ء بنگال لا رپورٹس جلد ۱۵ ضمیمہ ۵ اور حمید اللہ بنام فیض النسا سنہ ۱۸۸۲ء کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۳۲۷۔

جائداد میں میراث پانے کی مستحق ہے لیکن اگر مرد حالت ''صحت'' میں طلاق دے اور زوجہ کے زمانۂ عدۃ میں فوت ہو جائے تو صورت بدل جاتی ہے یعنی زوجہ متروکۂ شوہر سے حصہ نہیں پا سکتی[1]۔

فصل چوتھی

خلع و مبارات

اگر زوجہ کی جانب سے طلاق لینے کی تحریک ہو تو اس کو اپنے مہر معین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا پڑتا ہے ورنہ اس کے عوض فسخ نکاح کے لئے اپنی کوئی دوسری جائداد شوہر کو دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایسی طلاق خلع کہلاتی ہے لیکن زوجہ کا اختیارِ خلع محدود ہے یعنے شوہر کی مرضی پر منحصر ہے اگر شوہر خلع دینے راضی نہ ہو تو زوجہ اس کو مجبور نہیں کر سکتی بر ایں ہم معقول[2] وجوہ کی صورت میں قاضی شوہر کو مجبور کر کے خلع دلوا سکتا ہے۔

مبارات — جب ناموافقت مزاج یا کسی اور وجہ سے طرفین فسخ نکاح کے لئے راضی ہو جائیں تو ایسی طلاق مبارات کہلاتی ہے۔

مبارات کے معنی فسخ نکاح بتراضی طرفین ہیں سینوں کی شرع میں زوجین کو مبارات کر لینے سے تمام حقوق زوجیت ایک دوسرے کے مقابلہ میں یک لخت منقطع ہو جاتے ہیں۔

---

[1] سارا بائی بنام رابعہ بی بی جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

[2] ہائی کورٹ مدراس نے ایسے خلع کو جو حالت جبر میں دیا جائے جائز قرار دیا ہے۔ ودا کے وٹل اسمال بنام اوا کل بیا کٹی امان ۱۸۸۱ء مدراس جلد ۳ صفحہ ۳۴۷۔ لیکن یہ تصفیہ بہر نوع قابل اعتراض ہے۔ ل جند بنام نظر علی چودھری ۱۹۰۸ء کلکتہ جلد ۳۶ صفحہ ۱۸۴ حیات النسا بی بی بنام کرم علی ۱۹۰۸ء کلکتہ جلد ۳۶ صفحہ ۲۳ نور الدین بنام مساۃ چانوری ۱۹۰۸ء کلکتہ لا جرنل جلد ۳ صفحہ ۴۹۔

جو شرائط کہ جواز خلع اور طلاق کے واسطے لازم ہیں مبارات میں بھی انھیں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

زوجہ کی جانب سے جب اس طرح کی درخواست پیش ہو کہ شوہر کی خلقی ناقابلیت یا نکاح کے بعد عضو مخصوص کی بریدگی کے سبب سے تکمیل نکاح کے قابل نہیں رہا ہے تو قاضی کو فسخ نکاح کے حکم دینے کا اختیار ہے۔

جب کوئی شخص خلقتًا نامرد ہو اور اس کی زوجہ کی جانب سے فسخ نکاح کی درخواست پیش ہو تو جج تصفیہ کو ایک سال کے واسطے ملتوی کر کے شوہر کو تکمیل نکاح کا موقع دیتا ہے اور اس طرح جج شوہر کی مردمی کی تحقیق کر لیتا ہے۔

اگر اس مدت میں نکاح کی تکمیل نہ ہو تو زوجہ فسخ نکاح کی ڈگری پانے کی مستحق قرار پاتی ہے۔ شرع کی کتابوں میں تکمیل نکاح کے ثبوت کے متعلق بعض مخصوص طریقے مقرر ہیں لیکن یہ ضابطہ کے چند قواعد ہیں اور ان کا قانون اصلی یعنے شرع محمدیؐ سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ان کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

جب زوجہ کی جانب سے فسخ نکاح کی نالش پیش ہو تو زوجہ دوران مقدمہ میں گذارہ پانے کی مستحق ہے اور نہ شوہر زوجہ کا خرچۂ مقدمہ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن انگلستان کا قانون اس کے برعکس ہے[1]۔

اگر دعویٰ پیش ہونے کے قبل طرفین میں خلوت صحیحہ[2] واقع ہو جائے تو حنفی شرع کی رو سے زوجہ پورا مہر پانے کی مستحق ہے ورنہ اس کو صرف نصف مہر ملتا ہے۔

لیکن شیعوں کے مذہب میں اگر شوہر کی نامردی کے سبب سے زوجہ طلاق لے لے تو اُس کو صرف نصف مہر ملتا ہے اور خلوت صحیحہ یا غیر صحیحہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔

امام شافعی کے نزدیک اگر نکاح کے پہلے سے فریقین میں سے کوئی ایک

---

[1] الف بنام ب سنہ ۱۹۸۶ء بمبئی جلد ۲۱ صفحہ ۷۷۔

[2] دیکھو ما سبق صفحہ ۱۰۸

مرض جنون یا جذام یا کسی لاعلاج اور معیوب بیماری میں مبتلا ہو یا زوجہ ہم بستری[1] کی مطلق قابلیت نہ رکھتی ہو بشرطیکہ فریق مستدعی چارہ کار ان امور سے قبل نکاح بالکل لاعلم اور ناواقف رہا ہو تو جج ان صورتوں میں فسخ نکاح کا حکم دے سکتا ہے۔ زوجہ کو چھوڑ دینے اور اس کی پرورش نہ کرنے یا اس کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آنے کا عادی ہونے سے اور استطاعت رکھنے کے باوجود نفقہ نہ دینے سے اور جب منجانب قاضی یا حاکم شرع ان امور کے متعلق دریافت کیا جائے تو شوہر کے متمردانہ انکار سے جج کو فسخ نکاح کے حکم صادر کرنے کا اختیار رہتا ہے۔

فصل پانچویں

متفرق اصول

عدۃ — سابق میں بیان کیا گیا ہے کہ شرع محمدی میں زوجہ کو فسخ نکاح کے بعد کچھ مدت کے لئے ایک خاص حالت میں بسر کرنی پڑتی ہے جس کو اصطلاح میں عدۃ کہتے ہیں اور اُس کی غرض زوجہ کی حالت حمل دریافت کرنی ہے۔

بیوہ کے لئے چار مہینے اور دس دن عدۃ کا زمانہ ہے لیکن مطلقہ یا ایسی عورت کے واسطے جس کا نکاح جج کے حکم سے فسخ ہو مدتِ عدۃ تین حیض ہے۔

اس مدت میں عورت کسی دوسرے شخص سے نیا عقد نہیں کر سکتی۔ جب شوہر کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو اور زوجہ کی تحریک یا معاوضہ کے بغیر

---

[1] اس امر میں امام شافعی کے اقوال زیادہ معقول اور بکار آمد ہیں امام محمدؒ کو بھی ان اقوال سے اتفاق ہے اور موجودہ زمانہ میں حنفی قاضیوں کے حق میں یہ شمع ہدایت کا کام کرتے ہیں جن کی وجہ تصفیۂ مقدمات میں عمدہ اصول ان قاضیوں کے ہاتھ آ گئے ہیں۔

یعنے مبارات نہیں بلکہ اپنی خوشی سے زوجہ کو طلاق دے اور اس کے عدۃ کے دن ختم ہونے کے پہلے مرجائے تو زوجہ شوہر کی میراث میں حصہ پانے کی مستحق ہے۔ لیکن اگر مطلقہ عورت عدۃ کے دن پورے ہونے کے پہلے مرجائے تو شوہر اُس کی میراث میں حصہ پانے کا مستحق نہیں ہے۔

دعویٰ استرداد حقوق زوجیت

شرع محمدی میں حقوق زوجیت[1] کے استرداد کے متعلق دعویٰ کرنا جائز رکھا گیا ہے اور قاضی اُس فریق کو جو تعلقات ہم بستری[2] سے انکار کرتا ہے مجبور کرے کہ اس طرح کے تعلقات کو بحال وجاری کرانے کا مجاز ہے۔

جب شوہر استرداد حقوق زوجیت یعنے طلب زوجہ کا دعویٰ کرے تو زوجہ جواب دہی میں ذیل کے عذرات پیش کرنے کی مجاز ہے شوہر نے مہر یا اُس کا ایسا حصہ جو معجل ہے نہیں ادا کیا ہے یا زوجہ نے خیار البلوغ[3] پر عمل کرکے عقد نکاح کو توڑ دیا ہے۔

لعان کی کارروائی

جب باپ کسی طفل کی ولدیت سے جو اس کی زوجہ کے بطن سے پیدا ہوا انکار کرے تو شرع محمدی میں زوجہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قاضی کے سامنے جاکر شوہر کے انکار کی اس طریقہ سے جو لعان کہلاتا ہے تردید کرے۔ جو ضابطہ اور کارروائی لعان کے متعلق کتب فقہ میں مندرج ہے وہ محض ایک قسم کا ضابطہ ہے اور اُس کو قانون اصلی سے کوئی تعلق نہیں لہذا جن قواعد کا تعلق اس ضابطہ سے ہے اُن کو نظرانداز کیا گیا ہے۔

برٹش انڈیا کی عدالتوں میں جن قوانین نافذہ پر عمل ہوتا ہے اُن کی رو سے ہندوستان میں زوجہ کو لعان کی کارروائی کے بجائے بمقابلہ شوہر

---

[1] منشی بذل الرحیم بنام شمس النسا بیگم ۱۸۶۷ء ۶ مورز انڈین اپیلز جلد ۱۱ صفحہ ۵۵۱۔

[2] دیکھو ماسبق صفحہ ۹۴ اور صفحہ ۱۰۹۔

[3] دیکھو بتول عورت بنام ملکہ قیصرہ جس کا حوالہ سابق میں آچکا ہے۔ حسینی بیگم بنام رستم علی خاں الہ آباد جلد ۲۹ صفحہ ۲۸۲۔

اولاد کی صحت نسب کا دعویٰ کسی مختص المقام عدالت میں پیش کرنا چاہیئے۔

ساتواں باب

حیثیت نابالغی

پہلی فصل۔ حد بلوغ

حدِّ بلوغ

شرع محمدی میں بلوغ کی دو جداگانہ مدتیں مقرر ہیں۔ ایک مدت کا تعلق نابالغوں کی آزادی ذات سے ہے جبکہ وہ اختیار پدری کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور دوسری مدت اُن کے انتظام جائداد سے متعلق ہے جبکہ وہ بلوغ کو پہنچ کر اپنی جائداد کا انتظام کرنے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔

قیاس بلوغ

شرع میں ان دونوں مدتوں کے علحدہ علحدہ نام مقرر ہیں۔ سن بلوغ اور سن رشد۔ حنفی اور شیعہ مذہب میں پندرھویں سال کے اختتام پر لڑکا بالغ ہو جاتا ہے لیکن مالکیہ کے نزدیک اٹھارہ سال حد بلوغ ہے۔

چونکہ حنفی اور شیعوں میں بلوغ اور رشد ایک وقت میں شروع ہوتے ہیں اس لئے نابالغوں کی آزادی ذات سے جوان کو پندرہ سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے وہ اپنے مال و جائداد کے انتظام کرنے کے لئے اپنے اولیا کی قید اختیار سے آزاد ہو جاتے ہیں لہٰذا حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد نابالغ اپنی جائداد کا انتظام کرنے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

جو اصول کہ ان دو مختلف اور ایک ہی وقت شروع ہونے والی مدتوں میں شرعاً قائم کیا گیا ہے اس کا سرکار ہند نے قانون بلوغ برائے ہند (ایکٹ ۹ ۱۸۷۵ء) میں لحاظ رکھا ہے۔ اس قانون کی دوسری فصل فقرۂ (الف)

میں لکھا ہے کہ "ایکٹ ہذا کا کوئی مضمون کسی شخص کی کارروائی کرنے کی قابلیت میں بمقدمات ذیل موثر ہو گا یعنے مناکحت - مہر - طلاق اور تبنیت۔

اور دفعہ ۳ میں لکھا ہے کہ بپابندی امور مذکورۂ بالا ہر ایسا نابالغ جو کسی عدالت کی زیر نگرانی ہے خواہ ایکٹ ۸ سنہ ۱۸۹۰ء خواہ ایکٹ کورٹ آف وارڈز کی روسے اُس پر نگرانی قائم کی گئی ہو اٹھارہواں سال ختم ہونے پر" اور نہ اس کے پہلے" خواہ وہ مرد ہو کہ عورت بالغ سمجھا جائے گا۔

مگر ہر ایسا نابالغ جس کی ذات یا جائداد کے لئے منجانب عدالت کوئی ولی مقرر کیا گیا ہو یا نابالغ اور اس کی جائداد کورٹ آف وارڈز کے زیر نگرانی ہو اپنی عمر کے اکیسویں سال کے ختم کرنے پر اور نہ اس کے پہلے[ا] بالغ سمجھا جائے گا۔"

دوسری فصل

ولایت یا اتالیقی

ولایت امور ذیل پر مشتمل ہے:-

(۱) نابالغ کی ذات کے متعلق انتظام کرنا یا اُس کی حفاظت و پرورش۔ یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ایک ہی شخص کو حقوق حضانت و ولایت حاصل ہوتے ہیں۔

(۲) نابالغ کی ذات کی سرسری نگرانی جبکہ حضانت دوسرے شخص کو حاصل ہو۔

(۳) نابالغ کی جائداد کا انتظام اور حفاظت۔

اولیا کی تین قسمیں ہیں یعنے (الف) قدرتی، (ب) وصیتی اور (ج) مقرری ولی۔ پہلا اور قدرتی ولی باپ ہے حنفیہ کے

باپ کا قدرتی ولی ہونا

[ا] جگن رام مارواڑی بنام مہادیو پرشاد ساہو سنہ ۱۹۰۹ء کلکتہ جلد ۳۶ صفحہ ۷۶۸۔

مذہب میں باپ کے مرنے کے بعد اس کی نابالغ اولاد کی ولایت اس کے وصی سے متعلق ہو جاتی ہے اور اگر باپ کسی کو اپنا وصی مقرر کئے بغیر مر جائے اور دادا زندہ رہے تو متوفی کے نابالغ اطفال کا دادا ولی ہوگا اور اگر دادا بھی موجود نہو تو دادا کے وصی سے اُن نابالغ بچوں کی ولایت متعلق ہوگی۔

شیعوں میں اگر دادا موجود ہو تو ولایت میں اس کو باپ کے وصی پر ترجیح دیجاتی ہے۔

جب قدرتی اور وصیتی ولی دونوں موجود نہوں یعنے باپ اور اس کا وصی اور دادا اور اس کا وصی موجود نرہیں تو نابالغ کے مال کی حفاظت و انتظام کے لئے کسی ولی یا امین کا مقرر کرنا شرعاً قاضی سے متعلق ہو جاتا ہے اور یہ اس حیثیت سے کہ قاضی یا جج حکومت یا سلطان وقت کا نائب و قائم مقام ہے۔

حنفیہ میں اگر کوئی شخص پدر متوفی کے اقربائے ذکور میں ولی مقرر کئے جانے کے اوصاف سے بخوبی متصف ہو تو اس کے نابالغوں کی ولایت اس شخص کے سپرد کی جاتی ہے اور ایسے قرابتدار کو کسی دوسرے غیر شخص پر ترجیح دی جاتی ہے مگر باپ اور دادا کے سوائے کوئی دوسرا عزیز نابالغ کی جائداد میں دست اندازی کرنے کا شرعاً مجاز نہیں ہے بجز اس کے کہ قاضی نے اس کو ولی مقرر کیا ہو۔

باپ کے اختیارات باپ کو اپنی نابالغ اولاد کی ولایت اور اُن کے حقوق کی حفاظت کے متعلق ہر ایک قسم کا انتظام کرنے کا حق حاصل ہے اور بذریعۂ وصیت اپنے مرنے کے بعد اُس انتظام کو قائم کرا سکتا ہے۔

ماں ماں صرف نابالغ بچوں کی حراست یعنے ولایت ذات[1] کی مستحق ہے لیکن اس کو ان کی ولایت جائداد کے متعلق کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہے۔

---

[1] دیکھو سیتارام بنام امیر بیگم سنہ ۱۸۹۶ء الہ آباد جلد ۸ صفحہ ۳۲۴- بابا بنام شیوپا سنہ ۱۸۹۵ء بمبئی جلد ۲۰ صفحہ ۱۹۹ فاطمہ بی بنام وٹل اماچابی سنہ ۱۹۰۲ء مدراس جلد ۲۶ صفحہ ۷۳۴-

اگر قاضی یا باپ کی اجازت کے بغیر ماں نابالغ اولاد کی جائداد میں دخل دے تو اُس کی کارروائی ایک شخص فضولی یعنے شخص غیر مجاز کی کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ماں کے سوائے نابالغ کے دوسرے اعزا مثلاً بھائی بہن اور چچا بھی نابالغ کی جائداد کی ولایت کے مستحق نہیں ہیں[1]۔

ہائی کورٹ کلکتہ نے طے کردیا ہے کہ شرع محمدی میں ماں اپنی نابالغ اولاد کی ازروئے واقعہ یعنے بلا استقرار عدالت اور اپنے تسلط سے ولیہ نہیں بن سکتی ہے۔ اس لئے کوئی ماں جس کو ڈسٹرکٹ جج نے ولیہ مقرر نہ کیا ہو اپنی نابالغ اولاد کی جائداد کو رہن یا کسی اور طریقہ سے منتقل کرنے کی مجاز نہیں ہے اور اگر اس طرح کا کوئی معاملہ اُس کی جانب سے کیا جائے تو وہ قانوناً کالعدم سمجھا جاتا ہے[2] اس کے برعکس ہائی کورٹ الہ آباد نے ماں کی نسبت طے کیا ہے کہ اگر ماں نابالغ کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے نابالغ کی جائداد کے ساتھ بحیثیت ولیہ ازروئے واقعہ کوئی معاملہ کرے یعنے جائداد کو رہن و منتقل کردے تو نابالغ پر بعد بلوغ اس معاملہ کی پابندی لازم ہے[3]۔

لیکن مقدمۂ متذکرۂ بالا کے بعد دو مقدموں میں ہائی کورٹ کلکتہ نے ماں کے دو معاملات کو جو اس نے اپنے نابالغ کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اس کی جائداد کے ساتھ کئے تھے جائز قرار دیا ہے۔

چونکہ مسلمانوں کے قانون میں ولی ازروئے واقعہ یعنے ولی مسلط تسلیم نہیں کیا جاتا ہے اس لئے ایسا شخص جو شرعاً نابالغ کی جائداد کا

---

[1] بھوت ناتھ بنام احمد حسین ۱۸۸۵ء کلکتہ جلد ۱۱ صفحہ ۴۱۷۔ مسماۃ بخشن بنام مسماۃ دلہن ۱۸۶۹ء ویکلی رپورٹر جلد ۱۲ صفحہ ۳۳۷۔ حسینی بیگم بنام ضیاء النسا بیگم ۱۸۸۲ء بمبئی جلد ۶ صفحہ ۴۶۷۔ نظام الدین شاہی بنام انند پرشاد ۱۸۹۶ء الہ آباد جلد ۱۸ صفحہ ۳۷۳۔

[2] مہنا بی بی بنام بنکو بہاری بسواس ۱۹۰۲ء کلکتہ جلد ۲۹ صفحہ ۴۷۳۔

[3] مجیدن بنام رام نارائن ۱۹۰۳ء الہ آباد جلد ۲۶ صفحہ ۲۲۔

ولی نہ ہو سکتا ہو اگر عدالت کی اجازت کے بغیر نابالغ کی جائداد میں دست اندازی کرے تو وہ شخص فضولی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن علماء کا میلان اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ اگر ایسے ولی نے نابالغ کی جائداد کے ساتھ نابالغ کے فائدہ کے واسطے کوئی معاملہ کیا ہے تو اس کا تصفیہ جج کے اختیار تمیزی پر منحصر رہتا ہے لیکن اگر ولی مسلط کسی ضرورت سے نابالغ کی جائداد کو منتقل کرے یا کسی اور طرح سے اس میں دست اندازی کرے تو وہ اس استثنا سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

ماں مسلمہ ہو کہ غیر مسلمہ شرعاً باپ کی وصی مقرر ہو سکتی ہے اور جب ماں اس طرح وصیہ مقرر کی جائے تو اس کو وہ تمام حقوق و امتیازات حاصل ہو جاتے ہیں جو قانوناً اولیائے وصیتی کو ملا کرتے ہیں۔

ولی وصیتی

ان کل امور میں جن کا تعلق نابالغوں کی صلاح و فلاح اور ان کی حفاظت و حمایت اور ان کی جائداد کے تحفظ سے ہے ولی وصیتی والد کا قائم مقام متصور ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں خصوصاً جبکہ وصی کا تقرر عام اغراض کے واسطے کیا جاتا ہے تو باپ یا دادا کا وصی اس امانت کو جو اس کے تفویض ہوئی ہے اپنے وصی کے سپرد کر سکتا ہے۔

اختیار ولی بنسبت بیع

ولی شرعی نابالغ کی جائداد منقولہ کو بمعاوضۂ معقول فروخت کرنے کا مجاز ہے اور جو رقم کہ اس بیع سے حاصل ہوتی ہے اس کو کسی "نفع بخش تجارت یا معاملہ" میں نابالغ کے فائدے کے لئے لگا سکتا ہے۔

(الف) ولی کو کسی حالت میں بھی نابالغ کی جائداد غیر منقولہ کو اپنے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہے اور نہ اپنے متعلقین میں سے

---

[۱] افضل حسین بنام باسط شیخ ۱۹۰۷ء کلکتہ جلد ۳۴ صفحہ ۳۶ - رام چرن سین یال بنام انوکل چندر اچاریہ جلد ندکور صفحہ ۶۵۔

کسی کے ہاتھ بیع کر سکتا ہے۔

(ب) لیکن ولی ایسی جائداد کو دو چند قیمت پر کسی غیر کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے یا اس وقت فروخت کر سکتا ہے جبکہ نابالغ کا فائدہ متصور ہو۔

(دفعہ ۱۳۱ ایکٹ ۸ سنہ ۱۸۹۰ء میں الفاظ "نفع بیّن" استعمال ہوئے ہیں)

(ج) ولی جائداد مذکورہ کو اس وقت بھی فروخت کر سکتا ہے جبکہ موصی کی وصیت میں چند ایسے شرائط مرقوم ہوں جن کی تعمیل اس جائداد کو فروخت کرنے کے بغیر نہ ہو سکتی ہو۔

(د) ولی اس حالت میں بھی نابالغ کی جائداد فروخت کر سکتا ہے جبکہ موصی کا قرضہ واجب الادا ہو اور اس جائداد کو بیع کرنے کے بغیر کسی اور طریقہ سے قرضۂ مذکور نہ ادا ہو سکتا ہو۔

(ھ) ولی اس وقت بھی جائداد غیر منقولہ کو فروخت کر سکتا ہے جبکہ اس کی آمدنی اس کے مصارف انتظام یا خراج (مالگزاری جو رعایا بمعاوضۂ اراضی سرکار کو ادا کرتی ہے) ادا کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔

(و) اس وقت بھی اس کو فروخت کر سکتا ہے جبکہ اس کے برباد اور ضائع ہونے کا سخت اندیشہ ہو۔

(ز) ولی اس صورت میں بھی ایسی جائداد کو فروخت کر سکتا ہے جبکہ نابالغ کے ہاں کوئی دوسری جائداد نہ ہو اور اس کے نفقہ (مصارف پرورش) کے واسطے اس جائداد غیر منقولہ کو فروخت کرنا نہایت ضروری ہو۔

(ح) ولی اس وقت بھی جائداد غیر منقولہ کو فروخت کر سکتا ہے جبکہ وہ کسی سود بیجا پر غیر کے پاس ہو اور اس کو جائداد مذکورہ کے واپس ملنے کی امید نہ ہو۔ بہر حال ولی جائز (قانونی۔شرعی) بھی مثل باپ اور اس کے وصی کے نابالغ کی جائداد غیر منقولہ کو بجز ضرورتِ خاص (ناگزیر) کے یا جس صورت میں نابالغ کا نفع بیّن ہوتا ہو فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہے[1]۔ ایک مقدمہ میں

---

[1] مقابلہ کرو ہربائی بنام ہیراجی سنہ ۱۸۹۵ء بمبئی جلد ۲۰ صفحہ ۱۱۶۔

جبکہ چند مالگذاری ادا کرنے والی اراضی کی بابت نابالغوں جن کے حصہ میں ان زمینوں کا کچھ حصہ آیا تھا اور دوسرے فریق کے درمیان اراضی مذکورہ کی ملکیت کی بابت نزاعات کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا ولی نے ایک معقول قیمت کے معاوضہ میں اراضی کے اس حصہ کو جو نابالغوں کی ملک تھی فروخت کردیا اور اس کی وجہ سے فریقین کے درمیان آئے دن کے جھگڑوں کا خاتمہ ہوکر جو زمین کہ باقی رہ گئی تھی اُس کا بندوبست کرانا بھی ممکن ہوگیا۔ عدالت نے ولی کے معاملۂ بیع کو جائز قرار دیا[1]۔ اس کے سوائے عدالت نے یہ بھی تجویز کی کہ اگرچہ بیعنامہ میں غرض بیع غلط بیان کی گئی ہے لیکن نابالغوں کی جانب سے معاملۂ بیع پر اعتراض ہونے کی صورت میں ولی کو از سرِ نو بیع کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے اور اُس کو اُن کے حق میں نفع بخش ثابت کرنے کا از سرِ نو موقع حاصل ہے۔

قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ جن شرائط و قیود سے موصی کے اختیارات محدود اور وسیع کیئے جاتے ہیں اُن ہی شرائط و قیود سے ولی وصیتی کے اختیارات بھی محدود و وسیع قرار دئے جاتے ہیں۔

ولی کے اختیارات کے متعلق شیعہ اور سنی میں عموماً اتفاق ہے۔

جو شخص نابالغ کی جائداد کا منجانب عدالت ولی مقرر ہوتا ہے یا جس کی ولایت کو عدالت منظور کرتی ہے اس کے اختیارات دفعۂ ۲۹ ایکٹ ۸ سنہ ۱۸۹۰ء کے قواعد مندرجہ کے تابع ہیں۔

اگر ولی عدالتی قانون مذکور کے دفعات ۲۸ و ۲۹ کی خلاف ورزی میں نابالغ کی جائداد غیر منقولہ منتقل کردے تو "اس شخص کی درخواست پر جس پر اس انتقال کا اثر پڑتا ہو ولی کا معاملہ انتقال جائداد قابل انفساخ قرار پا سکتا ہے" لیکن اس عبارت سے بخوبی ظاہر ہے کہ اس قسم کے چارۂ کار سے صرف نابالغ نہیں بلکہ دوسرے اشخاص بھی مستفید ہوسکتے ہیں۔

---

[1] کالی ڈٹ جھا بنام عبد العلی سنہ ۱۸۸۹ء کلکتہ جلد ۱۶ صفحہ ۶۲۷۔

تیسری فصل

نفقۂ اولاد

نفقۂ اولاد

اولاد کی نابالغی کے زمانہ میں اُن کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ اگر باپ نادار (مفلس) ہو اور دادا یا (اطفال کی ماں) مالدار ہو تو یہ فرض اُن پر عائد ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اگر باپ کے ہاں بعد میں ذرائع معاش مہیّا ہو کر وہ مالدار ہو جائے تو دادا اور ماں اس رقم کو باپ سے واپس پانے کے مستحق ہیں جو انھوں نے نابالغوں کی پرورش پر صرف کی ہے۔ جو اولاد حدِ بلوغ کو پہنچ جائے اور مریض و ناتوان نہو اُس کے نفقہ کا باپ کفیل نہیں ہے۔

اگر اولاد ذکور قابل کار یعنے محنت کے کام کرنے کے قابل اور مضبوط وقوی ہو تو باپ اُن سے کام لے کر اُن کو اُن کی بسر اوقات کے لئے اجرت دے سکتا ہے۔ لیکن باپ کا فرض ہے کہ اپنے لڑکوں سے ایسا کام نہ لے جو ان کے شایان شان نہو۔ مگر باپ اولاد اناث کو نفقہ دینے کا اُن کے نکاح تک ذمہ دار ہے۔

احکام مندرجہ مجموعۂ ضابطۂ فوجداری ہند کی رو سے بھی باپ اپنی نابالغ اولاد کی پرورش کے واسطے خواہ وہ وجہ حلال سے پیدا ہوی ہو کہ حرام سے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

خوش حال اور مالدار اولاد پر والدین کی پرورش اور ان کی رقمی اعانت و امداد واجب کی گئی ہے۔

حصۂ سوم

قانون متعلق جائداد

باب اوّل

فصل اوّل

مشاہدات عام

انتقال جائداد کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) انتقال جائداد حین حیات۔

(۲) انتقال جائداد بذریعۂ وصیت جس کا نفاذ منتقل کرنے والے کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ اگر موصی حالت مرض میں جو اصطلاحاً مرض الموت کہلاتی ہے کسی جائداد کو منتقل کردے تو شرع کی رو سے اس قسم کے انتقال کا وہی اثر ہوتا ہے جو انتقال جائداد بذریعۂ وصیت کا ہے۔

جن مخصوص انتقالات جائداد حین حیات کا ہم کو ذکر کرنا منظور ہے وہ اصل میں دو ہیں۔ ہبہ اور وقف[1]۔

فصل دوم

ہبہ

ہبہ ایک قسم کی عطا ہے اور عموماً اس کی تین قسمیں ہیں۔

---

[1] بیع امانت وغیرہ شرع محمدی کے نہیں بلکہ ہند کے قانون موضوعہ کے تابع ہیں۔

(الف) ہبہ سادہ یا ہبہ مطلق۔

(ب) ہبہ بالمعاوضہ جس میں عطا سے زیادہ تبادلہ کی شان ہوتی ہے۔

(ج) ہبہ بشرط العوض یہ ایک مشروط عطا ہے۔ عموماً واہب اس شرط کے ساتھ کہ موہوب لہٗ کسی آئندہ زمانہ میں یا باوقات مقررہ ایک مقررہ رقم یا کوئی معینہ شئے عطا کے معاوضہ میں اس کو ادا کرتا رہے۔ کسی شئے کو ہبہ کرتا ہے۔

ہبہ مطلق

(الف) ہبہ سادہ یا ہبہ مطلق ایک ایسی عطا ہے جب کہ ایک شخص دوسرے کو کسی مخصوص شئے کا خواہ وہ اپنی ذات سے موجود ہو کہ نہ ہو اپنی رضا و رغبت سے بلا معاوضہ مالک بنا دیتا ہے۔ اس طرح کی ہبہ میں نہ صرف کوئی جائداد یا مال دیا جا سکتا ہے بلکہ واہب اپنے حق وصول قرضہ کو جو زیر تصفیہ ہو دوسرے کو عطا کر سکتا ہے۔

ہبہ زبانی اور تحریراً دونوں طرح سے ہو سکتا ہے۔ قانون انتقال جائداد ایکٹ ۴ ۱۸۸۲ء کے ذریعہ سے واضعان قانون نے شرع محمدی کے اس حکم میں کوئی دست اندازی نہیں کی ہے بلکہ پریوی کونسل نے قمر النساء بی بی بنام حسینی بی بی[1] کے فیصلہ میں جب حالات مقدمہ سے اس کے نزدیک ثابت ہوا تو ہبہ لسانی کو جائز قرار دیا ہے۔

قابلیت ہبہ کرنیکی

جواز معاہدہ کے واسطے فریقین کی جس قابلیت اور اہلیت کی ضرورت ہے اسی قابلیت اور اہلیت پر جواز ہبہ منحصر ہے۔ جن شرائط کی تکمیل سے معاہدہ جائز ہوتا ہے ان ہی کی پابندی سے ہبہ کا جائز ہونا لازم آتا ہے یعنی:۔

(۱) حدِ بلوغ۔

(۲) عقل۔

(۳) حریت۔

---

[1] ۱۸۸۰ء الہ آباد جلد ۳ صفحہ ۲۶۶۔

(۴) ملکیت موہوب یعنے واہب کا مالک ہونا اس چیز کا جس کو وہ ہبہ کرنا چاہتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص ہبہ کرنا چاہتا ہے اس کا بالغ و عاقل ہونا اور معاملۂ ہبہ کی ماہیت سے واقف ہونا ضرور ہے۔ ایسا ہی اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ واہب برضا و رغبت اور کسی دوسرے شخص کے داب ناجائز یا تخویف یا جبر کے بغیر موہوب کو کسی اور کو بخشے علاوہ بریں جس چیز کو وہ دینا چاہتا ہے اس کا اس کو مالک ہونا بھی لازم ہے ورنہ فعل ہبہ ناممکن ہوگا۔

ہبہ قبول کرنے کی قابلیت

ہر ایک شخص میں بلالحاظ جنس و مذہب ہبہ قبول کرنے کی قابلیت ہے بشرطیکہ وہ حالت وجود میں ہو لہٰذا اگر ایسے طفل کو جو پیدا نہ ہوا ہو یعنے جس کا حمل بھی قرار نہ پایا ہو کوئی شئے حقیقتہً یا ضمناً ہبہ کی جائے تو ایسا ہبہ ناجائز ہے لیکن اس طرح سے جو شئے ایسے طفل کے نام پر ہبہ کی جائے جس کا حمل قرار پا چکا ہو تو اس طرح کا ہبہ شرعاً جائز ہے بشرطیکہ تاریخ ہبہ سے چھ مہینے کے اندر ایسا لڑکا تولد ہو جائے کیونکہ اس شکل میں خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکا اپنی ماں کے رحم میں ایک مخصوص وجود رکھتا ہے اور اس کا موجودات سے شمار ہو سکتا ہے۔

کتب فقہ میں مرض الموت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

تعریف مرض الموت

ہر ایک مرض شدید جس میں مبتلا ہونے سے بیمار کے صحت یاب ہونے کی بہت ہی کم توقع ہو بلکہ اس کی ہلاکت کا احتمال قوی ہو تو اس بیمار کے لئے وہ بیماری مرض الموت کہلاتی ہے۔ بیمار کا ایسے مرض کی حالت میں اپنے پیشہ کو انجام دینے کی قابلیت رکھنا یا نہ رکھنا مرض کا معیار نہیں ہے۔ لیکن جب مرض طول پکڑے اور مریض کو زمانۂ قریب میں مرنے کا اندیشہ نہ ہو جس کے سبب سے جائداد کو انتقال کرنے کی قوت اس میں باقی رہے یا جبکہ مرض کی رفتار ایسی دھیمی ہو جس کی وجہ سے مریض کو اپنی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو تو اس قسم کے مرض پر مرض الموت کی تعریف صادق نہیں آتی۔

ایک شخص نے ایک سال سے زیادہ بیمار رہ کر بحالت مرض جب کہ اس کو اس مرض سے فوراً مرنے کا اندیشہ نہیں تھا ایک شئے کسی دوسرے کو ہبہ کی۔ عدالت نے تجویز کی کہ ایسا ہبہ جائز ہے[1]۔

ہبۂ مرض الموت کا اثر

ہبہ جس کو انسان اپنی عمر کے آخر وقت میں کرتا ہے یعنی ہبۂ مرض الموت صرف ایسی حالت میں موثر و جائز ہوسکتا ہے جب کہ مرنے والا اپنی جائداد سے صرف ایک ثلث کسی غیر کے نام ہبہ کرے اور اس کے ورثا اس سے زیادہ ہبہ کرنے کے متعلق رضامند نہ ہوں۔ جب ایک ثلث جائداد کا ہبہ کسی وارث کے حق میں کیا جائے اور دوسرے ورثا رضامند نہ ہوں تو ایسا ہبہ شرعاً ناجائز ہے[2]۔

فصل سوم

موہوب یا وہ چیز جو ہبہ کی جائے

موہوب

ایسی ہر ایک چیز جس پر اختیار یا حق ملکیت عمل میں لایا جاسکتا ہے یا ایسی چیز جس پر فی الحال یا آئندہ قبضہ و تصرف ہوسکتا ہے یا ایسی شئے جس کا موجودات میں شمار ہوسکتا ہو یا ہر ایک قابل نفاذ حق بہر حال ہر ایک شئے جو لفظ مال کے معنوں میں داخل ہے ہبہ کا موضوع قرار پاسکتی ہے اور اُس کا ہبہ ہوسکتا ہے جس طرح جائداد مادی

---

[1] لبتی بی بی بنام بی بن بی بی (۱۸۷۴ء) این۔ ڈبلیو۔ پی ہائی کورٹ رپورٹس جلد ۶ صفحہ ۱۵۹۔ محمد گل شیر خاں بنام مریم بیگم (۱۸۸۱ء) الہ آباد جلد ۳ صفحہ ۷۳۱۔ حضرت بی بی بنام غلام جعفر (۱۸۹۸ء) کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۳ صفحہ ۵۷۔ فاطمہ بی بی بنام احمد بخش (۱۹۰۵ء) کلکتہ جلد ۳۱ صفحہ ۳۱۹۔

[2] وزیر جان بنام سید الطاف علی (۱۸۸۷ء) الہ آباد جلد ۹ صفحہ ۳۵۷۔

ہبہ کی موضوع ہے اور اُس کا ہبہ کرنا ممکن ہے اسی طرح حقوق غیر مادی اور اُن مطالبات[1] ودعاوی کا ہبہ ہوسکتا ہے جو نالش یا عدالتی کارروائی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

جو جائداد اسامیوں کے قبضہ میں ہو اس کا ہبہ کرنا شرعاً جائز ہے کیونکہ اس قسم کی ہبہ سے واہب اپنے زر مالگزاری یا رقم کرایہ پانے کے حق کو جو اسے اسامی قابض یا کرایہ دار سے[1] وصول ہوتا ہے موہوب لہٗ کو عطا کرتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایسی جائداد جو مرتہن[2] کے قبضہ میں یا زیر قرقی ہے یا وارث کا متروکہ میں وہ غیر منقسمہ حصہ جو اس کے قبضہ میں نہ آیا ہو[3] شرعاً ہبہ ہوسکتا ہے۔ علاوہ بریں حق مالکانہ یعنے ایسے مالک اراضی کا سرکار ہند سے منافع لینے کا حق جس کے علاقہ کو بندوبست کرکے سرکار نے کسی دوسرے زمیندار یا مالگذار کو دیا ہو ہبہ[5] ہوسکتا ہے۔

ناقابل تقسیم شئے کے جزو غیر منقسم کا ہبہ

جائداد ناقابل تقسیم کے جزو غیر منقسمہ کو ہبہ کرنا جائز[6] ہے۔ سنت جماعت کی شرع میں ایسی جائداد کے کسی حصہ کا ہبہ کرنا

---

[1] ابراہیم بنام شیخ سلیمان ۱۸۸۴ء بمبئی جلد ۹ صفحہ ۱۴۶۔

[2] رحیم بخش بنام محمد حسن ۱۸۸۸ء الہ آباد جلد ۱۱ صفحہ ۱۔ محی الدین بنام منچر شاہ ۱۸۸۲ء بمبئی جلد ۶ صفحہ ۶۵۰۔ اور اسمال بنام راجی ۱۸۹۹ء بمبئی جلد ۱۳ صفحہ ۶۸۲ میں نہایت ادب سے توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہائی کورٹ بمبئی نے شرع محمدی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

[3] انوری بیگم بنام نظام الدین ۱۸۸۹ء الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۱۶۵۔

[4] محمد بخش بنام حسینی بی بی ۱۸۸۸ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۱۵ صفحہ ۸۱۔ کلکتہ جلد ۱۵ صفحہ ۶۸۴۔

[5] ملک عبد الغفور بنام مساۃ ملکہ ۱۸۸۴ء کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۱۲۔ اس کے علاوہ جن کتب اور علما کے اقوال کا حوالہ اس صفحہ پر دیا گیا ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

[6] قاسم حسین بنام شرف النسا ۱۸۸۳ء الہ آباد جلد ۵ صفحہ ۲۸۵۔

جو قابل تقسیم ہو لیکن جس کی تقسیم نہ کی گئی ہو ناجائز متصور ہوتا ہے مگر ہبہ کے ساتھ ہی اگر اس غیر منقسم جزو جائداد کا قبضہ موہوب لہٗ کو مل جائے اور وہ اس کے حوالہ کر دیا جائے تو اس کی ناجوازی رفع ہو جاتی ہے اور ہبہ موثر ہو سکتا ہے۔

شیخ محمد ممتاز احمد وغیرہ بنام زبیدہ جان وغیرہ میں پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی نے اصول بالا کو طے کیا ہے[1]۔ عدالت ہذا نے بمطابقت اقوال علمائے اسلام قرار دیا ہے کہ جس جائداد کا کسی ناجائز ہبہ مشاع کی رو سے قبضہ ملے تو جائداد منتقل ہو جاتی ہے اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس قول کا جس کی بناء پر ہبہ مشاع ناجائز قرار دیا گیا ہے کسی ترقی یافتہ نظم معاشرت اور زمانۂ حال کے مہذب و متمدن اقوام پر اطلاق کرنا نہایت نازیبا و ناموزوں ہے بلکہ خاص خاص صورتوں میں اس پر عمل کرنا چاہئے اور اس قسم کے احکام کو جہاں تک محدود رکھا جائے مناسب ہے۔

تعریف مشاع

جس جائداد کی تقسیم نہ ہو وہ مشاع کہلاتی ہے یعنے مشاع سے مراد جائداد غیر منقسمہ ہے۔ فریزر تاک مشاع کو جائداد "مشترکہ" لکھتا ہے اور اس کے نزدیک مشاع اور مشترکہ جائداد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بہر حال ہر ایک مشترکہ اور غیر منقسمہ جائداد جس میں مختلف لوگوں کے حقوق ہوں مشاع ہے۔

ہند کی عدالتوں نے طے کر دیا ہے کہ زمینداریوں پر قول اور حکم مشاع کا اطلاق نہیں ہو سکتا[2]۔

جائداد قابل تقسیم کا دو شخصوں کو مشترکا ہبہ کرنا

کسی جائداد قابل تقسیم کا دو شخصوں پر بلا تعیُّن حصص مشترکا ہبہ کرنا ناجائز ہے لیکن موہوب لہم کے قبضہ کر لینے سے اس طرح کا ہبہ جائز ہو جاتا ہے۔ مگر جب ایک موہوب لہٗ نابالغ اور دوسرا بالغ ہو تو جو ہبہ ایسے دو شخصوں کو مشترکا کیا جاتا ہے

---

[1] سنہ ۱۸۸۹ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۱۶ صفحہ ۲۰۵ دیکھو الہ آباد جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۰۔

[2] عابد النساء بنام امیر النساء سنہ ۱۸۷۶ء لا رپورٹ اپیلز جلد ۲ صفحہ ۸۷۔ بنگال لا رپورٹس جلد ۱۵ صفحہ ۶۷۔

وہ جائز ہے۔

مشاع کے متعلق شیعوں کا قول

شیعہ مذہب میں مالِ مشاع یعنے جائداد مشترکہ غیر منقسمہ کے ایک حصہ کا ہبہ شرعاً جائز ہے لہذا اگر کوئی شئے دو شخصوں کو مشترکاً دی جائے یعنے ان کے حصے مقرر کرنے کے بغیر اس شئے کا قبضہ ان کے حوالے کر دیا جائے تو موہوب لہم سے ہر ایک اپنے حصے کا مالک ہو جاتا ہے۔ اگر دو میں سے صرف ایک موہوب لہٗ ہبہ کو قبول کر کے اپنے حصے پر قبضہ کر لے تو ایسا ہبہ صرف قبول کرنے والے کے حق میں جائز ہو سکتا ہے۔

ایسی شئے کا ہبہ کرنا جو ہبہ کے وقت موجود نہ ہو اور جس کے ہونے کا زمانۂ آئندہ میں احتمال ہو سکتا ہو ناجائز ہے۔ مثلاً کسی درخت کے ثمر کا جو آئندہ بار آور ہونے والا ہے ہبہ کرنا غیر موثر ہے۔

اگر کسی شخص کو باوقات مقررہ کسی شئے میں یا اس کے پانے کا ایسا حق پیدا ہوتا ہے جو مستقل و متیقن ہے اور وہ اپنے اس حق کو کسی دوسرے کو ہبہ کر دے تو اصولاً اس طرح کا ہبہ ناجائز نہیں ہو سکتا مثلاً کسی جائداد غیر منقولہ یا منقولہ کا زر مالگزاری (اور کرایہ) جو مشخص و متیقن ہے یا اس جائداد کی آمدنی کا ہبہ کرنا بالکل درست ہے[1]۔

ہر چند دعوئ محض یا ایسی جائداد کے حق نالش کا ہبہ جس پر ایک شخصِ ثالث بمقابلۂ واہب قبضۂ مخالفانہ رکھتا ہو صحیح نہیں ہے[2]۔ لیکن جائداد کے ہبہ ہو جانے کے بعد اگر اس پر واہب کا قبضہ ہو جائے اور وہ موہوب لہٗ کو اس پر قابض کرا دے تو

---

[1] ہائی کورٹ بمبئی نے بمقدمہ امۃ النسا بیگم بنام میر نور الدین حسین خان رپورٹ ۱۸۹۶ء نظائر قانون ہند سلسلۂ بمبئی جلد ۲۲ صفحہ ۴۸۹ جس حقیقی اصول کے سمجھنے میں غلطی فرمائی ہے اُس کی بابت نہایت ادب سے عرض کیا جاتا ہے کہ اصل میں اس شئے کا ہبہ جو بوقت ہبہ موجود نہ ہو صحیح نہیں ہے یعنے موہوب کی موجودگی کی نسبت یقین نہ ہونے سے اس طرح کا ہبہ ناجائز ہے محض واہب کی عدم قابلیت سے ہبہ ناجائز نہیں ہو سکتا۔

[2] مہر علی بنام تاج الدین رپورٹ ۱۸۸۸ء نظائر قانون ہند سلسلۂ بمبئی جلد ۱۳ صفحہ ۱۵۹۔ رحیم بخش بنام محمد حسن رپورٹ ۱۸۸۹ء نظائر قانون ہند سلسلہ الہ آباد جلد ۱۱ صفحہ ۱۔

ہبہ صحیح ہو جاتا ہے۔

مگر جبکہ موہوب کی ملکیت فی الحقیقت واہب کو حاصل ہو حالانکہ وہ اس کے قبضہ سے خارج ہی کیوں نہ ہو اگر واہب اس کو بھی موہوب لہ ہبہ کر کے اس کو اس پر قبضہ کرنے کا مجاز کر دے تو ہبہ صحیح ہے۔

فصل چہارم

شرائط جواز ہبہ

ہبہ کے جائز ہونے کے لئے شرائط ذیل کی پابندی لازم ہے:—

ہبہ جائز کے متعلق شرائط ضروری

(الف) اظہار ارادۂ واہب یعنے جو ایجاب کہ واہب ہبہ کے متعلق کرے اس کا بخوبی ظاہر ہونا۔

(ب) موہوب لہٗ کا اُس ایجاب کو صریحی یا ضمنی طور پر قبول کرنا۔

(ج) موہوب لہٗ کا شئے موہوب پر قبضہ کر لینا خواہ ایسا قبضہ واقعی ہو کہ معنوی۔

چونکہ انتقال جائداد کا اثر قانونی منتقل کنندہ کے ارادہ پر منحصر ہوتا ہے اور شرع محمدی کی رو سے ہبہ کا مفہوم عطائے مطلق ہے اس لئے فقہائے اسلام ایسے انتقال جائداد کے متعلق جو معطی کی رضا و رغبت سے عمل میں آتا ہے مسئلہ نیت کو نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہبہ کے موثر و صحیح ہونے کے لئے موہوب لہٗ کا اُس کو قبول کرنا بھی لازم ہے بدون منظوری معطی لہٗ ہبہ صحیح و موثر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ قدیم زمانہ میں دستاویز کے ذریعہ سے جائداد نہیں منتقل کی جاتی تھی اور نہ اُس میں دستاویز انتقال

مسئلہ اُمقابضت

بطور شہادت استعمال ہوتی تھی لہذا جائداد غیر منقولہ کی بیع و شری

لہ محمد بخش بنام حسینی بی بی جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حصول وعطا تبدیل قبضہ کے ذریعہ سے عمل میں لائی جاتی تھی اور کسی نہ کسی ایک علامت کے ذریعہ سے حوالگی قبضہ کا اظہار کیا جاتا تھا مسلمانوں میں بھی حوالگی قبضہ کا وہی طریقہ تھا جو انگلستان کے قدیم قانون جائداد غیر منقولہ کے لحاظ سے "عطائے سِسی زِن" (قبضہ زمین) کہلاتا تھا اور اس لئے فقہائے اسلام کے متقدمین حوالگی قبضہ پر زیادہ زور دیتے تھے لیکن علمائے اسلام کے متاخرین کے نزدیک موہوب لہ کا قبضہ لینے کے قابل ہونا "حوالگی قبضہ" کے برابر سمجھا جاتا ہے اور اس لئے جب واہب موہوب لہ کو موہوب پر قبضہ پانے کے قابل بنا دیتا ہے تو تبدیل قبضہ کے متعلق جو شرائط شرعیہ ہیں اُن کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

والدین میں سے کسی ایک کا اولاد نابالغ کے حق میں ہبہ کرنا۔

اگر ماں باپ سے کوئی ایک شخص اپنی نابالغ اولاد کو کوئی شئے ہبہ کرے تو نابالغ کا اس کو قبول کرنا شرط لازم نہیں ہے بلکہ ہبہ کی تکمیل صرف معاہدۂ ہبہ سے ہو جاتی ہے اور اس کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا کہ موہوب والد (یا والدہ) کے قبضہ میں ہے یا کسی امین بلا اجورہ[1] کے تفویض ہے۔ بلکہ تبدیل قبضہ کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ باپ کا قبضہ اس کے فرزند نابالغ کے قبضہ کے برابر سمجھا جاتا ہے[2]۔

ولائت غیر عطا بہ صغیر

جب کسی یتیم لڑکے کی نگرانی اس کی ماں کرتی ہے اور وہ اُس یتیم کی کسی جائداد موہوبہ پر قبضہ کر لے تو اس طرح کا ہبہ جائز ہے۔ اگر نابالغ شخص غیر کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے اور اس کی جانب سے شئے موہوبہ پر ایسا ولی قابض ہو جائے تو بھی جواز ہبہ کے لئے کافی ہے[3]۔

اگر کوئی نابالغہ لڑکی شادی کے بعد اپنے شوہر کے پاس رہتی ہے اور جو جائداد اسے ہبہ ہو اس پر اس کا

---

[1] ملک عبدالغفور بنام مساۃ ملکہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

[2] فاطمہ بی بی بنام احمد بخش جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

[3] فخر الدین بنام بانو بی ۱۸۶۳ء سلیکٹ رپورٹ (نظائر منتخب) جلد ۵ صفحہ ۴۰۔

باپ یا شوہر قبضہ کرلے تو ہبہ صحیح سمجھا جائے گا اور موہوب لڑکی کی ملک متصور ہوگا۔[1]
جب موہوب موہوب لہٗ کے قبضہ میں ہو تو حوالگی قبضہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

تبدیل قبضہ۔ اس کا مفہوم اور دائرۂ عمل

مسئلہ تبدیل قبضہ یا حوالگی قبضہ پر غور کرنے کے وقت تعلقات فریقین (واہب و موہوب لہٗ) کا لحاظ کرنا بھی ضرور ہے۔ مثلاً اگر شوہر مکان یا زمین زوجہ کو ہبہ کرنے کے بعد اس مکان میں خود سکونت جاری رکھے یا اراضی کا زر لگان یا محاصلِ علاقہ خود وصول کرتا رہے تو محض اس طرح کی سکونت اور وصول محاصل کی بنا پر ہبہ ناجائز نہیں قرار پا سکتا کیونکہ ان افعال کی واہب اور موہوب لہٗ کے تعلقات سے توجیہ ہوسکتی ہے۔[2] علیٰ ہذا القیاس اگر باپ اپنی دوکانداری اپنے نابالغ فرزند کے نام ہبہ کردے اور خود اُس کی جانب سے دوکان وغیرہ کا انتظام کرتا رہے[3] یا ماں اپنا مکان اپنی دختر کو ہبہ کرکے اُس میں رہنا جاری رکھے یا چچا اپنی کچھ جائداد بھتیجے کو ہبہ کردے اور بھتیجا اُس کی پرورش و امداد کرتا رہے تو ان وجوہ کی بنا پر ہبہ ناجائز نہیں ہے۔

حوالگی قبضہ موہوب کی حیثیت و حقیت پر منحصر ہے یعنے جس قرینہ کا کہ موہوب ہو اُس قرینہ سے موہوب لہٗ کا اُس پر قبضہ سمجھا جاتا ہے مثلاً اُس صندوق کی کنجی موہوب لہٗ کے حوالہ ہونے سے جس کے اندر کا مال اُس کو ہبہ کیا جاتا ہے حوالگی قبضہ متصور ہوتی ہے اور بشکل جائداد غیر منقولہ جو

---

[1] آمنہ بی بی بنام خدیجہ بی بی ۱۸۶۴ء بمبئی ہائی کورٹ رپورٹس جلد ۱ صفحہ ۱۵۷۔

[2] عظیم النسا بنام ڈیل اس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔ ایمنا بائی بنام ہوجی رابائی ۱۸۸۹ء نظائر قانون ہند سلسلہ بمبئی جلد ۱۳ صفحہ ۳۵۲۔ حمیرا بی بی بنام نجم النسا بی بی ۱۹۰۵ء الہ آباد جلد ۲۸ صفحہ ۱۴۷۔

[3] کنڈرت ویاٹل باوا بنام سائی ان دی ٹل یکسر کستی ۱۹۱۸ء مدراس جلد ۴۳ صفحہ ۳۰۵۔ وہاذاللہ صاحب بنام بویا بیٹا ناگیا ۱۹۱۵ء مدراس جلد ۳۸ صفحہ ۵۱۹ کے مقدمہ میں ہائی کورٹ مدراس نے اُن جائز امور سے زیادہ آسان پہلو پر جن کا ذکر اس صفحہ میں ہوا ہے مسئلہ قبضہ کا تصفیہ فرمایا ہے۔

اسامیوں (یا کرایہ داروں) کے قبضہ میں ہو موہوب لہٗ کو قبالہ جات کے حوالہ کر دینے سے یا داہب کی ہدایت پر اسامیوں کے موہوب لہٗ[۱] کے اسامی بننے کے اقرار سے یا بصورت حقوق زمینداری محکمہ کلکٹر کے رجسٹر[۲] میں تبدیل نام سے جائداد پر قبضہ موہوب لہٗ کا قائم ہونا سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح واہب اُس جائداد کو جو بعلت بقایائے مالگزاری کلکٹر کی قرقی میں ہو قانوناً ہبہ کرنے کا مجاز ہے لیکن اُسی قسم کے حقوق ایسی جائداد میں ہبہ ہو سکتے ہیں جو بوقت قرقی واہب کو حاصل ہوں[۳]۔ یعنے واہب کا فرض ہے کہ جو ہبہ اس کے پیش نظر ہے اُس کو مکمل و صحیح بنانے کے لئے اُس کے متعلق ہر ایک ممکن کوشش عمل میں لائے اور یہ بات دو طرح سے حاصل ہوتی ہے یا تو موہوب لہٗ[۴] کا موہوب پر قبضہ واقعی کرا دینا ورنہ موہوب لہٗ کو موہوب پر قبضہ پانے کا قابل بنا دینا۔

وصولیابی قرضہ

جب ایک شخص دوسرے کو اپنا قرضہ وصول کرنے کے قابل بنا دے تو شرع محمدی کی رو سے اس طرح کا فعل حوالگی قبضہ کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ یعنے جب پہلے شخص کی واجب الوصول رقم قرضہ اُس کی اجازت سے دوسرا شخص وصول کرتا ہے تو اُس کو اُس مال کا قبضہ بھی ملجاتا ہے اور قبضہ ملنے کے سبب سے اُس مال کا ہبہ صحیح ہو جاتا ہے۔

لیکن جب ایک مقدمہ میں ایک بنک کے ایجنٹ نے اپنے چند

---

[۱] ابراہیم بنام شیخ سلیمان ۱۸۸۴ء بمبئی جلد ۹ صفحہ ۱۴۶۔ بی بی خاور سلطان بنام بی بی رقیہ سلطان ۱۹۰۵ء بمبئی جلد ۲۹ صفحہ ۴۶۸۔

[۲] سجاد احمد خاں بنام قادری بیگم ۱۸۹۵ء الہ آباد جلد ۱۸ صفحہ ۱۔

[۳] انوری بیگم بنام نظام الدین شاہ اس کا حوالہ آچکا ہے۔

[۴] محمد بخش بنام حسین بی بی (حوالہ آچکا ہے) بمبئی ہائی کورٹ کی رائے جو اُس نے مغل شاہ بنام محمد صاحب ۱۸۸۶ء بمبئی جلد ۱۱ صفحہ ۵۱۷ اور اسمال بنام راجی بمبئی جلد ۳ صفحہ ۶۸۲ میں ظاہر کی ہے کہ "دستاویز کی رجسٹری حوالگی قبضہ کے سقم کو رفع نہیں کر سکتی" نہایت تنگ خیالی پر مبنی ہے۔

دستخطی ڈپازٹ نوٹ اُن رقوم کے متعلق جن کو ایک کھاتہ دار نے سود پر بنک میں جمع کیا تھا بطور رسید اُس کے ایک فرستادہ کے حوالہ کئے اور نوٹ اُس فرستادہ عورت کو ایسی شکل میں نہیں دئے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ بحیثیت منتقل الیہا اُن رقوم کے پانے کی مستحق ہو جاتی جن کی وصولیابی بنک نے ان نوٹوں کے ذریعہ سے قبول کی تھی۔ عدالت سے طے پایا کہ نوٹ کی حوالگی سے محولہ اُن کی مالک نہیں ہو سکتی اور نہ اُس رقم کو جو ان نوٹوں کے ذریعہ سے مکفول ہوئی ہے محولہ بنک سے حاصل کر سکتی ہے[1]۔ بہرحال نوٹوں کے حوالہ کئے جانے سے صرف اس امر کا اظہار ہو سکتا ہے کہ وہ بنک کا ارادہ رقم مجتمعہ کو محولہ کے نام منتقل کرنے کا تھا اور اس معاملہ سے اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ بذات خود نامکمل تھا اس لئے اس کا قانوناً کوئی اثر نہیں پیدا ہو سکتا۔

فصل پنجم

ہبۂ مشروط

ہبۂ مشروط حنفیہ کے نزدیک ہبۂ مشروط اور ہبہ مع الشرائط میں بہت بڑا فرق ہے۔ جب ہبہ کی تکمیل میں کوئی نقص ہو جائے تو شرع حنفی کی رو سے ہبہ باطل ہو جاتا ہے اور اگر ہبہ سے واہب کا ارادہ پوری شئے موہوبہ کو دینے کا پایا جائے تو ایسی شرطیں جو ہبہ میں لگائی جاتی ہیں اور جن کا نفاذ فعل ہبہ کے بعد وقوع میں آتا ہے یا جن سے ہبہ محدود ہوتا ہے وہ باطل اور کالعدم سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن جس صورت میں شرط کے سبب سے

---

[1] آغا محمد جعفر بندا مین بنام کلثوم بی بی ۱۸۹۸ء کلکتہ جلد ۲۵ صفحہ ۹ ممتاز النسا بنام طفیل احمد ۱۹۰۵ء الہ آباد جلد ۲۸ صفحہ ۲۶۴۔

ہبہ باطل نہیں ہوتا و ایسا ہبہ جائز ہے۔ مثلاً اگر الف کو کوئی شئے اس شرط کے ساتھ عطا کی جائے کہ وہ اُس کو اپنے حین حیات لے تو ایسی شرط باطل ہے اور الف کو وہ شئے بطور عطیہ دوامی مل جائے گی۔[1] یا مثلاً کوئی شخص اپنی اراضی کا ایک قطعہ کسی دوسرے کو بدیں شرط ہبہ کرے کہ موہوب لہٗ دواماً اس قطعۂ زمین کا محاصل واہب کو دیتا رہے تو اس طرح کی شرط ناجائز ہے۔

ہبہ مع الشرائط شیعوں کے نزدیک جب کوئی جائداد بطور عطیۂ مطلق الف کو دی جائے اور عطا [illegible] یہ شرط لگائی جائے کہ جو منافع اس جائداد سے حاصل ہوگا اُس کو معطی اپنے حین حیات لیتا رہے گا تو ایسی شرط جائز ہے۔[2]

جب الف کوئی جائداد ب کو عطا کرے اور ب کے اختیار انتقال جائداد کی نسبت کوئی قید نہ عائد کرے بلکہ اُس کے بجائے یہ شرط لگائے کہ ب باوقات مقررہ الف کو اور اس کے ورثا کو جائداد موہوبہ کے منافع کا کچھ حصہ دیا کرے تو ایسی صورت میں ہبہ اور شرائط جو اس کے ساتھ لگائی جاتی ہے دونوں صحیح ہیں۔ اور اگر ب جائداد کو منتقل کرے تو منتقل الیہ پر اس شرط کی تعمیل لازم ہوگی۔

لیکن ایسا ہبہ جو کسی واقعہ اتفاقی یا غیر معین کے ساتھ مشروط کیا جاتا ہے وہ اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک ناجائز ہے مثلاً اگر الف ب سے کہے کہ "میں یہ جائداد تم کو دیتا ہوں بشرطیکہ میرا لڑکا فلاں روز مکان کو سفر سے واپس آئے" چونکہ یہ ہبہ فرزند واہب کے کسی مخصوص دن مکان واپس آنے کے واقعۂ غیر معین پر منحصر رکھا گیا ہے لہٰذا شرعاً ناجائز ہے۔[3]

---

[1] دیکھو نظام الدین بنام عبدالغفور ۱۸۸۸ء بمبئی جلد ۱۳ صفحہ ۲۶۴۔ دیکھو اُسی مقدمہ کے فیصلہ مرافعہ کو جو بمبئی جلد ۱۷ صفحہ ۱ پر شائع ہوا ہے۔

[2] نواب امجد علی خاں بنام محمدی بیگم ۱۸۶۷ء مورز انڈین اپیلز جلد ۱۱ صفحہ ۵۱۷۔

[3] مقابلہ کرو اُمیس چندر سرکار بنام مسماۃ ظہور فاطمہ ۱۸۹۰ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۱۷ صفحہ ۲۰۱ اور صفحہ ۲۰۹۔

ہبہ بشرط العوض

ہبہ بشرط العوض میں جو امر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کے ہبہ کے ساتھ کوئی معین اور ممکن شرط لگائی جانی چاہئے اور اس طرح کی شرط کا بوقت عطا یا معاہدۂ ہبہ عائد ہونا لازم ہے اور شرط ایسی ہونی چاہئے جس سے ہبہ باطل نہ ہونے پائے۔

شرع امامیہ۔ جائداد حین حیات یا عمرہ

شیعوں کی شرع میں ہبہ مشروط جائز ہے اور محدود جائدادیں جو اس طرح کے ہبہ میں عطا کی جاتی ہیں اُن کے قائم اور مقرر کرنے کی قانون مذکور سے اجازت ہے مثلاً اگر الف، ب کو ب کے حین حیات کوئی شئے عطا کرے تو حنفی شرع کی رو سے ایسا عطیۂ حین حیات عطیہ مطلق ہو جاتا ہے لیکن شیعوں کے قانون کی رو سے اس طرح کی عطا میں ب کو صرف جائدادِ حین حیات ملتی ہے اور ب کے مرنے کے بعد جائداد معطی یا اُس کے ورثہ کو مسترد ہوتی ہے۔ اس طرح شیعوں کے قانون میں کسی جائداد کا الف کو حین حیات اور ب کو دواماً عطا ہونا جائز ہے یا پہلے الف کو اور بعد ازاں ب کو کسی جائداد کا حین حیات اور اُس کے بعد ج کو مطلقاً عطا ہونا جائز ہے۔ علیٰ ہذا القیاس الف کو جائداد اُس کے حین حیات اور اُس کے بعد اُس کی اولاد کو عطا ہو سکتی ہے یعنے شرع امامیہ کی رو سے محض ایک شخص کے واسطے عطیۂ حین حیات یا سلسل اشخاص کے لئے یکے بعد دیگرے اس طرح کی عطا ہو سکتی ہے۔

فصل ششم

تنسیخ ہبہ

شرع حنفی کی رو سے صورت ہائے ذیل کے سوائے تنسیخ ہبہ جائز ہے:۔

کن صورتوں میں تنسیخ ہبہ جائز نہیے

(۱) جب شئے موہوبہ ہبہ یا بیع یا کسی اور انتقال کے ذریعہ سے جس سے حق ملکیت منتقل ہو جاتا ہے موہوب لہٗ

کے قبضہ و ملک سے نکل جائے۔

(۲) جب موہوب لۂ مر گیا ہو اور موہوب اس کے ورثا کو بطور میراث ملی ہو۔

(۳) جب واہب مر گیا ہو یعنے واہب کے مرنے کے بعد اس کے ورثا کو ہبہ کے منسوخ کرنے کا اختیار نہیں حاصل ہوتا تنسیخ ہبہ کا حق شخصی ہے جو واہب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

واہب کا اختیار حق شخصی ہے

(۴) جب شئے موہوب گم ہو گئی ہو۔

(۵) جب ہبہ بالعوض ہو یعنے یک شئے بمعاوضہ شئے دیگر کسی کو دی گئی ہو۔

(۶) جب موہوب کی ماہیت موہوب لۂ کے پاس بدل گئی ہو۔

(۷) جب مال یا شئے موہوب میں کچھ زیادتی یا اضافہ ہوا ہو اور یہ اضافہ اور زیادتی غیر منفک ہو یعنے شئے موہوب میں داخل ہو اور اس سے علیحدہ نہ ہو سکتا ہو۔ خواہ اس طرح کا اضافہ اور افزونی موہوب سے حادث ہوی ہو (جیسے میوہ درخت سے) یا اس شئے میں افزونی ہو گئی ہو (جیسے وہ زیادتی جو نمو سے درخت میں ہوتی ہے) بہر حال ان امور سے ہبہ منسوخ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے ناقابل منسوخی ہونے میں کوئی فرق آ سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کا اضافہ اور ترقی شئے موہوب کے جسم و عین ذات میں اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ جزو ماہیت متصور ہو سکے اور جس کے سبب سے موہوب کی قدر و قیمت میں ترقی ہوی ہو۔ رنگنا۔ سینا۔ اٹھا لیجانا تنسیخ ہبہ کے اختیار کو زائل کرنے والے اسباب سمجھے جاتے ہیں۔

قیمت موہوب میں اضافہ

جب محض موہوب کے ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کرنے میں اس کی قیمت بڑھ جائے اور انتقال کا صرفہ عائد ہوئے تو واہب کا اختیار تنسیخ پھر باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب موہوب کی ماہیت سے اضافہ علیحدہ ہو سکتا ہو یا موہوب میں کوئی کمی یا نقص واقع ہو تو واہب کے اختیار تنسیخ پر کوئی اثر

نہیں پڑتا یعنے ان صورتوں میں کوئی امر مانع تنسیخ نہیں ہے۔

(۸) جب واہب اور موہوب لہٗ میں رشتۂ زوجیت ہو تو اس طرح کا ہبہ صرف اُسی صورت میں ناقابل تنسیخ ہے جبکہ حالتِ زوجیت میں فعل ہبہ صادر ہوا ہو مثلاً جو ہبہ شادی ہونے کے قبل ہوا ہے وہ منسوخ ہو سکتا ہے لیکن اگر حالتِ زوجیت میں ہبہ ہونے کے بعد زوجیت منقطع ہو جائے تو یہ منسوخ نہیں ہو سکتا شوہر اور زوجہ کے اختلافِ مذہب سے بھی ہبہ منسوخ نہیں ہو سکتا۔

(۹) ایسی قرابت نسبی جو تحریم نکاح کے درجہ تک پہنچتی ہے بلالحاظ مذہبِ واہب و موہوب لہٗ مانع تنسیخ ہبہ ہے۔

(۱۰) ہبہ کے بعد اگر شئے موہوب میں اسباب قدرتی کی بنا پر نمو ہو تو واہب اُس کو منسوخ نہیں کر سکتا۔

مذہب شیعہ میں اگر کوئی شئے والدین کو دی جائے اور اُس پر ان کا

اقوال امامیہ

قبضہ ہو جائے علما کا اتفاق ہے کہ ایسا ہبہ شرعاً منسوخ نہیں ہو سکتا اور نہ اس صورت میں تنسیخ ہبہ جائز ہے جبکہ موہوب لہٗ واہب کا کوئی قرابت دار نسبی ہو یا واہب و موہوب لہٗ ایک دوسرے سے شوہر و زوجہ کا رشتہ رکھتے ہوں۔

لیکن جو ہبہ کہ غیر کے حق میں کیا جائے یعنے واہب اور موہوب لہٗ میں قرابت نسبی یا زن و شوہر کا رشتہ نہ ہو تو اس طرح کا ہبہ بشرطیکہ موہوب موجود رہے ہر وقت منسوخ ہو سکتا ہے مگر موہوب کا تلف و ضائع ہو جانا مانع تنسیخ ہبہ ہے۔

مگر جو ہبہ کہ کسی شئے کے معاوضہ میں "خواہ اُس کی قیمت کتنی ہی قلیل ہو" کیا جائے وہ قابل منسوخی نہیں ہے۔

بروئے مذہب شیعہ تنسیخ کے موثر ہونے کے لیئے فعل تنسیخ کا الفاظ صریح میں ظاہر کیا جانا لازم ہے محض ہبہ کو واپس لینا کافی نہیں ہے۔ اور اگر واہب تنسیخ ہبہ کی نسبت اپنے ارادہ کو صریح طور پر ظاہر کرنے کے بغیر مر جائے تو مال یا جائداد موہوبہ موہوب لہٗ کی ملک متصور ہوتی ہے حالانکہ ایسی جائداد معطی کے قبضہ سے ہی کیوں نہ برآمد ہو۔

فصل ہفتم

ہبہ بالعوض

بروئے مذہب شیعہ ہبہ بالعوض کی دو قسمیں ہیں اور ان کا تعلق معاہدۂ ہبہ کی حقیقت و ماہیت پر منحصر ہے۔ ہبہ کے متعلق عوض لینے کی شرط خود ہبہ کے معاہدہ میں ہو سکتی ہے اور ہبہ کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

(الف) جب عوض لینے کی شرط ہبہ کے معاہدہ میں کی جاتی ہے تو تو وہ ہبہ بالعوض کہلاتا ہے۔

(ب) اور جب معاہدۂ ہبہ کے بعد کسی آئندہ زمانہ کے لئے شرط کی تعمیل ملتوی رکھی جاتی ہے تو وہ ہبہ بشرط العوض کہلاتا ہے۔ ضروری امور کا لحاظ کرتے ہوئے ان دونوں قسموں کے ہبہ میں بیّن فرق ہے۔

ہبہ بالعوض میں تحویل قبضہ کی ضرورت نہیں

چونکہ بلحاظ نتائج قانونی ہبہ بالعوض ایک قسم کا بیع سمجھا جاتا ہے لہذا اس طرح کے ہبہ کے واسطے تحویل قبضہ شرط لازم نہیں ہے[1]۔ جب ہبہ میں عوض کا لینا طے پائے خواہ اس کی قیمت کتنی قلیل کیوں نہ ہو تو اس ہبہ اور ہبہ مطلق میں جس کی تکمیل کے واسطے تحویل قبضہ نہایت ضروری شرط ہے فرق عظیم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک مقدمہ میں جبکہ چچا نے جائداد کے ایک حصہ سے جس میں اس کو حق حاصل تھا دست برداری کر کے اپنا حق اپنی ایک نابالغہ بھتیجی کو اس معاوضہ کی بنا پر کہ کلکٹر ضلع متعلقہ جائدادِ نابالغہ کو اپنی نگرانی میں رکھے گا ہبہ کر دیا تو عدالت سے طے پایا کہ اس طرح کا ہبہ صحیح ہے اور اس کے لئے تحویل قبضہ کی ضرورت نہیں[2]۔

---

[1] میر نجیب اللہ بنام مسماۃ قاسمہ ۱۸۹۵ء سلیکٹ رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۱۰۔

[2] چودھری جہدی حسین بنام محمد حسن ۱۹۰۶ء کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۱۹ صفحہ ۷۰۶۔

تمثیل - فرض کرو ایک شخص فعلِ ہبہ کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ میں نے اپنے حقوق مالکانہ جو مجھکو میری جائداد میں حاصل تھے ایک دوسرے شخص کو کسی شئے کے معاوضہ میں ہبہ کردئے - لیکن اس طرح کا فعل ایسا ہبہ بالمعاوضہ نہیں ہے جس کا عوض زمانۂ آئندہ میں ملنا چاہیئے - لہذا جو معاملہ کہ تمثیل بالا میں واہب اور موہوب لہٗ کے درمیان طے پاتا ہے وہ اصل میں ہبہ بالمعاوضہ نہیں بلکہ بلحاظ شرط و اثر ایک قسم کا معاہدۂ بیع یا فریقین کی جانب سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں انتقال جائداد کا معاہدہ ہے - ایسی صورت میں جواز ہبہ کے واسطے موہوب لہٗ کے حق میں تحویلِ قبضہ کی ضرورت نہیں اور نہ ہبہ کو واہب منسوخ کرسکتا ہے -

لیکن ہبہ بشرط العوض بالکل ایک دوسرے قسم کا معاہدہ ہے۔

ہبہ بشرط العوض

الفاظ جو اس قسم کے معاہدہ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان کا مفہوم واقعۂ اتفاقی پر مبنی ہوتا ہے مثلاً ایسے الفاظ میں اس طرح کا ہبہ کیا جاتا ہے "میں نے تم کو یہ چیز اس شرط سے دی ہے کہ تم مجھکو فلاں شئے دو گے" جب فریقین معاہدہ کے مطابق اور اُس کے مفہوم کا لحاظ رکھ کر اُس پر عمل کرتے ہیں تو اُس معاہدہ کی بیع کی سی خاصیت ہو جاتی ہے۔[1]

یعنے جب تک اُس شرط کی جس کا تعلق عوض سے ہے تعمیل نہیں ہوتی اُس وقت تک اس قسم کے ہبہ کی حیثیت ہبہ مطلق کی رہتی ہے -

اگر شوہر اپنی کوئی جائداد مہر کی ادائی میں زوجہ کو ہبہ کردے تو اس طرح[2] کی معاملت ہبہ بالعوض متصور ہوتی ہے اور اس قسم کا انتقالِ جائداد بیع مکاسہ کہلاتا ہے۔

---

[1] دیکھو محمڈن لا جلد ۱ صفحہ ۱۰۲ (مؤلفہ سید امیر علی صاحب مطبوعہ انگریزی)

[2] محمد یوسف بنام تیمسا امال ۱۸۹۹ء مدراس جلد ۲۳ صفحہ ۷۰ -

اگر کوئی شخص اپنی جائداد دوسرے کو اس شرط سے ہبہ کردے کہ موہوب لہٗ ایک معینہ رقم واہب کو ادا کرتا رہے اور اس کے بعد اس کے ورثا کو دیتا رہے تو اس طرح کی عطا ہبہ بشرط العوض کہلاتی ہے۔

لیکن سنیوں کے نزدیک ہبہ بالعوض اور ہبہ بشرط العوض حکماً دونوں ایک ہیں ایسا عقد ابتداً ہبہ ہوتا ہے اور انتہاءً بیع ہوتا ہے لہٰذا صحت عقد کے واسطے مجلس عقد میں تقابض عوضین لازم ہوتا ہے اور متعاقدین میں سے کسی کو حق رجوع نہیں ہوتا۔

قانون وقف

فصل اوّل

مشاہدات عام

لفظ وقف کا مفہوم — لفظ وقف کے اصلی معنی توقیف اور حبس کے ہیں یعنے کسی شئے کو روک رکھنا یا مقید کرنا لیکن اصطلاح میں اس سے مراد کسی شئے کا کسی نیک کام کے لئے یا مسلسل نیک کاموں کے واسطے وقف کیا جانا ہے۔ جو شئے فی سبیل اللہ دی جائے وہ وقف سمجھی جاتی ہے۔

جب کوئی شئے وقف کی جاتی ہے تو اُس کی ملکیت واقف یعنے معطی سے نکل کر خدائے قادر و توانا کو منتقل ہو جاتی ہے اور جس وقت سے کہ وقف کیا جاتا ہے اُس وقت سے اُس شئے کا معنوی طور پر قادر مطلق مالک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو منافع اور آمدنی شئے موقوفہ سے ہوتی ہے صرف وہی بندگان خدا کے فائدے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور وقف ہو جانے کے سبب سے موقوف ناقابل انتقال اور ناقابل وراثت ہمیشہ کے لئے

ہو جاتا ہے[1] یعنے شئے موقوفہ نہ بیع در ہن یا کسی اور طرح سے کسی شخص کو منتقل ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص ارثاً اس کو لے سکتا ہے۔

واقف یا نذر کرنے والا

جو شخص اپنی شئے کسی مقدس کام کی انجام دہی کے واسطے راہ خدا میں دے دیتا ہے اُس کو واقف کہتے ہیں۔ جس شخص کے فائدے کے واسطے یا جس غرض کے لئے وقف کیا جاتا ہے وہ موقوف علیہ کہلاتا ہے اور اس کی جمع موقوف علیہم ہے۔

شرع محمدی کی رو سے ہر ایک کام جس سے انسان کو خواہ منفرداً ہو کہ مشترکاً فائدہ پہنچے کار خیر سمجھا جاتا ہے چنانچہ جو وقف کہ مسجد کے لئے کیا جاتا ہے اُس سے مصلّیوں کا آرام وراحت مقصود ہے اور کاروانسرا وغیرہ کے وقف سے مسافروں کو منزل کرنے میں آرام و آسائش پہنچتی ہے۔ اسی طرح کسی شخص کا اپنے عیال و اطفال یا قرابت داروں یا ہمسایہ کے لئے آذوقہ جمع کرنا شرع محمدی میں کار خیر متصور ہوتا ہے۔

پس ہر ایک کار خیر کے لئے مسلمان اپنا مال وجائداد وقف کر سکتا ہے۔ وقف کی غرض تو ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے یعنے کار خیر جو بدلتی نہیں لیکن شکل بدلتی رہتی ہے مثلاً ایک شخص چند منفرد اشخاص کی ایک جماعت کے واسطے اپنا مال وقف کرتا ہے اور جب اس گروہ کا ہر ایک شخص سلسلہ وار وقف سے فائدہ اُٹھا کر ختم ہو جاتا ہے تو اسی وقف سے عام محتاجوں کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔

وقف کے واسطے کسی خاص صیغہ اور الفاظ کے کہنے کی ضرورت نہیں

قیام وقف کے لئے کسی مخصوص صیغہ کے جاری کرنے یا خاص خاص الفاظ کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وقف کے جائز کرنے کے لئے لفظ وقف کا کہنا بھی لازم نہیں لیکن شرع محمدی میں جواز وقف کے واسطے جو کچھ احتیاط کرنی چاہئے وہ معطی کا ارادہ ہے بہرحال وقف کرنے والے کے ارادۂ صریح کا

---

[1] محمد صادق بنام محمد علی وغیرہ ۱۸۹۷ء سلیکٹ رپورٹز (نظائر منتخب) جلد ۱ صفحہ ۱۷۔

انکشاف ہونا اور وقف کا کار خیر کے واسطے کیا جانا ضرور ہے[1]۔ وقف تحریراً اور زبانی دونوں طرح سے ہو سکتا ہے۔ واقف کو اختیار ہے کہ اپنے حین حیات یا مرنے کے بعد بذریعہ انتقالِ وصیتی وقف کو جاری کرائے[2]۔

جب وقف بذریعہ تحریر کیا جاتا ہے تو دستاویز وقف نامہ کہلاتی ہے۔

شرائط جواز متعلق واقف

واقف کو چاہیئے کہ (۱) صحیح العقل ہو (۲) عاقل و بالغ[3] ہو اور (۳) کسی دوسرے کے جبر و اثر ناجائز میں نہ ہو، اور وقف کو ہر پہلو سے جائز بنانے کے لیئے (۴) واقف کا صحیح و تندرست ہونا لازم ہے بلکہ عبارت ذیل میں اس مطلب کو ادا کرنا زیادہ صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وقف کرنے کے وقت واقف کو کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ رہنا چاہیئے جس سے وہ بعد وقف ہلاک ہو جائے اور (۵) واقف کو چاہیئے کہ جس شئے کو وقف کرتا ہے اس کا مالک ہو۔

جو وقف کہ مرض الموت میں کیا جاتا ہے وہ اُسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے اور اُنہی شرائط کے تابع ہوتا ہے جس حد تک انتقال جائداد بذریعۂ وصیت جائز ہو سکتا ہے اور جن شرائط کی تکمیل اس قسم کے انتقال جائداد

---

[1] دیکھو جیون داس ساہو بنام شاہ کبیر الدین احمد سنہ ۱۸۴۰ء مورز انڈین اپیلز جلد ۲ صفحہ ۳۹۰۔ کالب علی حسین بنام سیف علی سنہ ۱۸۱۴ء سلیکٹ رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۱۰۔ ابو الحسن بنام محمد نصیر کربلائی سنہ ۱۸۲۰ء سلیکٹ رپورٹ جلد ۵ صفحہ ۸۷۔ سلیم النسا بنام موٹے احمد سنہ ۱۹۰۳ء الہ آباد جلد ۲۵ صفحہ ۴۱۸۔

[2] باقر علی خاں بنام انجمن آرا بیگم سنہ ۱۹۰۲ء کلکتہ جلد ۲۵ صفحہ ۲۳۶۔

[3] اس کے پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ شرع اسلام میں مرد پندرھویں سال کے بعد با اختیار یعنے عاقل و بالغ سمجھا جاتا ہے اور حد بلوغ کے لیئے بھی پندرہ سال ہیں۔ لیکن ایکٹ سنہ ۱۸۷۵ء کے جاری ہونے کے بعد سے اب کوئی مسلمان باشندۂ ہند جب تک اٹھارہ سال کا نہ ہو وقف کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اگر وہ وارڈ یعنے زیر نگرانی کورٹ ہے تو اکیس برس کے سن کے پہلے اس طرح کا فعل نہیں کر سکتا۔

کے لیئے لازم ہے۔

ابویوسف رحمۃ کے قول کے مطابق واقف محض اپنے اعلان سے اپنی کسی جائداد کو شرعاً وقف کر سکتا ہے یعنے اُس جائداد کو دوامًا کار خیر کے لیئے دے سکتا ہے اور متولی کے نام اُس کے انتقال اور تحویل قبضہ کی مطلق ضرورت نہیں[1] بلکہ معطی کے اعلان سے اُس جائداد کی وقف صحیح کی سی حیثیت ہو جاتی ہے۔

اگر واقف جائداد کو وقف کرنے کے بعد اُس پر قابض رہے تو اُس کا قبضہ امین کا قبضہ سمجھا جاتا ہے اور بمقابلہ موقوف علیہم یعنے اشخاصِ مستحق استفادہ اُس کی امین کی سی حیثیت ہو جاتی ہے۔

شرع اہل سنتن جوازِ وقف کے واسطے تحویل قبضہ کی ضرورت نہیں

جب ایک مرتبہ واقف کسی امر مباح کے واسطے جو شرعاً جائز ہو جائداد وقف کر کے اپنے فعل کا اظہار کر دے تو وقف ناقابل منسوخی ہو جاتا ہے۔

لیکن جب وقف اس خیال سے کیا جاتا ہے کہ واقف کی موت کے بعد نافذ ہو سکے یا جو وقف کہ بذریعۂ وصیت ہوتا ہے اور جس کو وقف بالوصیت کہتے ہیں واقف کی موت کے پہلے اس طرح کا وقف ہر آن و ہر لحظہ منسوخ ہو سکتا ہے۔ سنت جماعت کی شرع کے مطابق ایسا وقف جس کی غرض واقف کی موت کے بعد موثر و نافذ ہونے کی ہوتی ہے اُس وقت بھی نافذ ہو سکتا ہے جبکہ واقفِ متوفی کے ورثا متروکہ میں سے ایک ثلث مال وقف کی تعمیل میں دینے کے لیئے رضامند نہ ہوں۔

---

[1] دوویم عبداللہ حجام (باربر) بنام جان بی بی ۱۸۳۹ء فیلٹن کی رپورٹس صفحہ ۳۴۵- امام محمدؒ کا فتویٰ ہے کہ جب تک جائداد متولی کے قبضہ میں نہ آجائے وقف کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کی اس رائے پر فرقۂ حنفیہ نے کبھی عمل کیا اور نہ اس کو تسلیم ہی کیا لیکن مقام تعجب ہے کہ ہند کی انگریزی عدالتیں گزشتہ چند سال سے اس قول کو پسند کر کے اُس پر

شرع امامیہ شرائط متعلق تبدیل قبضہ

شیعوں کے مذہب میں اگر اشخاص عاقل و بالغ کے حق میں کوئی شئے وقف کی جائے تو جب تک قبضہ میں صریحی یا معنوی تبدیل نہو جائے یا کسی اور ذریعہ سے واقف کا اپنے حقوق مالکانہ متعلق شئے موقوفہ سے دست بردار ہونا ظاہر نہو جائے وقف ناقابل منسوخی نہیں ہوسکتا۔

لیکن جب کسی ایک یا متعدد کار خیر یا نابالغوں کے فائدہ یا رفاہِ عام کے واسطے وقف کیا جاتا ہے تو وقف کو ناقابلِ تنسیخ بنانے کے لیے تبدیل قبضہ کی ضرورت نہیں ہے۔

وقف جو بذریعہ وصیت کیا جاتا ہے اور جس کو موصی بعد از وفات جاری کرانا چاہتا ہے وہ سُنّی اور شیعہ دونوں کے مذہب میں جائز ہے اور موصی کی وفات کے پہلے کسی وقت منسوخ ہوسکتا ہے۔

شیعوں میں بھی مثل سنیوں کے ایسے وقف کا نفاذ جو مرض الموت یا ایسے مہلک مرض کی حالت میں کیا جائے جس کے بعد واقف کی ہلاکت واقع ہو جائے صرف ایک ثلث متروکہ پر ہوتا ہے بشرطیکہ متوفی کے ورثا اُس کی کل جائداد وقف کی تعمیل میں صرف کرنے پر رضامند نہ ہوں[له]۔

شرع حنفی۔ وقف میں لفظ دوام کے اظہار کی ضرورت نہیں

چونکہ اسلام کے کل فرقوں میں وقف کا دائمی ہونا شرط اہم ہے لہذا جائداد ہمیشہ کے واسطے وقف ہونی چاہئے لیکن امام ابو یوسف رح کے قول کے مطابق جو قاعدہ مسلمہ سمجھا جاتا ہے وقف میں لفظ دوام کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ وقف کرنے

[له] جسٹس محمود کی رائے جس کو انھوں نے بمقدمہ آغا علی خاں بنام الطاف حسین خاں ۱۸۹۱ء الہ آباد جلد ۱۴ صفحہ ۴۲۹ ظاہر کیا ہے اور جس پر بعد ازاں ہائی کورٹ الہ آباد کے جلسۂ کاملہ نے ایک دوسرے مقدمہ میں عمل کیا جو ڈیشل کمیٹی میں بمقدمہ باقر علی خاں بنام انجمن آرا بیگم ۱۹۰۲ء لاء رپورٹس انڈین اپیلز جلد ۳۰ صفحہ ۹۴ نامنظور کی گئی ہے۔ نیز دیکھو اسی مقدمہ کو جو کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۷ کے صفحہ ۴۶۵ پر شائع ہوا ہے۔

کے وقت لفظ وقف یا کسی دوسرے لفظ کا استعمال کرنا جس کا مفہوم وقف دائمی ہو کافی ہے۔ جب ایسا کوئی لفظ استعمال کیا جائے تو اُس سے شرعاً وقف دائمی مراد لیا جاتا ہے۔ جب وقف منقطع ہو جاتی ہو تو جو جائداد یا مال کہ وقف کیا گیا تھا وہ واقف کو مسترد ہونے کے بجائے ہمیشہ کے لئے محتاجوں کے فائدے کے واسطے وقف ہو جاتا ہے حالانکہ اس دوسری غرض کا وقف میں بصراحت بیان کرنا ترک ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔

شرع امامیہ۔ دائمی غرض کا اظہار کرنا لازم ہے

شیعوں کے مذہب میں وقف اس وقت تک جائز و صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کسی ایک غرض یا متعدد اغراض دائمی کا خواہ وہ منفرداً ہوں کہ مشترکاً بصراحت اظہار نہ کیا جائے۔ اگر وقف کسی ایسی غرض یا شئے کے واسطے کیا جائے جو ختم ہونے والی ہو تو اُس کے ساتھ کسی دائمی غرض و شئے کا صریحاً اظہار کیا جانا لازم ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی اولاد کے لئے جائداد وقف کرے تو چونکہ اولاد فنا ہونے والی ہے اس لئے جائدادِ موقوفہ کے استرداد کو روکنے کی غرض سے واقف کا فرض ہے کہ اولاد کے بعد صریح الفاظ میں اُس جائداد کو غربا یا کسی دائمی کار خیر کے واسطے جیساکہ مسجد یا امام باڑہ کا قیام و اجرا ہے وقف کردے۔

قول امامیہ بجز خاص صورتوں کے سپردگی موقوف بہ متولی ضرور ہے

شیعوں کے نزدیک موقوف کا متولی کے سپرد کیا جانا ضرور ہے بجز ذیل کی صورتوں کے:- جب وقف نابالغ اطفال یا کسی کار خیر یا عوام یا چند جماعتوں کے فائدے کے واسطے کیا جائے۔

لیکن جب واقف اپنے کو ہی متولی مقرر کرتا ہے تو سپردگی کی ضرورت نہیں۔ شیعوں کے مذہب میں جو کچھ وقف کے لئے ضرور ہے وہ یہ ہے کہ واقف کا حق مالکانہ شئے موقوفہ سے منتقل ہو کر واقف اُس شئے کا پھر مالک نہ رہے۔

عمارتوں اور درختوں کا وقف جائز ہے۔ اسی طرح جائداد منقولہ

کن چیزوں کا وقف ہو سکتا ہے

اور ہر ایک قسم کے مال اور شیئے کا جس کا وقتاً فوقتاً بدل ہو سکتا ہے یا جو شیئے قابل فروخت ہے اور جس کی قیمت یا منافع تجارت میں بغرض منفعت لگایا جا سکتا ہے وقف ہو سکتا ہے۔ آلات زراعت و حرب، تابوت (لاش اٹھانے کا صندوق یا پلنگ)، کفن، کتابیں، کفالت نامجات، اسٹاک (سرمایہ جو منافع پر کسی کمپنی کے ذریعہ سے تجارت میں لگایا جاتا ہے) شیرز (حصصِ تجارتی) وغیرہ کا وقف جائز ہے۔

اگر روپیہ وقف کیا جائے تو اُس کو منافع پر تجارت یا دوکانداری میں لگانا چاہیئے اور جو منافع اس روپیہ سے حاصل ہو اس کو ان اغراض پر صرف کرنا چاہیئے جس کے واسطے اصل روپیہ وقف کیا جاتا ہے[1]۔

جائداد قابل تقسیم کے جزو موقوفہ پر مشاع کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

جائداد مرہونہ کا وقف جائز ہے

ایسی جائداد کا وقف جو رہن کی گئی ہو یا کسی ہیٹہ دار یا اسامی کے قبضہ میں ہو جائز ہے اگر جائداد مرہونہ کا وقف کیا جائے تو اس کی آمدنی سے پہلے قرضہ ادا کیا جا کر رہن کا انفکاک کیا جائے گا اور قرضہ ادا ہو کر جائداد موقوفہ رہن کے بار سے سبکدوش ہونے کے بعد اس کی آمدنی اغراض وقف پر صرف کی جائے گی۔

---

[1] دیکھو ابوسعید خاں بنام باقر علی خاں ۱۹۰۱ء الہ آباد جلد ۲۴ صفحہ ۱۹۰۔ سکینہ خانم بنام لڈن صاحبہ (مرافعہ بنارس حکم فیصلہ ابتدائی نشان ۱۱۴ بابتہ ۱۹۰۱ء منفصلہ ۱۰ جون ۱۹۰۲ء۔ بمقدمہ کلثوم بی بی بنام غلام حسین قاسم عارف ۱۹۰۵ء کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۱۰ صفحہ ۹۹۴ فاضل جج نے فیصلہ جات بالا سے اختلاف کیا ہے اور حقیر مصنف نے اس نکتہ کے متعلق جو قانون بیان کیا ہے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھو محمڈن لا جلد ا صفحات ۱۷۶-۱۸۳) لیکن نہایت ادب سے اعتراض مذکور کا جواب دیا جاتا ہے کہ لائق و قابل جج نے اس مسئلہ کے متعلق فقہائے اسلام کے اقوال کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس غلط فہمی کی بنا پر اس طرح کا متضاد فیصلہ صادر فرمایا ہے چنانچہ میں نے ضمیمہ نشان ہیں چند وجوہ بیان کئے ہیں کہ کیوں اس قانون پر عمل کرنا چاہیئے جو اس مقام پر اور اُس دوسری کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

شرع حنفی کی رو سے وقف میں اس طرح کی شرط کہ جائداد موقوفہ کی آمدنی واقف کے فائدے کے واسطے صرف کی جائے یا اُس سے قرضہ جات ادا کئے جائیں جائز ہے۔

لیکن شیعوں کے نزدیک اس طرح کی شرط ناجائز ہے۔

فصل دوم
اقسام وقف

وقف کی تین قسمیں ہیں

علمائے اسلام کے نزدیک وقف کی تین قسمیں ہیں یعنے:۔

(۱) وقف جو اولاد مالدار کے واسطے اور بعد ازاں نادار کے لیئے ہو۔

(۲) وقف جو مالدار اور غربا دونوں کے لئے ہو۔

(۳) وقف جو محض غربا کے واسطے ہو۔

عموماً اشخاص منفرد کے واسطے پہلے قسم کا وقف کیا جاتا ہے۔

(۱) اولاد غیر متولد (یعنے ایسی اولاد جو پیدا نہ ہوی ہو) کے واسطے بھی بخلاف ہبہ وقف ہو سکتا ہے۔ اگر الف کی اولاد کے واسطے وقف کیا جائے اور الف کے اُس وقت اولاد نہ ہو تو اولاد ہوے تک اُس کا منافع غربا پر صرف کیا جاتا ہے۔

کن امور کے واسطے وقف ہو سکتا ہے

(الف) مسلمان یا کافر ذمی کے واسطے مگر کافر حربی کے لیئے (جو دار الحرب کا باشندہ یعنے دشمن ہو) وقف نہیں ہو سکتا۔

(ب) واقف اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے واسطے خواہ وہ مرد ہوں کہ عورت خواہ پیدا ہوے ہوں کہ نہوں وقف کر سکتا ہے۔

(ج) دوسرے اشخاص کی اولاد اور اولاد کی اولاد۔

(۷) واقف کے اعزا و اقربا، ہمسایہ، تابعین و متعلقین و ملازمین وغیرہ کے حق میں وقف کرنا جائز ہے۔

(۸) غیروں کے واسطے بھی وقف ہو سکتا ہے۔

بہر حال ہر ایک شخص کے حق میں جو کافر حربی یعنے پردیسی دشمن نہ ہو بلالحاظ عمر و جنس (تذکیر و تانیث) وقف ہو سکتا ہے یعنے ہر ایک شخص جو کافر حربی نہ ہو اور اُس کے واسطے کوئی امر مانع شرعی نہ ہو موقوف علیہ بن سکتا ہے۔

شرع حنفیہ میں واقف ماموں الیہ ہو سکتا ہے

(۹) حنفی شرع کی رو سے واقف اپنے کو پہلا امین مقرر کر سکتا ہے اور اگر حقیقت میں وہ امین مقرر ہو جائے تو اُس کو وقف کی کل یا جزو سے آمد لینا شرعاً جائز ہے۔

واقف کے قرضہ جات کی ادائی کے لئے جو شرط وقف میں لگائی جاتی ہے اس کو شرع حنفی نے جائز رکھا ہے۔

اقوال شیعہ

مذہب شیعہ کے مطابق اگر واقف جائداد موقوفہ کا انتظام اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے تو جو گزارہ وہ متولی کے لئے مقرر کرتا ہے اس کو خود لے سکتا ہے۔ مگر اس کے سوائے وہ وقف سے مزید فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ نیز قانون امامیہ میں موقوف علیہم کے ناموں کی (۱) تخصیص و صراحت اور (۲) وقف کا کسی شخص یا شئے موجودہ کے حق میں ہونے کی ضرورت ہے۔

شرع حنفی۔عام اصول

جب چند اشخاص پر وقف کیا جائے اور سوائے اس ایک غرض کے اُس وقف کی دوسری غرض نہ ہو تو اُن اشخاص کے ختم ہو جانے پر وقف عام غربا کے حق میں منتقل ہو جاتا ہے اور غربائے ملک۔ اصل میں اُس وقف کے سبب سے آخری ماموں الیہم متصور ہوتے ہیں لہذا اُن اشخاص و اغراض کے فوت ہو جانے سے جن کے لئے ابتداءً وقف کیا جاتا ہے وقف کی غرض کبھی مفقود نہیں ہو سکتی اور نہ وہ تمام ہوتا ہے۔

شرع اسلام کی رو سے جو وقف کہ کسی شخص کے اہل و عیال کی پرورش

پرورش اولاد کے لیے وقف کرنا کار خیر ہے

کے واسطے کیا جاتا ہے وہ کار خیر سمجھا جاتا ہے اور یہ مسئلہ اسلام کے کل فرقوں کا متفق علیہ ہے۔ بنائٔ علیہ اگر واقف اپنے اہل و عیال یا اولاد کے واسطے خاص کر وقف کرے اور اس کا خاندان یا اولاد ہی اُس وقف کے موقوف علیہم قرار پائیں تو شرعاً ایسا وقف جائز ہی نہیں ہے بلکہ نہایت مستحسن متصور ہوتا ہے۔ اور جب واقف کی اولاد ختم ہو جائے تو وہی وقف غربا پر منتقل ہوتا ہے۔

حضرت ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال کے مطابق اگر ایسے اشخاص یا اشیا کے واسطے وقف کیا جائے جن کو بقائے دائمی حاصل نہ ہو جیسا کہ عیال و اطفال کی حالت میں ہوتا ہے تو ایسی صورت میں کسی غرض دائمی و آخری کا وقف میں بصراحت ذکر کیا جانا ضرور ہے۔

قول ابو یوسفؒ قاعدۂ مسلّمہ

لیکن بموجب قول امام محمدؒ جب وقف میں لفظ وقف یا کوئی دوسرا اہم معنی لفظ استعمال کیا جائے تو غرض آخری کے اظہار کرنے کی پھر ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ خود لفظ وقف سے شرعاً قیاس کر لیا جاتا ہے کہ وقف دائمی ہے اور اغراض وقف کے مفقود ہونے کی صورت میں وہ وقف خود بخود غربا پر منتقل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ فرقۂ حنفیہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر عامل ہے اور ہندوستان کے حنفی امام محمدؒ کی رائے کو نہیں مانتے ہیں۔ لیکن ہائی کورٹ بمبئی نے ایک مقدمہ میں امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح دی ہے[1]۔

ہر چند ابتدا میں ہائی کورٹ کلکتہ نے ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اس قسم کے مقدمات کا تصفیہ کیا ہے لیکن چند سال سے اس نے بھی طرز عمل بدل دیا ہے اور بعض مقدموں کے فیصلوں میں اُس نے کبھی ابو یوسفؒ کی اور کبھی امام محمدؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

---

[1] دیکھو امرت لال بنام شیخ حسین ۱۸۸۷ء بمبئی جلد ۱۱ صفحہ ۲۶۴۔

ابوالفتح محمدؐ اسحاق بنام رسومائے دھر چودھری

بمقدمۂ ابوالفتح محمدؐ اسحاق بنام رسومائے دھر چودھری[1] پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی نے شرع محمدیؐ میں حسب ذیل اصول قرار دیا ہے:- شرع محمدیؐ کی رو سے تملیک دوامی جو بغرض انتفاع عیال و اطفال و اہل قرابت بطور وقف مرتب ہو اور دنیا کو دھوکہ میں ڈالنے کی غرض سے اُس میں اس امر کی صراحت کردی جائے کہ سب سے آخر میں اُس وقف سے غربا مستفید ہوں گے تو جائز نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر اس عبارت سے جوڈیشل کمیٹی کا یہ مطلب ہے کہ وقف جو کسی کے عیال و اطفال پر پہلے کیا جائے ناجائز ہے تو نہایت ادب سے عرض کیا جاتا ہے کہ جن آرا کا معزز و لائق ارکان کمیٹی نے اس فیصلہ میں اظہار فرمایا ہے وہ بالکل شرع محمدیؐ اور اقوام اسلام کے عام خیالات یعنے اجماع اسلام کے خلاف و متضاد ہیں۔

دیر لارڈ شپس (معزز جہان جوڈیشل کمیٹی) کے بیان کے مطابق بھی اس امر کے ثابت ہونے پر کہ جائداد موقوفہ کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ ایسے کارہائے خیر یا اُن رسوم کی ادائی جیسا فاتحہ و قرآن خوانی ہیں یا امور خیرات کی انجام دہی میں جو مسلمانوں کی شرع اور رسم و رواج سے جائز سمجھے جاتے ہیں صرف کیا جاتا ہے یا صرف ہونے والا ہے تو اس طرح کا وقف جائز ہے[2]۔

اصول مندرجۂ بالا سے یہ نتیجہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ اگر واقف جائداد موقوفہ کی آمدنی سے ایک معقول رقم اپنے متعلقین اہل و اطفال قرابت داروں اور ملازموں کی پرورش کے واسطے مخصوص کردے یا یہ رقم

---

[1] ۱۸۹۴ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۲۲ صفحہ ۷۶ مطابق کلکتہ جلد ۲۲ صفحہ ۶۱۹۔ اسی قسم کے خیالات کا بمقدمۂ فضل الرحیم ابواحمد بنام محمد عبدالعلیم ابوالحسن ۱۹۰۲ء کلکتہ جلد ۲۹ صفحہ ۶۶۶ اور بمقدمۂ محمدؐ مجاور علی بنام رضیہ بی بی (۱۹۰۰ء) الہ آباد جلد ۲۲ صفحہ ۳۲۰ اظہار ہوا ہے۔

[2] پھول چند بنام اکبر یار خاں ۱۸۹۶ء الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۱۔

اُن کو باوقات مقررہ جیسا کہ اکثر مسلمانوں کے خاندانوں میں رواج ہے دئے جانے کے لئے وقف نامہ میں کوئی شرط عائد کرے تو وقف جائز ہوسکتا ہے۔

میر محمد اسمعیل خاں بنام ساشٹی چرن گھوش

چنانچہ اس طرح کا وقف بمقدمۂ میر محمد اسمٰعیل خاں بنام ساشٹی چرن گھوش[۱] عدالت سے جائز قرار پایا ہے۔ اس میں واقف نے جائداد کی ایک ثلث آمدنی اپنے متعلقین، اقربا اور ملازمین کے واسطے اور دوسرے ایک ثلث کو جائداد موقوفہ کے قیام و مصارف تعمیر و ترمیم کے لئے اور تیسرے ثلث کو متولی کے گزارہ کے واسطے مقرر کیا تھا۔

ایک وقف کے متعلق جس میں از روئے وقف نامہ آمدنی کو اولاً معطی کی اولاد و احفاد اور اقربا کی پرورش پر صرف کرنے اور رقم فاضل کو ایسے نیک کاموں پر جو فی الحقیقت مذہبی ہوں خرچ کرنے کی ہدایت درج تھی۔ ہائی کورٹ الہ آباد نے تجویز کی کہ اس طرح کا وقف قانوناً جائز ہوسکتا ہے[۲]۔ اور شرعاً بھی اس طرح کا وقف ناجائز نہیں ہے۔

(۲) دوسری قسم کا وقف متمول اور غربا دونوں کے فائدہ کے واسطے کیا جاسکتا ہے اور اس سے دونوں مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں مثلاً مساجد امام باڑہ مدارس کاروان سرائے چاہ دکوئیں سڑکوں وغیرہ کے واسطے وقف ہوسکتا ہے۔

(۳) تیسری قسم کا وقف محض غربا کے لئے مخصوص ہے جیسا کہ فقرا کے واسطے محتاج خانے لنگر خانے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

مقام عبادت سے کس طرح واقف کی ملکیت زائل ہوتی ہے

اگر کسی عمارت یا جگہ کو اس کا مالک مسجد، عید گاہ یا جائے صلواۃ کے واسطے وقف کرنا چاہے تو اس کی ملکیت اس کے اعلان صریح سے یا اس مقام پر مصلیوں

---

[۱] سنہ ۱۸۹۲ء کلکتہ جلد ۱۹ صفحہ ۴۱۲۔

[۲] دیوکی پرشاد بنام عنایت اللہ سنہ ۱۸۹۲ء الہ آباد جلد ۱۴ صفحہ ۳۷۵۔

کے نماز پڑھنے سے زائل ہوتی ہے حتیٰ کہ کسی ایک آدمی کے ایسے مقام پر نماز پڑھنے سے واقف کا حق مالکانہ اس جگہ میں باقی نہیں رہتا۔

قبرستان کے متعلق ملکیت کا زائل ہونا

یہی قبرستان کی کیفیت ہے کہ اگر کسی شخص کی زمین میں کوئی نعش دفن ہو جائے تو مالک کا حق اُس زمین پر باقی نہیں رہتا بشرطیکہ اُس کی نیت اُس کو قبرستان کے واسطے وقف کرنے کی ہو۔

جن زمینوں کے متعلق قبرستان بنانے کے لئے صریحاً کوئی وقف موجود نہ ہو لیکن اُن میں اموات دفن ہوتے ہوں اور قبور موجود ہوں اُس طرح کی زمینیں متبرک اور مقدس سمجھی جاتی ہیں اور اس بنا پر وہ ناقابل انتقال و ناقابل توریث متصور ہوتی ہیں لیکن جس زمین پر معدودے چند قبریں ہوں تو وہاں کا پورا قطعۂ زمین مقدس نہیں سمجھا جاتا بلکہ زمین کا صرف اتنا حصہ جس پر کہ قبور واقع ہیں قابل احترام خیال کیا جاتا ہے[1]۔

ایسے معمولی مذہبی رسوم کی ادائی کیواسطے جیسا کہ قبروں کی فاتحہ و قرآن خوانی یا اولیا و مشائخین یا آبا و اجداد کے سالانہ اعراس یا عزیز و اقارب کے مقابر کی چادر گل و چراغانی ہے وقف کرنا جائز ہے۔

فصل سوم

وقفِ خانقاہ وغیرہ

چونکہ درگاہیں اولیا اللہ اور بزرگان دین کے مقبرے ہیں اس لئے وہ مقامات متبرک متصور ہوتے ہیں اور اُن کی زمینوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ وقف جو درگاہوں، امام باڑوں اور خانقاہوں کے واسطے کیا جائے

---

[1] میر نوازعلی بنام مجیدا وغیرہ سنہ ۱۸۳۱ء سلکٹ رپورٹ جلد ۵ صفحہ ۱۳۶۔

وہ جائز ہے۔ خانقاہ وہ مقام ہے جہاں عابد و زاہد مسلمان عبادت میں مشغول ہوتے ہیں یا تعلیم مذہبی پاتے اور تزکیۂ نفس کے لئے شائقین مذہب رہا کرتے ہیں۔

مسئلہ تعبیر اوقاف اسلام

قانون انگلستان کے مشہور مسئلۂ تعبیر کا پوری طرح سے اوقاف اسلام پر اطلاق ہوتا ہے شرع محمدی میں بھی کبھی کوئی وقف غرض وقف یعنے موقوف علیہ کے مفقود ہونے پر ناتمام نہیں رہتا کیونکہ وقف نامہ میں پہلے سے اس امر کا بصراحت انتظام کر دیا جاتا ہے کہ ایک غرض کے ختم ہونے پر اُس کی جگہ اُس کے مماثل و مشابہ دوسری غرض قائم کر دی جائے مثلاً جو وقف کسی مخصوص محلہ یا مقام کی مسجد کے واسطے کیا گیا ہو اور چند سال کے بعد وہ محلہ ویران ہو جائے تو وقف ساقط نہیں ہوتا بلکہ شرع کا حکم ہے کہ اُس وقف سے کسی دوسری قریب کی مسجد کو فائدہ پہنچایا جائے اور یہی حالت اُن اوقاف کی ہے جو محتاج خانوں، کاروان سرائے، نہروں، حوضوں وغیرہ کے واسطے کئے جاتے ہیں۔

شرع حنفی کے مطابق جب چند اشخاص کے فائدہ کے لئے یا عموماً اپنی اولاد کے واسطے کوئی شخص وقف کرتا ہے تو اُن اشخاص یا اولاد کے ختم ہونے پر وقف خواہ وقف نامہ میں اس امر کی صراحت کی گئی ہو کہ نہیں غربا پر منتقل ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی اولاد اور اُن کی نسلوں کے واسطے وقف کرے تو واقف کی جس قدر اولاد بشمول اولاد طبقۂ ثانیہ وغیرہ جو وقف کے وقت موجود رہے اس سے مستفید ہونے کی مستحق سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ وقف نامہ میں نسلاً بعد نسلٍ یعنے ایک طبقہ کے بعد دوسرے طبقہ کی اولاد مستفید ہونے کے متعلق تخصیص نہ کر دی گئی ہو۔

فصل چہارم

متولی

تولیت

واقف کا اپنے لئے تولیت کو محفوظ رکھنا جائز ہے یعنے شرعاً وہ وقف کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھ سکتا ہے لیکن جبکہ وقف میں کسی امین یعنے متولی کا تقرر نہ ہو اور نہ واقف نے اُس کی تولیت کو صاف الفاظ میں اپنے لئے مخصوص کیا ہو تو متولی کا منصب بھی بحیثیت واقف اُسی کو ملتا ہے۔

اختیارات جج یا قاضی

واقف کو اختیار ہے کہ بعد از وقف اپنی زندگی میں جب چاہے متولی کا تقرر کرے لیکن اگر بصراحت کسی شخص کو اس خدمت پر نامزد کرنے کے بغیر وہ مرجائے تو متولی مقرر کرنے کا اختیار واقف کے وصی کو منتقل ہوتا ہے اور اگر وصی بھی نہ مقرر ہوا ہو تو قاضی یعنے جج اپنے اختیار سے متولی کو مقرر کر سکتا ہے۔

موقوف علیہم کا اختیار تقرر متولی

جب وقف کسی محدود اور معین جماعت اشخاص کے واسطے کیا جاتا ہے تو موقوف علیہم متولی کا انتخاب کر سکتے ہیں بناءً علیہ کسی مسجد کے نمازی یا عابد و زاہد اشخاص وقف متعلقہ کے لئے متولی مقرر کریں تو جائز ہے۔

متولی کا (۱) بالغ اور (۲) عاقل و باشعور ہونا ضرور ہے۔ لیکن اُس کا خود مختار اور مسلمان ہونا لازم نہیں ہے۔

عورت متولی بن سکتی ہے

عورت کا تولیت پر تقرر ہو سکتا ہے[1]۔ لیکن جب وقف میں مرد کو ہی بحیثیت متولی ذکور فرائض مذہبی کو انجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے اُس کی تولیت کے لئے عورت کا انتخاب

---

[1] بیران بی بی بنام عبدالکریم ۱۸۹۱ء کلکتہ جلد ۱۹ صفحہ ۲۰۳ - ۱۳ - اس کے سوائے دیکھو حیاتی خانم

ہونا درست نہیں ہے۔[۱]

مثلاً جب درگاہ یا خانقاہ کے متولی کا سجادہ نشین لقب ہو (سجادہ کے معنی جانماز یعنے بوریائے نماز ہے اور نشین سے مراد شخص جو جانماز پر بیٹھے) تو وہاں تولیت عورت کو نہ ملنی چاہئے۔ سجادہ نشین درگاہ یا خانقاہ کا نہ صرف متولی ہوتا ہے بلکہ معلم وہادی روحانی بھی ہوتا ہے لہذا سجادہ نشین کی خدمت پر عورت کا تقرر نہیں ہوسکتا البتہ وہ متولی بنائی جاسکتی ہے۔

جن صورتوں میں کہ روحانی اور مذہبی فرائض اور دنیوی فرائض میں امتیاز ہوسکتا ہے اور اس دوسری قسم کے فرائض بذریعۂ نیابت بھی انجام پاسکتے ہیں تو اُن میں عورت کا خدمتِ سجادہ نشینی کو انجام دینا صحیح ہوسکتا ہے۔

جب ایک مرتبہ متولی کا تقرر ہوجائے تو واقف اس کو پھر برطرف نہیں کرسکتا بشرطیکہ وقف کرنے کے وقت اس نے برطرفی متولی کا اختیار اپنے لئے محفوظ نہ کرلیا ہو۔

لیکن معزولی متولی کے خلاف وقف نامہ میں شرط موجود رہنے کے باوجود قاضی یا جج بصورت خیانت متولی کو اپنے اختیار سے علحدہ کرسکتا ہے۔

جب تک متولی کی صحت اچھی رہے اور وہ کام کرنے کے قابل ہو بشرطیکہ اس کے اختیارات عام ہوں یعنے وقف کے مالہ وماعلیہ اور جزئیات کی نسبت اس پر کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو وہ اپنی خدمت کسی دوسرے شخص کے تفویض کرسکتا ہے اور نہ بطور خود دوسرے کو اس کا متولی بنا سکتا ہے۔

متولی اپنی جگہ پر بشرطیکہ اس کے اختیارات عام نہوں دوسرے کا تقرر نہیں کرسکتا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ بنام کلثوم خانم ۱۸۱۴ء سلکٹ رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ وصفحہ ۲۱۷۔

[۱] حسین بی بی بنام حسین شریف ۱۸۶۹ء مدراس ہائی کورٹ رولنگز جلد ۴ صفحہ ۲۳۔ مجاور ابراہیم بی بی بنام مجاور حسین شریف ۱۸۸۰ء مدراس جلد ۳ صفحہ ۹۵۔ دیکھو شاہ امام بخش بنام بی بی شاہی ۱۸۳۵ء سلکٹ رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۲۲۔

لیکن جب متولی کے اختیارات عام نہوں تو صرف مرنے کے وقت اور اگر وہ پیرانہ سالی یا مرض وغیرہ کے سبب سے کار تولیت کو نہ چلا سکتا ہو تو اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کر سکتا ہے[1]۔ اس کے علاوہ متولی عدالت سے درخواست کر کے اپنے کو خدمت سے سبکدوش کر سکتا ہے۔

لیکن وقت مرگ یا ناقابلیت کار کی صورت میں اپنا قائم مقام مقرر کر سکتا ہے

جب وقف نامہ میں تقرر جانشین متولی کی بابت کوئی قاعدہ درج ہو تو متولی اپنے مرنے کے وقت اور اگر پیرانہ سالی کی وجہ سے اُس میں قابلیت کار باقی نہ رہے تو اپنی زندگی میں اپنا قائم مقام مقرر کر سکتا ہے۔

لیکن جب واقف نے قائم مقامی متولی کی نسبت وقف نامہ میں کوئی طریقہ بتلایا ہو یا چند احکام درج کئے ہوں تو متولی پر اُن قواعد و شرائط کی پابندی لازم ہے اور وہ اُن احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا ہے۔ اور اگر واقف نے تولیت کسی خاندان کے سلسلۂ ذکور میں مخصوص کر دی ہے تو جس قدر موقوف علیہم اور مہتمم وغیرہ اُس وقف کے ہیں ان کو سلسلۂ تولیت کے بدلنے کا ہرگز اختیار نہیں ہے بلکہ تولیت اُسی ایک خاندان کی اولادِ نرینہ میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے گی۔ یا اگر واقف کی خواہش ہو کہ الف کے بعد وقف کا ب متولی مقرر کیا جائے تو الف کو اپنی جگہ پر ج کو مقرر کرنے کا مطلق اختیار نہیں ہے اور نہ ج ہی تولیت کے سلسلہ کو بدل سکتا ہے۔

واقف کے کسی ایسے قرابت دار کی موجودگی میں جو کار تولیت کو انجام دینے کا اہل ہو کسی ”غیر“ کا خدمتِ تولیت پر تقرر نہ ہونا چاہئے۔

لیکن کلکتہ ہائی کورٹ نے اس کے برعکس متولی کا بہ سبب خرابی صحت

---

[1] دیکھو شیخ امیر علی بنام سید وزیر حیدر ۱۹۰۵ء کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۹ صفحہ ۸۷۶ - عدالت نے جو رائے واحد علی بنام اشرف حسین ۱۸۸۲ء کلکتہ جلد ۸ صفحہ ۷۳۲ کے فیصلہ میں ظاہر کی ہے اس کو شرط مندرجہ بالا کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔

بانی وقف کے قرابت داروں کے سوائے کسی غیر شخص کو اپنا جانشین مقرر کرنا جائز قرار دیا ہے اور طے کیا ہے کہ متولی پر ایسی حالت میں واقف کے اقربا سے ہی کسی کو اپنی جگہ پر مقرر کرنا فرض نہیں ہے[1]۔ بہرحال جو رائے کہ فیصلۂ محولہ میں عدالت مذکور نے ظاہر فرمائی ہے وہ شرع محمدی کی رو سے احکام وقف کے مطابق نہیں ہے اس لئے اُس کو اُس مقدمہ کے مخصوص حالات سے مختص سمجھنا چاہیئے۔

انتقال جائداد موقوفہ ناجائز ہے

جائداد موقوفہ کو بذریعۂ بیع یا رہن منتقل کرنا خواہ ایسا انتقال عارضی ہو کہ دائمی اور خواہ اُس کا مقصد وقف کو فائدہ پہنچانا ہو کہ نہیں جب تک اُس کو منتقل کرنے کے پہلے جج کی منظوری حاصل نہ کر لی جائے شرعاً جائز نہیں ہے۔

اگر دستاویز وقف میں تنخواہ متولی کی بابت کوئی صراحت نہ ہو متولی کے لئے معاوضہ مقرر کرنا قاضی کا فرض ہے اور تعین شرح تنخواہ کے واسطے ہر ملک و مقام کے رسم و رواج کا لحاظ کرنا ضرور ہے کیونکہ اس کے متعلق کوئی قاعدہ نہیں بتلایا گیا ہے لیکن عموماً محاصل جائداد موقوفہ کا دسواں حصہ اس کام کے لئے صرف ہو سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس قاعدہ کا اطلاق صرف ان ہی متولیوں پر کیا جاتا ہے جن کا آمدنی وقف میں کوئی حصہ نہیں ہوتا[2]۔

متولی بجز اجازت صریح واقف جائداد موقوفہ کو زیر بار نہیں کر سکتا

ہدایات واقف کے بغیر یا ان کی عدم موجودگی میں یا اُن کے خلاف متولی وقف کے واسطے قرض نہیں لے سکتا اور نہ جائداد موقوفہ کو کسی طرح سے زیر بار و مکفول کر سکتا ہے جس کے سبب سے قرضہ کی ادائی جائداد مذکورہ پر لازم ہو سکے۔ البتہ واقف کی اجازت صریح سے متولی کو

---

[1] شیخ امیر علی بنام سید وزیر حیدر حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

[2] محی الدین بنام سعید الدین ۱۸۹۰ء کلکتہ جلد ۲۰ صفحہ ۸۱۰۔

اغراض وقف یا اُس کے فائدے کے لیئے جائداد کو زیر بار کرنے اور قرضہ لینے کا اختیار حاصل ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان بذریعہ وصیت دوسرے مسلمان کو متولی مقرر کرکے اپنی کچھ جائداد اسلام کے بعض فرائض مذہبی کی انجام دہی کی غرض سے وقف کردے اور بعد ازاں اس جائداد پر سے متولی مذکور کا قبضہ ہٹا کر کسی دوسرے غیر مسلم کے ہاتھ اس غرض سے فروخت کرے کہ مشتری واقف کی ہدایات سابقہ پر عمل کرکے ان ہی فرائض مذہبی کو بطور متولی انجام دلواتا ہے جائز نہیں ہے۔[1]

فصل پنجم

اصول متفرق

جو وقف کہ اولاد کے لیئے کیا جائے اُس میں اولاد ذکور و اناث دونوں شریک ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی اولاد اور اُن کی نسلوں کے فائدے کے واسطے وقف کرتا ہے تو بجز اس شرط صریح کے کہ نسلاً بعد نسلٍ وقف کا فائدہ پہنچتا رہے واقف کی ایسی کل اولاد جو بوقت وقف موجود ہے حالانکہ اُس میں طبقۂ ثانیہ و ثالثہ کی اولاد بھی شریک ہوسکتی ہے وقف سے متمتع ہونے کی مستحق ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی اولاد کے فائدے کے واسطے وقف کرے اور موقوف علیہم کا سلسلہ نہ بتلائے یعنے کس شخص کے یا کس نسل کی اولاد کے بعد دوسرا شخص یا دوسری نسل کی اولاد مستفید ہونے کا حق رکھتی ہے تو ایسی صورت میں اولاد قریب و اولاد بعید دونوں کو شامل کرکے منافع وقف ان میں علی السویہ تقسیم ہوگا۔

---

[1] کشن چند بساوت بنام سید نادر حسین ۱۸۸۸ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۱۵ صفحہ ۱۔

فصل ششم

حق نالش

وقف عام کی صورت میں ہر ایک مسلمان کو اُس کے جاری کرانے کے لئے دعویٰ کرنے کا قدرتی حق حاصل ہے - نیز ایسے اشخاص جن کا آمدنی وقف میں حصہ ہو عدالت سے رجوع ہو کر اپنا حق جاری کرا سکتے ہیں -

چونکہ متولی کی وصی کی سی حیثیت ہوتی ہے اس لئے دو متولیوں کا کام اور انتظام مثل دو وصیوں کے ناجائز ہے اور از روئے شرع بعض امور میں دو متولی مثل دو وصیوں کے متصور ہوتے ہیں -

لیکن جب واقف نے اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو انتظام وقف کا متولی مقرر کر لیا ہے تو اس دوسرے شخص کا پہلے کے ساتھ شریک رہنا جائز ہے -

جب کسی وقف کے چند متولی ہوں تو بصورت نالش وہ کل دعویدار قرار پا سکتے ہیں لیکن اگر اُن میں سے بعض مدعی بننا نہ چاہیں تو متولیان دعویدار کو لازم ہے کہ اُن کو زمرۂ مدعی علیہم میں شریک کریں -

موقوف علیہ کا حق دعویٰ

موقوف علیہ جج کی اجازت کے بغیر مال یا جائداد کے تلف شدہ حصہ کی واپسی کا دعویٰ بمقابلہ متولی نہیں کر سکتا - اسی طرح اگر جائداد موقوفہ کا کچھ حصہ کسی نے غصب کر لیا ہو تو بجز تولیت حاصل ہونے کے موقوف علیہ ایسے نقصان کی تلافی کا دعویٰ بلا اجازتِ عدالت نہیں کر سکتا یعنے جب تک وہ بحیثیت امین (یا متولی) جائداد وقف میں حق انتفاع نہ رکھتا ہو نالش نہیں کر سکتا - لیکن موقوف علیہ متولی کے خلاف بصورت خیانتِ مجرمانہ یا منافع وقف میں اپنا حصہ قائم کرانے کی غرض سے دعویٰ کرنے کا مجاز ہے -

جب جائداد وقف کو اُس کے موجودہ متولیانِ قابض کسی دوسرے کو منتقل کر دیں تو وہ اشخاص جو اُن کے بعد تولیت کو ارثاً پانے والے ہیں

جائداد مذکورہ کے منتقل کرنے والوں کے مرنے کے بعد بذریعۂ نالش اس طرح کے انتقال کو ناجائز قرار دلوانے اور اُس جائداد کو اُس کی غرض اصلی کی طرف مسترد کرانے کے مستحق ہیں[1]۔

اگر کسی مسجد کا کوئی نمازی جائداد وقف کے انتقال کو جو کسی شخص غیر کو منتقل ہوئی ہے منسوخ کرانے کی غرض سے نالش عدالت میں دائر کرے تو اُس کا دعویٰ دفعہ ۵۳۹ مجموعہ ضابطۂ دیوانی (ایکٹ ۱۴ ۱۸۸۲ء)[2] کے تحت میں نہیں آسکتا کیونکہ اس دفعہ کا اطلاق صرف اُن اوقاف پر ہوسکتا ہے جو مذہبی یا خیراتی کاموں یا عوام کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کئے جاتے ہیں اور اُس کے انتظام و اہتمام کی نسبت عدالت ہدایت کرتی ہے۔ دفعہ ۵۳۹ کا اشخاص غیر پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

ضابطۂ مذکور کی دفعہ ۵۳۹ مقدماتِ نزاعی و مقدماتِ غیر نزاعی دونوں سے متعلق ہے اور اس دفعہ کی تحت میں دعویٰ کو لانے کے لئے جن حقوق کا اُس میں ذکر کیا گیا ہے وہ حقوق محصلہ و موجودہ ہیں اور جو حقوق کہ کسی امید یا واقعۂ اتفاقی پر منحصر ہوتے ہیں اُن کا اس دفعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آئندہ حق پیدا ہونے کی توقع محض یا مال و جائداد متنازعہ کا انتظام وراثتاً ملنے کا امکانِ موہوم حق نالش کو اس دفعہ کی ضمن میں لانے کے لئے کافی نہیں ہیں[3]۔

جب دو معمولی اشخاص کے درمیان کسی جائداد وقف کی تولیت کے واسطے نزاع ہو تو ایسا دعویٰ ضابطۂ دیوانی کی دفعۂ ۵۳۹ کے اثر سے خارج ہے اور اس بنا پر رجاع نالش کے واسطے ایڈوکیٹ جنرل سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] قاضی حسن بنام بھن بال کرشنا ۱۹۰۰ء بمبئی جلد ۲۴ صفحہ ۱۷۰۔ اس کے سوائے دیکھو ساجد رضا چودھری بنام گور موہن داس ۱۸۹۶ء کلکتہ جلد ۲۴ صفحہ ۲۴۸۔

[2] دفعہ ۹۲، ایکٹ ۵ ۱۹۰۸ء۔

[3] محی الدین بنام سعید الدین، جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

چونکہ ہر ایک مسلمان کو کسی مسجد یا مقام موقوفہ میں نماز پڑھنے کا شخصی و قدرتی حق حاصل ہے اور اُس کا تعلق دوسرے نمازیوں سے نہیں ہے لہذا اگر کوئی مصلی یا عبادت گزار مجموعۂ ضابطۂ دیوانی کے دفعۂ ۳۰ کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اُس کے مقدمہ پر جو اُس نے کسی وقف اسلامی کے متولی کی علٰحدگی کی نسبت کیا ہو عدم تعمیل دفعۂ مذکور کا اثر نہیں پڑ سکتا۔

فصل ہفتم

ہدایات واقف

ہدایات واقف اگر واقف کی خواہشیں شرع کے مطابق ہوں تو اُن کی تکمیل متولی پر اُسی طرح لازم ہے جیسا کہ احکام شرع کی پابندی۔

لیکن بعض مخصوص حالات میں قاضی اپنے اختیار سے ہدایات واقف میں تبدل و تغیر کر سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی مخصوص آدمی یا غرض کے واسطے کسی خاص طریقہ سے وقف کرتا ہے تو واقف کی خواہشوں کی تعمیل اُسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک کہ وہ غرض باقی رہتی ہے اور جب وہ مفقود ہو جاتی ہے تو وقف عام غربا کے واسطے منتقل ہو جاتا ہے۔

جج کا اختیار تمیزی اگر واقف متولی کی نسبت یہ شرط درج کر دے کہ وقف میں خیانت مجرمانہ کرنے کے باوجود اُس کو تولیت سے نہ ہٹایا جائے تو اس طرح کی خواہش کی تعمیل قاضی کے اختیار تمیزی پر منحصر ہے یعنے جس صورت میں کہ متولی فی الواقع خیانت مجرمانہ کا مرتکب ثابت ہو قاضی اُس کو بخلاف ہدایات واقف تولیت سے موقوف کر سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر وقف میں جنس خیرات کرنے کی ہدایت ہو تو قاضی بجائے جنس روپیہ خیرات کرا سکتا ہے۔

علاوہ بریں قاضی اپنے اختیار تمیزی سے وقف کو فائدہ پہنچانے کی

غرض سے انتظام مقررہ میں رد و بدل کر سکتا ہے لیکن اس قسم کی ترمیم عموماً واقف کے خواہشوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مثلاً واقف کی خواہش ہو کہ جائداد وقف ایک سال سے زیادہ کے پٹہ پر نہ دی جائے اور لوگ اس مدت پر اُس کا پٹہ لینے پر راضی نہوں تو قاضی اپنے اختیار سے متولی کو ایک سال سے زیادہ طویل پٹہ پر جائداد دینے کی اجازت دے سکتا ہے۔

باب سوم

وصیت

مشاہدات عام

کسی مال کا خواہ وہ عین ہے یا دین دوسرے کو شرعاً اس طرح مالک بنانا کہ تملیک مالک بنانے والے کے زمانۂ مابعد موت کی طرف مُضاف ہو وصیت کہلاتا ہے۔

وصیت زبانی ہو سکتی ہے بشرطیکہ موصی ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے اُس کی نیت صریح کا اظہار ہوتا ہو۔ بہر حال جب تحریر یا تقریر سے وصیت کنندہ کا صاف منشا پایا جائے کہ وہ اپنے مرنے کے بعد انتقال جائداد کو موثر بنانا چاہتا ہے تو ایسا فعل وصیت متصور ہوتا ہے۔

انتقال جائداد بذریعہ وصیت کا کس طرح نفاذ ہوتا ہے

وصیت کے ذریعہ سے ایک شخص دوسرے کو اپنا مال و جائداد ہبہ کر سکتا ہے یا اُس کو وقف کر کے اُس کے منافع سے موہوب لہ کو فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ کسی ایک یا متعدد اغراض و اشخاص کے واسطے بھی بذریعۂ وصیت وقف ہو سکتا ہے اور وقف بالوصیت کا حسب ذیل

طریقہ ہے :—

"میں نے وصیت کی ہے کہ میری فلاں شئے فلاں شخص کو دی جائے"
یا میں نے فلاں شخص کی طرف (یعنے واسطے) وصیت کی ہے یا کسی ایسے لفظ یا الفاظ کا استعمال کرے جن سے پایا جائے کہ موصی نے جس جائداد یا مال کو ہبہ کیا ہے وہ اُس کو اپنی موت کے بعد نافذ کرانا چاہتا ہے۔

ایک خط کے متعلق جس میں موصی کے چند ہدایات اُس کی جائداد کے ہبہ کی نسبت درج تھے کہ وہ اُس کے مرنے کے بعد نفاذ پائے طے پایا کہ اس طرح کا رقعہ ایک صحیح وصیت نامہ ہے[۱]۔

جواز وصیت لسانی

تحریر کے ذریعہ سے وصیت کرنے کی شرعاً کوئی مجبوری نہیں ہے بلکہ شرع محمدی میں وصیت لسانی ثابت ہونے پر اُسی طرح وہ جائز متصور ہوتی ہے اور اُس کا وہی اثر ہے جو ہبہ بالوصیت (انتقال جائداد بالوصیت) کا ہونا چاہیئے[۲]۔

جواز وصیت بالاشارہ

اشاروں کے ذریعہ سے بھی وصیت ہو سکتی ہے چنانچہ گونگا جو بات نہیں کر سکتا اور اپنے مطلب کا اشارے کنائے اور علامت و حرکت جسمانی سے اظہار کرتا ہے اشارے اور علامت کے ذریعہ سے وصیت کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایسے مریض کا اشاروں کے ذریعہ سے وصیت کرنا جو کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر لکھنے اور کہنے کی قوت نہ رکھتا ہو جائز ہے

بروئے مذہب شیعہ ہبہ کی نوعیت خواہ وہ وصیت کے ذریعہ سے عمل میں لایا جائے یا معطی کے حین حیات واقع ہووے یعنے وہ زمانہ موجودہ میں یا زمانہ مستقبل میں مثل وصیت نفاذ پائے موصی کے ارادہ پر منحصر ہے۔

وصیت مشروط یا کسی واقعۂ اتفاقی پر منحصر ہو سکتی ہے۔

---

[۱] مظہر حسین بنام بودھا بی بی ۱۸۹۸ء الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۹۱۔
[۲] محمد الطاف علی خاں بنام احمد بخش ۱۸۷۶ء ویکلی رپورٹر جلد ۲۵ صفحہ ۱۲۱۔

جب کسی واقعہ کے ظاہر ہونے پر وصیت کا عمل منحصر کیا جائے تو اُس واقعہ کے پیش نہ آنے کی صورت میں ویسی وصیت نافذ نہیں ہو سکتی ہے۔

فصل دوم

جس طرح دوسرے قسم کے انتقالات جائداد میں منتقل کرنے والے کی قابلیت دیکھی جاتی ہے اُسی طرح معاملۂ وصیت میں موصی کی قابلیت کا لحاظ کیا جاتا ہے لہذا وصیت کرنے والے میں حسب ذیل اوصاف کا ہونا لازم ہے:—

(الف) موصی کا صحیح العقل ہونا۔

(ب) اُس کا عاقل و بالغ ہونا[1]۔

اور (ج) وصیت کا بلا کسی جبر اور دباب ناجائز کے کیا جانا لازم ہے[2]۔

نابالغ میں انتقال جائداد بذریعۂ وصیت کی قابلیت نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اگر حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد مرد یا عورت جیسی کہ صورت ہو اُس انتقال جائداد کی جس کو اُس نے بذریعہ وصیت نابالغی کے زمانہ میں کیا ہے توثیق کر دے تو وصیت ابتدا سے جائز سمجھی جاتی ہے۔

جس شئے یا جائداد یا حق کی وصیت کی جاتی ہے اُس کا بوقت وصیت موجود رہنا ضرور نہیں ہے۔ بہرحال اس طرح کی وصیت صرف اُس صورت میں جائز ہو سکتی ہے جبکہ موصی کے مرنے کے وقت وہ شئے یا حق جس کی اُس نے وصیت کی ہے اُس کو حاصل ہو گیا ہو۔

---

[1] دیکھو صفحہ ماسبق

[2] فقہ کی کتابوں میں جواز وصیت کے متعلق جو شرط حریت لگائی جاتی ہے اُس سے مراد یہ ہے کہ مملوک (یا غلام وغیر شخص آزاد) اپنی کوئی جائداد نہ اپنی زندگی میں اور نہ بذریعۂ وصیت منتقل کر سکتا ہے۔

فصل سوم

کن لوگوں کے واسطے وصیت ہوسکتی ہے

اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک دوسرے ورثا کی رضامندی کے بغیر کسی ایک وارث کے حق میں وصیت کا کیا جانا ناجائز ہے[1]۔

اور جس شخص کے حق میں وصیت کی جاتی ہے اُس کا وارثِ موصی ہونے یا نہونے کا تصفیہ وصیت کے وقت نہیں بلکہ موصی کی وفات پر ہونا چاہئیے۔

لیکن جب اشخاص غیر یا کسی خیراتی اور نیک کام کے لئے وصیت کی جائے تو ورثائے موصی کی اجازت کے بغیر جائداد یا مال متوفی کے ایک ثلث کی وصیت جائز ہے۔ اور جب اس سے زیادہ متروکہ بذریعۂ وصیت منتقل کرنے کی ضرورت ہو تو ورثا کی رضامندی حاصل کرنا لازم ہے۔

اگر دادا کے سامنے باپ مرجائے اور دادا کے مرنے کے بعد پوتا اُس کے بیٹے کے ساتھ باقی رہے تو پوتے کا دادا کے ورثا میں شمار نہیں ہوتا اور اس لئے متوفی کے متروکہ سے جو مال بقدر ایک ثلث بذریعۂ وصیت پوتے کو دیا جائے جائز ہے۔

شرع امامیہ کی رو سے وصیت بحق وارث یا غیر وارث کی صورت میں ورثہ اپنی رضامندی موصی کے مرنے کے پہلے یا بعد جب چاہیں دے سکتے ہیں لیکن حنفیہ کے نزدیک ایسی رضامندی کا وفاتِ موصی کے بعد دیا جانا ضرور ہے۔

---

[1] دیکھو بفاطون بنام بلاتی خانم سنہ ۱۹۰۳ء کلکتہ جلد ۳۰ صفحہ ۶۸۳ - کھجور النسا بنام روشن جہاں سنہ ۱۸۷۶ء لا رپورٹ انڈین اپیلز جلد ۳ صفحہ ۲۹۱ مطابق کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۴ -

جس رضامندی کا فقرات بالا میں ذکر کیا گیا وہ صریحاً وضمناً دونوں طرح سے دی جاسکتی ہے اور اگر ورثاء اپنے کردار سے رضامندی کا اظہار کریں، تو اُن کی کردار و گفتار مبہم نہونی چاہیئے مثلاً ورثاء کا مطلب وصیت نامہ کو بخوبی سمجھ کر اور بلاجبر واکراہ اور اپنی رضا و رغبت سے اُس پر دستخط کرنا یا جب موصی لہٗ جائداد وصیتی پر قبضہ کرلے تو اعتراض نہ کرنا یا اپنی اجازت سے اس کو قبضہ کرلینے دینا[1]۔

جب دو شخصوں کے حق میں وصیت کی جائے اور دونوں کا مشترک حصہ جائداد موصی کے ایک ثلث سے زیادہ ہوتا ہو اور اُس کے دینے پر ورثائے موصی راضی نہ ہوں تو دونوں موصی لہٗ کے حصوں میں سے اُن کے حصوں کی مناسبت سے کمی کی جائے گی۔

جب موصی کی جائداد کے ایک ثلث سے زیادہ بذریعۂ وصیت کسی شخص غیر کو دیا جائے اور ورثائے موصی سے بعض اُس کے دینے پر رضامند ہوں تو حصۂ فاضل کا مال اُن ورثاء کے حصص سے جو اُس کے متعلق راضی ہیں وضع کیا جاتا ہے اور اس وصیت کا عمل مثل اُس وصیت کے ہے جو کسی وارثِ موصی کے حق میں کی جاتی ہے۔

وصیت ہر ایک شخص کے حق میں بلا امتیاز مذہب بلا لحاظِ تذکیر و تانیث کی جاسکتی ہے اور ہر ایک شئے وشخص جس کا وجود شرع محمدیؐ میں تسلیم کیا جاتا ہے موصی لہٗ قرار پاسکتا ہے۔

لیکن مال یا جائداد موصی بہ کے پانے کے مستحق بننے کے لئے موصی لہٗ یا موصی لہم کا فی الواقع یا بطور معنوی بوقت وفات موصی موجود رہنا لازم ہے۔

مثلاً وصیت اُس جنین کے حق میں جو رحم مادر میں ہو اسلام کے کُل فرقوں کے نزدیک جائز ہے۔

---

[1] دولت رام بنام عبدالقیوم ۱۹۰۲ء بمبئی جلد ۲۶ صفحہ ۴۹۷۔ شریفہ بی بی بنام غلام محمد دستگیر خان ۱۸۹۲ء مدراس جلد ۱۶ صفحہ ۴۳۔

جو لڑکا موصی کی وفات سے چھ مہینے کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ موصی کی وفات کے وقت موجود متصور ہوتا ہے[۱]۔

اشخاص و اغراض ذیل کے لیئے وصیت کرنا جائز ہے:—

(۱) موصی کے وارث کی اولاد یا اُس کے اقربا، یا ہمسایہ وغیرہ کے حق میں۔

(۲) عام غربا یا چند مخصوص محتاجوں کے حق میں۔

(۳) مکۂ معظمہ کے شہر کی کسی مسجد کے لئے۔

(۴) فی سبیل اللہ صرف کرنے کے لیئے۔

(۵) وجوہ الخیر یا وجوہ البر یعنے کار ثواب یا کار خیر کے لیئے عموماً۔

(۶) خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیئے۔

(۷) شیعوں کے نزدیک اموات کی قبروں پر مذہبی رسوم کی ادائی یا عزاداری محرم وغیرہ کے واسطے[۲]۔

(۸) غلاموں کے آزاد کرنے کے لیئے۔

(۹) موصی کے قرضوں کی ادائی کے لیئے۔

(۱۰) مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیئے۔

وصیت اُس شخص کے حق میں جو ارادتاً موصی کی ہلاکت کا باعث ہو کل مذاہب اسلام میں ناجائز ہے۔

فصل چہارم

تنسیخ وصیت

وصیت بذات خود قابل تنسیخ ہے اور ہر وقت منسوخ ہوسکتی ہے

---

[۱] دیکھو صفحہ ما سبق ۵۷۔

[۲] دیکھو وصیت نامہ بمقدمہ کشن چند بساوت بنام سید نبیر حسن جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ موصی مرض الموت میں بھی اُس کو منسوخ کر سکتا ہے۔

وصیت صریحاً اور ضمناً یا صراحتاً وکنایتاً دونوں طرح سے منسوخ ہوسکتی ہے۔ جب موصی بہ الفاظِ صریح وصیت کو منسوخ کرتا ہے تو اُس کو تنسیخ صریح کہتے ہیں اور جب وہ موصی کی رفتار و کردار سے یا اُن افعال سے جو بعدِ وصیت موصی سے سرزد ہوتے ہیں اور اُن سے موصی کا وصیت کو قائم رکھنے کا ارادہ نہ پایا جائے منسوخ ہو جاتی ہے تو تنسیخ ضمنی کہلاتی ہے۔

لیکن وصیت کے بعد موصی کے شادی کر لینے سے شرع اسلام کی رو سے اُس کی وصیت ناجائز نہیں ہوسکتی ہے۔

باعتبارِ طریقہ و قابلیتِ تنسیخ وصیت کی عموماً چار قسمیں ہیں:—

قابلیتِ تنسیخ

پہلی قسم کے وصایا کی صراحتہً وکنایتہً یعنے الفاظ و کردار دونوں طرح سے تنسیخ ہوسکتی ہے۔ دوسری قسم کے وصایا صرف الفاظ کے ذریعہ سے منسوخ ہوتی ہیں۔ تیسری قسم کی وصیتیں صرف فعل یا کردار سے یعنے ضمناً و فعلاً منسوخ ہوتی ہیں اور چوتھی قسم کے وصایا کسی طرح منسوخ نہیں ہوسکتی ہیں۔

قسم اول میں ایسے وصایا داخل ہیں جو موصی کے قول صریح سے منسوخ ہوسکتی ہیں یا اس طرح اُن کی تنسیخ عمل میں آتی ہے کہ موصی مال وصیتی کو بیچنے یا منتقل کرنے کے بعد اس انتقال کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ یا وصیت اول کے بعد موصی کی اُسی جائداد یا مال وصیتی کو بذریعہ وصیت کسی دوسرے کو دے دینے سے وصیتِ اول منسوخ ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم کی وصیت وہ ہے جس میں موصی اپنے مال کا تیسرا یا چوتھا حصہ کسی شخص کو وصیت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں موصی لہ موصی کی کسی ایک جائداد سے جو مرنے کے وقت اُس نے چھوڑی ہے اپنا وصیتی حصہ لینے کا مستحق سمجھا جاتا ہے لہذا ایسی حالت میں اگر موصی بصراحت اپنی زندگی میں اس طرح کی وصیت کو منسوخ نہ کرے تو وہ نافذ العمل سمجھی جاتی ہے۔

قسم سوم میں وہ وصایا داخل ہیں جن کے ساتھ موصی نے غلاموں کے آزاد کرنے کی شرط لگائی ہو اور جو موصی کے فعل صریح سے منسوخ ہو سکتی ہیں۔

چوتھی قسم کی وصیت وہ ہے جس میں آزادی غلام کی شرط مطلق لگائی گئی ہو اور جس کو موصی صراحتًہ اور نہ ضمنًا منسوخ کر سکتا ہو۔

قبولیت موصی بہ

شیعوں کے مذہب میں موصی کی وفات کے پہلے شئے یا جائداد وصیتی کو موصی لہٗ کا قبول کرنا جائز ہے۔ لیکن اس کے برعکس شرع حنفی میں موصی لہٗ کے بحیات موصی وصیت کو قبول کرنے سے اُس کے حق میں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

موصی بہ بصراحت و بکنایہ دونوں طرح سے منظور ہو سکتا ہے۔ اگر موصی لہٗ موصی بہ کی بسنبت اظہار منظوری یا نامنظوری کرنے کے بغیر مر جائے تو شرعًا قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس نے اُس کو قبول کر لیا تھا اور اُس کے ورثاء موصی بہ کو ارثًا پانے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

فصل پنجم

تقرر وصی

کون لوگ وصی ہو سکتے ہیں

موصی جس شخص سے چاہے اپنی خواہشات آخری کی تعمیل کرا سکتا ہے اور چند قیود کی پابندی کے ساتھ عورت مرد کوئی غیر شخص یا کسی قرابت دار کو اپنا وصی مقرر کر سکتا ہے۔ اور اگرچہ بعض صورتوں میں انتقال جائداد بذریعہ وصیت ناجائز سمجھا جاتا ہے لیکن جس وصی کا موصی اپنی نابالغ اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے تقرر کرے وہ ہر حالت میں جائز ہے۔

وصی کا تقرر بالخصوص و بالعموم ہو سکتا ہے یعنے کسی خاص غرض

یا اغراض عام کے لئے وصی کا مقرر کیا جانا جائز ہے۔

نابالغ کسی کا وصی مقرر نہیں ہو سکتا اور مجنون کا بھی وصی مقرر ہونا خواہ اُس کو جنون دوری ہو کہ مستقل ناجائز ہے۔ لیکن عورت یا مرد نابینا یا کوئی ایسا شخص جو توہین زبانی کی سزا بھگت چکا ہو شرعاً وصی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

اس امر پر کہ مسلمان کسی کافر حربی کو گو وہ مستامن ہی کیوں نہ ہو اپنا وصی نہیں بنا سکتا۔

غیر مسلم جو سلطنت اسلام کی رعیت ہو وصی مقرر ہو سکتا ہے

اسلام کے تمام فرقوں کا اتفاق ہے۔ حربی سے مراد ایسا غیر مسلم ہے جو کسی ریاست معاند کا باشندہ ورعیت ہو اور مستامن اُس غیر مسلم رعیت ریاست معاند کو کہتے ہیں جو سلطنت اسلام کے حدود میں اجازت نامۂ سلامتی (پاسپورٹ) کے ذریعہ سے داخل ہوا ہو۔ اگر (اس طرح کا تقرر ہو بھی تو وہ بحکم قاضی لائق تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ذمی کا تقرر وصی کے عہدے پر ہو سکتا ہے اس پر بھی اگر قاضی مناسب سمجھے تو اس کو نامنظور کر سکتا ہے۔

بمقدمۂ محمد امین الدین و شخص دیگر بنام محمد کبیر الدین[1] ایک مسلمان عورت نے اپنی کل جائداد ایک شخص غیر کے حق میں وصیت کر کے ایک ہندو کو عہدۂ وصی پر مقرر کیا تھا۔ لیکن جب حکام صدر عدالت نے قاضی القضاۃ اور دوسرے مفتیان متعلقہ سے اسی بابت استصواب کیا تو اُن لوگوں نے حسب ذیل رائے دی۔

(الف) اگر موصیہ لاوارث مری ہے تو وہ اپنی تمام جائداد بذریعۂ وصیت دے سکتی ہے۔

(ب) اگر وہ وارث رکھتی ہے۔ تو ثلث مال سے زیادہ کی

---

[1] ۱۸۲۵ء سلیکٹ رپورٹس جلد ۴ صفحہ ۴۹۔ اس کے سوائے دیکھو ہنری جارلاخ بنام ظہور النساء ۱۸۲۹ء رپورٹس د جلد مذکور صفحہ ۳۰۴۔

وصیت کا جواز اُس کے ورثا کی رضامندی پر منحصر ہے۔ اور

(ج) ہرچند مسلم کا وصی غیر مسلم مقرر ہو سکتا ہے لیکن قاضی (اگر ضرورت سمجھے تو) اس کو علیحدہ کر سکتا ہے اور جب تک وصی برطرف نہ کیا جائے اُس کی تمام کارروائیاں اور انتظامات متعلق جائداد وصیتی جائز سمجھے جاتے ہیں[1]

وصی کی حیثیت قانونی

وصی کو موصی الیہ بھی کہتے ہیں اور وصی کی تعریف یہ ہے کہ وہ امین ہے جس کو موصی اپنے مرنے کے بعد اپنی جائداد اور اطفال کے اہتمام اور انتظامات وحفاظت کے لیئے اپنی زندگی میں مقرر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وصی قائم مقام موصی سمجھا جاتا ہے۔

ذیل کی صورتوں میں وصی کے افعال متولی کی کارروائیوں کے مانند باطل نہیں سمجھے جاتے ہیں:—

موصی کے لیئے کفن خریدنا، اُس کے اخراجات دفن کا ادا کرنا، اُسکے حقوق کے متعلق عدالتی کارروائی کرنا، اُس کی اولاد کے لیئے ضروریات زندگی خریدنا، موصی کے حق میں جس قدر ہبہ ہوئے ہیں اُن کو قبول کرنا اور جو امانتیں موصی کے یہاں رکھائی گئی ہوں اُن کو واپس کرنا اور جس قدر وصایا اُس نے دوسروں کے حق میں کیئے ہیں اُن کو مال وصیتی سے ادا کرنا۔

اگر اراضی وصیتی کے متعلق ایک سے زیادہ اوصیائے مشترکہ مقرر کیئے جائیں تو اُن میں سے کسی ایک کو زر تحصیل کا وصول ہونا کافی و جائز ہے لیکن بصورت انتقال اراضی کل اوصیا کا شریک رہنا لازم ہے

فصل ششم

اختیارات وصی

عموماً ہندوستان کی انگریزی حکومت میں اختیارات اوصیاء

---

[1] اس کے علاوہ دیکھو جہان خاں بنام ہینڈلے (۱۸۶۸ء) بنگال لا رپورٹس سلیکٹ نمبر صفحہ ۱۶ مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۱۹ صفحہ ۱۸۵۔

قانون حصول نقل مصدقۂ وصیت و اہتمام ترکہ (دی پروبیٹ اینڈ اڈمنسٹریشن ایکٹ) نشان (۵) بابت ۱۸۸۱ء کے تابع ہیں۔ مگر مسلمان اوصیا کے واسطے وصیت نامہ کی نقل مصدقہ حاصل کر کے اپنے کو جائداد وصیتی کے انتظام کا مستحق بنانے کی ضرورت نہیں ہے بناءً علیہ اس مضمون کے متعلق احکام شرع محمدی کا ذکر کرنا نہایت ضرور و مفید ہے۔

احکام شرع محمدی

اولاد موصی کی نابالغی کی صورت میں وصی کے اختیارات ایک حد تک مطلق سمجھے جاتے ہیں۔ اگر وصی ضرورت سمجھے تو اپنے اختیار سے وہ جائداد زیر وصیت کو فروخت کر کے پہلے اُس کی قیمت سے موصی کا قرضہ اور اُس قرضہ کو جو اُس نے موصی کے بچوں کی پرورش وغیرہ کے واسطے کیا ہو ادا کر سکتا ہے بعد ازاں باقی رقم سے کوئی دوسری بہتر اور زیادہ نفع کی جائداد خرید سکتا ہے یا اُس رقم کو دوسرے زیادہ منفعت کے کاموں میں مثلاً تجارت اور صرافہ میں لگانا اُس کے لیئے جائز ہے۔

لیکن جائداد کی بیع کسی معقول معاوضہ پر ہونی چاہیئے یعنے "اُس قیمت پر جو بیوپاریوں اور اہل تجارت کی رائے میں متناسب سمجھی جاتی ہے جائداد وصیتی کا فروخت ہونا لازم ہے"۔ وصی کا ایسی جائداد کو خریدنا یا اپنے کسی ایسے قرابتدار کے ہاتھ بیچنا جو شرعاً وصی کے خلاف گواہی نہ دے سکتا ہو درست نہیں ہے۔ وہ منقولہ اور غیر منقولہ دونوں قسم کی جائدادوں کی تقسیم میں جو موصی کے شریک حصہ داروں یا موصی لہٗ میں ہونے والی ہے شریک ہو کر موصی کے نابالغ اطفال کا حصہ لے سکتا ہے۔ اگر اس قسم کی جائداد میں تقسیم سے تھوڑا سا نقصان نابالغوں کے حصہ کو پہنچتا ہو یعنے غبن یسیر کی صورت میں وصی جائداد کو تقسیم کرا سکتا ہے اور اگر تقسیم سے زیادہ نقصان پہنچتا ہو یعنے بشکل غبن کثیر ایسی تقسیم ناجائز و غیر موثر ہے۔

اگر موصی کے تمام ورثا نابالغ ہوں تو وصی کا موصی لہٗ کو اُس کا حصہ دے کر باقی مال وصیتی کا ورثائے موصی کے لیئے اپنے قبضہ میں محفوظ رکھنا

جائز و موثر ہے۔ قبضۂ وصی کے زمانہ میں اگر ورثا کے حصہ کا کچھ مال تلف ہوجائے یا جاتا رہے تو نابالغ اشخاص کو جو اُس کے زیر سرپرستی رہتے ہیں وصی یا موصی لہٗ سے مال تلف شدہ کے معاوضہ لینے کا حق حاصل نہیں ہے اور نہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے اُس کی تلافی کرا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسا نقصان اُس کی عمداً غفلت اور کاہلی سے نہ ہوا ہو۔

مگر جب موصی کے بعض ورثا بالغ اور غیر حاضر ہوں تو وصی اُن کی طرف سے ہر چیز کو بجز عقار یعنے جائداد غیر منقولہ کے موصی لہٗ کے ساتھ تقسیم کر سکتا ہے اور موصی لہٗ کا حصہ اُس کو پہنچا کر نابالغوں کے حصوں کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اگر کل ورثا نابالغ ہوں اور اُن میں سے بعض بالغ اور حاضر ہوں تو جو تقسیم کر وصی میراث یعنے جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی کرتا ہے وہ بمقابلۂ ورثائے بالغ ناجائز ہے۔ لیکن اگر ورثا بالغ و عاقل ہونے کے باوجود غیر حاضر ہوں تو جائداد غیر منقولہ کی تقسیم اُن کے مقابلہ میں غیر موثر ہے یعنے اگر ورثا باوصف بالغ ہونے کے غیر حاضر ہوں تو جو تقسیم جائداد منقولہ کی وصی موصی لہٗ کے ساتھ کر لیتا ہے وہ جائز ہے۔

جب کسی شخص نے دو وصی مقرر کیئے ہوں اور اُن میں کا ایک مرجائے لیکن اُسی دوسرے وصی کو اپنا بھی وصی مقرر کرے تو جو وصی زندہ رہتا ہے وہ موصی سابق کی جائداد کا انتظام بطور وصی منفرد انجام دے سکتا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک وصی کا کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام مقرر کرنا اور اُس کے ذریعہ سے اُس وصیت کے اغراض کی تعمیل کرانا جس کے واسطے وہ خود ابتداءً مقرر کیا گیا تھا جائز ہے[1]۔

جب کسی مسلمان کی وصیت کے متعلق وصی کو از روئے قانون حصول نقل مصدقہ وصیت و اہتمام ترکہ بابت ۱۸۸۱ء ہند میں وصیت کی نقل مصدقہ عطا ہوتی ہے تو اُس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ وصی

---

[1] دیکھو حفیظ الرحمن بنام خادم حسین (۱۸۷۱ء) این۔ ڈبلیو۔ پی۔ رپورٹ جلد ۴ صفحہ ۱۰۶۔

جائدادِ وصیتی کو حاصل کرنے کے بعد دو ثلث مال کا جو ورثائے موصی کا حق ہے امینِ محض اور ایک ثلث مال کا جو اغراضِ وصیت کے لیئے یعنے موصی لہم کے حصہ کا ہوتا ہے امین مستعد سمجھا جاتا ہے بالفاظ دیگر وصی ایک ثلث متروکہ از روئے وصیت تقسیم کر دیتا ہے اور باقی دو ثلث متروکہ بطورِ امانت اُس کے پاس ورثائے موصی کے لیئے محفوظ رہتا ہے[1]

باب چہارم

قانون شفع

فصل اوّل

مشاہدات عام

جب ایک شخص کو کسی جائداد کے خریدنے میں دوسرے پر ترجیح پانے کا استحقاق ہو تو شرع محمدی میں اس ترجیح کو حق شفعہ کہتے ہیں - آرام اور سہولت کے خیال اور غیر شخص کو حصہ داروں میں شریک اور ہمسایوں میں داخل نہ ہونے دینے کی غرض پر یہ حق مبنی ہے۔

حق شفعہ کن مقامات میں نافذ ہو سکتا ہے

حکومت اسلام کے ساتھ ہندوستان میں شرعِ حنفی کی شفع کا نفاذ ہوا اور بعض مقامات میں شفع قانونِ مقامی کا جزو بن گئی ہے چنانچہ ملک بہار صوبۂ پنجاب کے بعض حصوں

---

[1] مرزا قرۃ العین بہادر بنام نواب نہت الدولہ عباس حسین خاں (۱۹۰۵ء) کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۹ صفحہ ۹۳۸

اور ممالک مغربی اور شمالی (صوبۂ متحدۂ آگرہ و اودھ) میں ہندو اور مسلمان دونوں حق شفع کے متعلق دعوےٰ کرنے کے مجاز ہیں لیکن ہند کے دوسرے مقامات میں رسم ورواج پر شفع کا انحصار ہے۔ مثلاً بنگالہ جنوبی میں صرف مسلمانوں کو حق شفع حاصل ہے لیکن دوسرے مقامات میں ہندواور عیسائیوں نے بھی حق شفع پر عمل کیا ہے۔ خود شرع محمدی کی رو سے ہر ایک شخص بلالحاظ جنس و مذہب حق شفع کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

شفع کس قسم کی جائداد سے متعلق ہوتا ہے

حق شفع صرف جائداد غیر منقولہ پر ہوتا ہے اور اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ آیا وہ ملک مشترکہ ہے کہ منفردہ یا قابل تقسیم ہے کہ نا قابل تقسیم اور صرف اُسی وقت شفع کا دعویٰ ہوسکتا ہے کہ جبکہ مالک ایسی جائداد کو کسی شئے کے معاوضہ میں منتقل کرتا ہے۔

لہذا ایسی جائداد کے متعلق جو بذریعہ توریث منتقل ہوتی ہے یا بطور ہبہ کسی معاوضہ کے بغیر یا بذریعۂ وصیت کسی کو ملتی ہے شفع کا دعوےٰ نہیں ہوسکتا۔ اور نہ اُس جائداد کی بابت کسی کو شفع کی نالش کرنے کا حق پیدا ہوتا ہے جو کسی کو حسن خدمت کے صلہ میں یا اُن خدمتوں کے عوض میں جو آیندہ انجام پانے والی ہیں دی جاتی ہے۔ جو جائداد بطور انعام یا مہر زوجہ دی جاتی ہے وہ بھی شفع کے اثر سے مستثنیٰ ہے۔

ہبہ بشرط العوض کی شکل میں جب تک منتقل الیہ بدل کو جس کا قرارداد ہوا ہو منتقل کنندہ کو ادا نہیں کرتا دوسروں کو اُس جائداد میں حق شفع نہیں پیدا ہوتا[1]

اگر کسی جائداد کے انتقال کی بابت دو اشخاص کے درمیان کوئی معاملہ طے پائے تو ہند کے قانون انتقال جائداد[2] کی رو سے نہیں بلکہ شرع محمدی

---

[1] میرے خیال میں مقدمۂ فدا علی بنام مظفر علی (۱۸۸۲ء) الہ آباد جلد ۵ صفحہ ۶۵ فیصلہ صحیح نہیں ہے۔

[2] نجم النسا بنام عجائب علی خاں (۱۹۰۰ء) الہ آباد جلد ۲۲ صفحہ ۳۴۳ - بیگم بنام محمد یعقوب (۱۸۹۴ء) الہ آباد جلد ۱۶ صفحہ ۳۴۴۔

کے مطابق اس امر کا فیصلہ کیا جائے گا کہ جائداد مذکورہ کے انتقال کی تکمیل ہوئی کہ نہیں۔

اصول مندرجۂ فقرۂ بالا سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو جائداد دوامی پٹہ[1] پر دی جاتی ہے یا کسی مشروط بیع کے ذریعہ سے اس طرح رہن کی جاتی ہے کہ بیعبات[2] کے وقت تک فک رہن نہ کیا جائے گا تو اُس میں حق شفع نہیں پیدا ہوتا ہے۔

فصل دوم

مدعیان حق شفع

شرع حنفی کی رو سے تین قسم کے اشخاص حق شفع کا دعویٰ کرنے کے مستحق ہیں لیکن کل اشخاص ایک وقت میں نالش نہیں دائر کر سکتے بلکہ ایسے لوگوں کو ایک دوسرے کے سلسلہ میں نالش کا حق پیدا ہوتا ہے:۔

اوّل۔ اشخاص جو شئے مشفوعہ کی ملک میں شریک ہوتے ہیں وہ شفیع شریک کہلاتے ہیں۔

تین قسم کے لوگ شفیع کے مستحق ہیں

دوم۔ اشخاص جن کو جائداد مبیعہ کی نسبت حق آسائش حاصل ہو یا مطابق زبان فقہائے عرب وہ لوگ جو مبیعہ کے حقوق اور متعلقات وملحقات میں شرکت رکھتے ہوں اُن کو شفیع خلیط کہتے ہیں۔

---

[1] بابورام غلام سنگھ بنام نرسنگھ سہلئے (۱۸۷۵ء) ویکلی رپورٹر جلد ۲۵ صفحہ ۱۴۳۔ دیانت اللہ بنام کاظم ملا (۱۸۸۷ء) کلکتہ جلد ۱۵ صفحہ ۱۸۴۔

[2] بیگم بنام محمد یعقوب جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔ گردیال مندر بنام ٹیک نراین سنگھ (۱۸۶۵ء) بنگال لا رپورٹس جلد ضمیمہ صفحہ ۱۶۶ مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۲ صفحہ ۲۱۵۔

سوم۔ جو لوگ مبیعہ کے ہمسایہ ہوں یا جن کی جائداد اُس سے متصل ہو وہ شفیع جار کہلاتے ہیں چنانچہ اس شخص کا دعوے جس کا حصہ جائداد مبیعہ میں ہو اُس سے زیادہ قوی ہے جس کو صرف مبیعہ پر حق آسائش حاصل ہو اور اس دوسری قسم کے شفیع کا حق ہمسایہ کے حق سے زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے یعنے پہلی قسم کے شفیع کو دوسرے پر اور دوسرے کو تیسرے پر شفع کا دعویٰ کرنے میں ترجیح حاصل ہے[1]

لیکن جب کوئی شخص حق شفع حاصل ہونے کے بعد بھی اس کا طالب نہ ہو یا اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو دوسرا شخص جس کو پہلے شخص کے بہ نسبت کم درجہ کا حق شفع حاصل ہے شفع کی نالش کر سکتا ہے۔

بڑی جائدادوں یا علاقوں کے متعلق شفع نہیں پیدا ہوتی۔

بڑی جائدادوں یا علاقوں کے متعلق شریک حصہ دار کو حق شفع حاصل ہے لیکن ہمسایہ صرف باغ و مکان اور چھوٹے چھوٹے قطعات زمین کی بابت شفع کا دعوے کر سکتا ہے[2]

شرع امامیہ کی رو سے صرف جائداد کا شریک حصہ دار یعنے شفیع شریک شفع کا مستحق سمجھا جاتا ہے مگر چونکہ ہند میں صرف حنفیوں کا قانون شفع کہیں تو رسم کی بنا پر اور کہیں خصوصیت مقام کی وجہ سے رائج و نافذ ہے لہذا جب

---

[1] غلام علی خاں بنام اگر جیت رائے (۱۸۷۰ء) ویکلی رپورٹر جلد ۱۷ صفحہ ۳۴۳ ۔ چاند خاں بنام نعمت خاں (۱۸۶۹ء) بنگال لا رپورٹس جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ ۔ رنچھو داس بنام جگل داس (۱۸۹۹ء) بمبئی جلد ۲۴ صفحہ ۴۱۴ ۔ کریم بنام پربھولال بوس (۱۹۰۵ء) الہ آباد جلد ۲۸ صفحہ ۱۲۷ ۔ مطابق الہ آباد جلد ۳۱ صفحہ ۵۱۹۔

[2] محمد حسین بنام محسن علی (۱۸۷۰ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۶ صفحہ ۱۴۔ مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۱۴ فیصلۂ جلسۂ کاملہ ۔ شیخ کریم بخش بنام کریم الدین احمد (۱۸۷۶ء) این ۔ ڈبلیو ۔ رپورٹس جلد ۶ صفحہ ۳۷۷ ۔ عبد الرحیم خاں بنام خراج سنگھ (۱۸۹۲ء) الہ آباد جلد ۱۵ صفحہ ۱۰۴

مشفوعہ کا بائع شیعہ ہو تو سنّی شفیع جار شفع کا مستحق سمجھا جاتا ہے [۱]۔ اور جب بائع سنّی ہو تو اسی قاعدہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لیکن الہ آباد ہائی کورٹ نے اس کے برعکس طے کیا ہے یعنے جب بائع و مشتری دونوں سنّی ہوں تو کوئی شیعہ بربنائے ہمسایہ شفع کا دعوائے نہیں کر سکتا [۲]۔

فصل سوم

شرائط جواز شفع

امور ضروری متعلق دعوائے شفع

دعوائے شفع رجوع کرنے کے پہلے مدعی کو دو باتوں کی تکمیل کر لینی ضرور ہے اور جب تک ان دو شرطوں کی تعمیل نہیں ہوتی کوئی شخص شفع کی نالش کرنے کا مجاز نہیں ہو سکتا [۳]۔

(۱) جس شخص کو جائداد مبیعہ کی بنسبت حق شفع کا دعویٰ کرنا منظور ہو اُس کو لازم ہے کہ جائداد کے فروخت ہونے کی اطلاع پاتے ہی فوراً اپنے ارادہ کا کہ وہ جائداد مذکور کے متعلق دعویٰ کرنے والا ہے صریحاً اظہار کر دے۔ ارادہ کا اظہار طلب کی شکل میں کیا جانا چاہئے۔ اس کے واسطے مخصوص الفاظ یا کسی خاص کلمہ کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے متعلق شرع میں مدعی کو جو کچھ تکلیف دی گئی ہے وہ اس قدر ہے کہ

طلب مواثبت

کہ دعوے دار شفع صاف اور صریح طور پر اپنی نیت کو طلب اور خواہش کے پیرایہ میں ظاہر کر دے اور اس کے اظہار میں کسی قسم کا ابہام

---

[۱] جگ دیو سنگھ بنام قاضی سید محمد افضل (۱۹۰۵ء) کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۹ صفحہ ۸۲۶۔

[۲] قربان حسین بنام چھوٹے (۱۸۹۹ء) الہ آباد جلد ۲۲ صفحہ ۱۰۲۔

[۳] جادو سنگھ بنام راج کنور (۱۸۶۵ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۴ صفحہ ۱۷۱۔

نہ پیدا ہونے دے[1]

طلب مواثبت کرنے میں شفیع کو کسی قسم کی تاخیر نہ کرنی چاہیئے بلکہ اُس کا فرض ہے کہ بیع کی اطلاع ہوتے ہی اس قسم کی خواہش کا اظہار کردے۔ اور اگر اس طریقہ اور رسم کے ادا کرنے میں ذرا بھی دیر ہوگئی تو اُس کا حق شفع ساقط ہو جاتا ہے[2] لیکن گواہوں کی موجودگی میں طلب مواثبت کرنا ضرور نہیں ہے۔[3]

دعوئے شفع کے متعلق دوسری شرط یہ ہے کہ بنظر حالات جس قدر جلد ممکن ہو شفیع گواہوں کے روبرو

(الف) جائداد متنازعہ پر یا

(ب) بائع کی حضوری میں یا

(ج) مشتری کی موجودگی میں جیسا کہ موقع ہو اپنی خواہش کا اس طرح اظہار کرے کہ گویا وہ گواہوں سے واقعۂ اظہار طلب کی شہادت ادا کرنے کی استدعا کرتا ہے[4] اس کارروائی کو طلب استشہاد کہتے ہیں جس کے معنی گواہوں سے شہادت دلوانے کی استدعا کے ہیں۔

چونکہ شفع کا حق محض شرعی ہے لہذا ان دونوں طلب کے متعلق اگر اُن رسوم کے بجالانے میں جن کو شرع نے لازم کیا ہے ذرا بھی لغزش ہوئی تو حق دعوے باطل ہو جاتا ہے

شفیع کا طلب دوم کو مشتری کی موجودگی میں ظاہر کرنے کے لیئے جائداد مشفوعہ کا

عـ۱ـ جلد متذکرۂ بالا میں دیکھو پرکاش سنگھ بنام جوگیشور سنگھ (۱۸۶۸ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۲ صفحہ ۱۲۔ اور جگدیو سنگھ بنام قاضی سید محمد افضل جس کا حوالہ سابق میں دیا گیا ہے۔

عـ۲ـ علی محمد بنام تاج محمد (۱۸۷۶ء) الہ آباد جلد ۱ صفحہ ۲۸۳۔ جعفر خاں بنام جبار میاں (۱۸۸۴ء) کلکتہ جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۳۔

عـ۳ـ جادو سنگھ بنام راج کنور جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

عـ۴ـ مبارک حسین بنام کنیز بانو (۱۸۸۴ء) الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۱۶۱۔ گنگا پرشاد بنام اجودھیا پرشاد (۱۹۰۵ء) الہ آباد جلد ۲۸ صفحہ ۲۴۔

جس کے متعلق وہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے مشتری کے قبضہ میں ہونا ضرور نہیں ہے ؎۱

ہند کی انگریزی عدالتوں نے طے کیا ہے کہ طلب دوم کے اظہار میں شفیع کو صاف طور سے کہنا چاہیئے کہ اُس نے طلب مواثبت کی ہے۔ ؎۲

اپنی ذات سے مدعی کے طلب اشہاد کرنے کے متعلق عدالتوں نے اس امر کو اس کی قابلیت پر منحصر قرار دیا ہے۔ اس بنا پر اگر شفیع کسی دور دراز کے مقام پر رہتا ہو تو خط یا قاصد یا اپنے کسی مختار کے ذریعہ سے طلب اشہاد کرا سکتا ہے۔ ؎۳

مبیعہ کی جو قیمت مشتری سے بائع کو وصول ہوتی ہے اُس کے ادا کرنے پر شفیع کا آمادہ ہونا ضرور ہے۔ لیکن اگر شفیع کے خیال میں بائع نے اصل قیمت سے زیادہ بڑھی ہوئی قیمت بتلائی ہے تو شفیع کو بیان کرنا چاہیئے کہ وہ اس قیمت کے دینے کے لیئے راضی ہے بشرطیکہ بازار میں بھی یہی نرخ قرار پائے۔ ؎۴

؎۱ علی محمد خاں بنام محمد سعید حسین (۱۸۹۶ء) الہ آباد جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۹۔ جائداد مشفوعہ پر موجود رہکر شفیع کی طلب کے جائز ہونے کے متعلق دیکھو کلثوم بی بی بنام فقیر محمد خاں (۱۸۹۶ء) الہ آباد جلد ۱۸ صفحہ ۲۹۸

؎۲ رجب علی چوبدار بنام چاندنی چرن بھدرا (۱۸۹۰ء) کلکتہ جلد ۱۷ صفحہ ۵۴۳۔ مبارک حسین بنام کنیز بانو (۱۹۰۴ء) الہ آباد جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۰۔ عباسی بیگم بنام افضل حسین (۱۸۹۸ء) الہ آباد جلد ۲۰ صفحہ ۴۵۷۔

؎۳ سید واجد علی خاں بنام لالہ ہنومان پرشاد (۱۸۶۹ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۱۲ صفحہ ۴۸۴۔ مسماۃ وجیہ النسا بیگم بنام شیخ رستم علی ویکلی رپورٹر (۱۸۶۴ء) صفحہ ۲۱۹۔ امام الدین بنام شاہجہاں بی بی (۱۸۷۰ء) بنگال لا رپورٹس جلد ۶ صفحہ ۱۶۷۔

نوٹ۔ علی محمد خاں بنام محمد سعید حسین جس کا حوالہ آچکا ہے۔ آبادی بیگم بنام انعام بیگم (۱۸۷۷ء) الہ آباد جلد ۱ صفحہ ۵۲۱۔

؎۴ لجا پرشاد بنام دیبی پرشاد (۱۸۸۰ء) الہ آباد جلد ۳ صفحہ ۲۳۶۔ کریم بخش بنام خدا بخش (۱۸۹۴ء) الہ آباد جلد ۱۶ صفحہ ۲۴۷۔

لیکن رسوم متذکرۂ بالا میں سے کسی ایک کی ادائی کے وقت یعنے طلب مواثبت یا طلب استشہاد کے وقت شفیع کو مبیعہ کی بتلائی ہوئی قیمت کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مدعی کو اضافۂ مبیعہ کا معاوضہ بشرطیکہ وہ ملحقات سے نہ ہو ادا کرنا لازم ہے

اگر مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد مبیعہ میں کوئی ایسی افزائش ہوئی ہو جس کا ملحقات میں شمار ہو سکتا ہو تو شفیع کو اُس افزائش کا معاوضہ دینا لازم ہے۔ اور اگر مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد جائداد مشفوعہ میں کچھ نقص یا کمی واقع ہو تو قیمت میں سے اُس قدر منہا کرنے کا مدعی مجاز ہے۔ لیکن جس صورت میں کہ مشتری نے خود مبیعہ میں کوئی کمی یا نقص نہ کیا ہو اور نہ اپنی غفلت سے اُس کے کچھ حصہ کو ضائع ہونے دیا ہو تو وہ پوری قیمت شفیع سے حاصل کر سکتا ہے۔

جب ایک جائداد مبیعہ میں چند اشخاص کو برابر کا حق شفع پیدا ہوتا ہے تو اُن میں کا ہر ایک شفیع اپنے حق کے مطابق جائداد مبیعہ کے جزو کے خریدنے کا مستحق ہوتا ہے اور اس بنا پر دعوئے شفع میں اُس کو کُل جائداد مبیعہ شامل کرنا چاہئیے کیونکہ دوسرے دعویدار بھی اُس میں حق شفع رکھتے ہیں۔

جب کوئی جائداد ایک ہی بیع نامہ کے ذریعہ سے فروخت کی جائے اور شفیع اپنے حق شفع کی بنا پر اس پر قبضہ پانے کا دعوے کرے اور اُس دعوے میں جائداد مبیعہ کو خریدنے کے دو وجوہ بتلائے یعنے اُس کے ایک جزو کو شرع محمدی کی رو سے اور اُس کے دوسرے حصہ کو واجب العرض کی بنا پر مشفوعہ قرار دے اور جب عدالت پر ثابت ہو جائے کہ شفیع مدعی نے اپنے افعال و کردار اور سکوت سے مبیعہ کے اُس جزو کے پانے کا مستحق نہیں رہا جو اُس کو شرع محمدی کی رو سے مل سکتا تھا تو عدالت بیعہ کا وہ حصہ بھی جو بیع نامہ کے ذریعہ سے منتقل ہوا ہے مدعی کو نہیں دلائیگی [۱]۔

---

[۱] مجیب اللہ بنام امید بی (۱۸۹۸ء) الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۱۱۹۔

فصل چہارم

مسائل متفرق

جس صورت میں دعویٰ شفع کی بنا پر کسی رسم یا مخصوص اقرار پر مبنی نہ ہو تو ہندوستان کی انگریزی عدالتوں کے اصول کے مطابق جواز دعویٰ کے لئے بائع اور مدعی دونوں کو شرع محمدی کے تابع ہونا لازم ہے [۱]۔

لیکن کلکتہ ہائی کورٹ نے اس سے بھی زیادہ اس اصول کو محدود کر دیا ہے۔ چنانچہ عدالت موصوفہ کا فیصلہ ہے کہ بائع اور شفیع کے سوائے مشتری کا بھی مسلمان ہونا ضرور ہے [۲]۔ مگر افسوس ہے کہ عدالت کے اس تصفیہ سے قانون شفع کی مصلحت جو شرع محمدی میں قرار دی گئی ہے مفقود ہو جاتی ہے برا ہم الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے کہ اس حق کے نفاذ کے لئے مشتری کا مسلمان ہونا لازم نہیں [۳] اور میں کہتا ہوں کہ اس عدالت نے بہت صحیح اصول قرار دیا ہے۔ اور خود عدالت نے طے کیا ہے کہ غیر مسلم لوگوں کو جنھوں نے جائداد کے متعلق مسلمانوں سے معاملت کی اور وہ لوگ اُن شرائط و فرائض سے بھی واقف تھے جو اس جائداد سے متعلق تھیں صرف اس بنا پر کہ وہ شرع محمدی کے تابع نہیں ہیں شرائط و فرائض مذکورہ کو توڑنے کی اجازت دینے سے مسلمانوں کے حق میں سخت ناانصافی ہوتی ہے۔

مشتری کا مسلمان ہونا ضرور نہیں ہے۔

---

[۱] دوار کاداس بنام حسین بخش (۱۸۸۰ء) الہ آباد جلد ا صفحہ ۵۶ - پورن سنگھ بنام ہری چرن کنگر (۱۸۷۲ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۷۔

[۲] شیخ قدرت اللہ بنام موہن بہارے (۱۸۶۹ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۴ صفحہ ۱۳۴۔

[۳] برج موہن بنام ابوالحسن خاں (۱۸۸۵ء) الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۷۷۵۔

جب ایک ہی قسم کے چند شفیع کسی جائداد مبیعہ کے متعلق مدعیان شفع ہوں تو مبیعہ ان میں علی السویۃ تقسیم کردیا جاتا ہے اور اُن کے اُن حصوں کے بڑے چھوٹے ہونے کا لحاظ نہیں کیا جاتا جن کی بنا پر انھیں مشفوعہ کے خریدنے کا حق پیدا ہوتا ہے[۱] فرض کرو کہ ایک جائداد کے الف ب اورج شریک حصہ دار ہیں اور الف کا حصہ ایک ثلث، ب کا حصہ نصف، اورج کا حصہ سدس، اُس جائداد میں ہے۔ الف اپنا حصہ د کو فروخت کرتا ہے لہذا ب اورج، الف کا نصف نصف حصہ پانے کے مستحق ہیں یعنے الف کا حصہ ب اور ج میں علے السویۃ تقسیم کیا جائیگا۔

ایک مقدمہ میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جلسۂ کاملہ نے تصفیہ کیا ہے کہ

حصہ داروں کی بیع میں حصہ داران شریک کے حقوق

جب ایک شریک حصہ دار اپنے دوسرے شریک حصہ دار کو اپنا حصہ منتقل کردے تو دوسرے شریک حصہ داروں کو نالش شفع کا حق نہیں ہوسکتا کیونکہ سب شریک حصہ داروں کا جائداد میں مساوی حق ہوتا ہے اور ایسی صورت میں وہ وجہ جس کی بنا پر حق شفع پیدا ہوتا ہے مفقود رہتی ہے۔[۲]

لیکن الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ اس کے خلاف ہے یعنے جس صورت میں دو سے زیادہ شریک حصہ دار ہوں اور ان میں سے ایک اپنا حصہ

---

[۱] مہاراج سنگھ بنام لالہ بھیک لال (۱۸۶۹ء) ویکلی رپورٹر جلد ۳ صفحہ ۱۷۔ بمقدمۂ عباس علی بنام بابا رام (۱۸۸۹ء) الہ آباد جلد ۱۲۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے جلسۂ متفقہ نے تجویز کی ہے کہ جب کسی جائداد کے دو سے زیادہ شریک حصہ دار ہوں تو شرع امامیہ کی رو سے اُن کو حق شفع نہیں ہوسکتا لیکن عدالت کی یہ رائے اُسی عدالت کے دو فیصلوں سے باطل ٹھہرتی ہے اور یہ فیصلہ بنظر وجوہ ذیل صحیح نہیں ہوسکتا:۔ اول یہ کہ ملک ہند میں سنّیوں کے قانون شفع پر عمل ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ایسی صورت میں شیعوں کا قانون شفع صاف نہیں ہے۔

[۲] لالہ نوبت لال بنام لالہ جیون لال (۱۸۷۸ء) کلکتہ جلد ۴ صفحہ ۸۳۱۔

دوسرے کے ہاتھ بیع کرے تو جس قدر شریک حصہ دار باقی رہتے ہیں وہ شریک حصہ دار مشتری کے ساتھ حصۂ مبیعہ کو مساوی حصوں میں لینے کے مستحق ہوتے ہیں[1]۔

تمثیل ۔فرض کرو کہ ایک جائداد کے الف ب ج اور د شریک حصہ دار ہیں اور الف اپنا حصہ ب کو فروخت کرتا ہے تو اس بنا پر ج اور د بحساب فی کس ایک ثلث حصہ پانے کے مستحق ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ فیصلۂ بالا میں عدالت نے تصفیہ کا جو اصول قرار دیا ہے وہ فقہائے اسلام کے فتاوے اور اقوال کے مطابق ہے اور جس وجہ پر کہ یہ اصول مبنی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

اصول شرع محمدی

چونکہ ایک جائداد کے متعلق جس قدر شفیع ہوتے ہیں اُن سب کے حقوق بمقابلہ مشتری مساوی ہوتے ہیں اور اس بنا پر اُن کے آپس میں بھی اس قسم کے مساوی حصے سمجھے جاتے ہیں لہذا ایک شریک حصہ دار کو دوسرے شریک حصہ داروں پر ترجیح دینے میں ناانصافی سمجھی جاتی ہے یعنے ایک شریک حصہ دار کو دوسرے شرکا سے مبیعہ میں زیادہ حصہ نہیں مل سکتا۔ اور جب ایسی صورت میں اگر مبیعہ کے متعدد شفیع ہوں تو ان میں سے کوئی ایک شفیع اپنے مخصوص حصہ کی نسبت مبیعہ میں حق شفع کا طالب ہو سکتا ہے[2]۔

لیکن دونوں عدالت ہائے متذکرۂ بالا اس امر پر متفق ہیں کہ اگر ایک شریک حصہ دار مبیعہ کے خریدنے میں کسی غیر کو اپنے ساتھ شریک کرلے تو دوسرا شریک حصہ دار کُل جائداد مبیعہ کے مقابل میں حق شفع کے طالب ہونے کا مستحق ہے اور جس حد تک بیع کا تعلق شریک حصہ دار مشتری سے ہوتا ہے

---

[1] امیر حسن بنام رحیم بخش (۱۸۹۷ء) الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۴۶۶

[2] عبد اللہ بنام امانت اللہ (۱۸۹۹ء) الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۲۹۲۔

اس کی بابت مدعی شریک حصہ دار کو اعتراض کرنا ضرور نہیں ہے۔[1]

بیع کی نسبت مدعی کے رضامند ہونے سے اُس کا حق شفع زائل ہو جاتا ہے

دستبرداری حق

مثلاً اگر مدعی بائع سے مبیعہ کے خریدنے[2] یا اُس کو پٹہ پر لینے کے واسطے رضامند ہو جائے تو اُس کا اپنے حق سے دست بردار ہونا سمجھا جاتا ہے۔ مدعی کی رضامندی واقعات سے ثابت ہونی چاہیئے محض مقدمہ بازی کو روکنے کی غرض سے مدعی کا بائع کو زر ثمن ادا کرنے راضی ہو جانا مدعی کے خلاف دست برداری اور رضامندی کا اثر نہیں پیدا کر سکتا ہے۔[3]

مبیعہ کی قیمت کی مقدار اور قسم یا خریدار یا ذات مبیعہ کے متعلق غلط اطلاع ملنے کے سبب سے مدعی کا اپنے حق شفع سے دست بردار ہونا اُس کے سقوط حق کا باعث نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے کسی ایک امر کی نسبت صحیح اطلاع ملنے پر مدعی دست بردار ہونے کے بعد بھی اپنے حق کا طالب ہو سکتا ہے۔[4]

اگر شفیع ایک شخص کے واسطے اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو دوسرے کے مقابلہ میں اُس کا حق شفع کا دعوے کرنا باطل نہیں ہے مثلاً اگر شفیع کو اطلاع ملنے سے کہ الف مبیعہ کا خریدار ہوا ہے وہ اپنے حق سے دست بردار ہوتا ہے اور جب اس کے بعد اُسے علم ہو کہ جائداد مشفوعہ کو فی الحقیقت کسی دوسرے شخص نے

۱؎ مانا سنگھ بنام راما دین سنگھ (۱۸۸۱ء) الہ آباد جلد ۴ صفحہ ۲۵۲ - ہرجاس بنام کنھیا (۱۸۸۴ء) الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۱۱۸ - سالک رام سنگھ بنام رگھوبر دیال (۱۸۸۷ء) کلکتہ جلد ۱۵ صفحہ ۲۲۴ -

۲؎ دیکھو حبیب النسا بنام برکت علی (۱۸۸۶ء) الہ آباد جلد ۸ صفحہ ۲۷۵ - اور اس کے ساتھ مقابلہ کرو ٹارل کمہار بنام اچھی (۱۸۷۲ء) بنگال لا رپورٹس اپیل کیسز جلد ۹ صفحہ ۲۵۳ - مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۱۸ صفحہ ۴۰۱ - اس مقدمہ میں تجویز ہوئی کہ شریک حصہ دار کا حق ساقط ہو گیا ہے۔

۳؎ محمد نصیر الدین بنام عبد الحسن (۱۸۹۴ء) الہ آباد جلد ۱۶ صفحہ ۳۰۰ - محمد یونس خاں بنام محمد یوسف (۱۸۹۷ء) الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۳۳۴ -

۴؎ مقابلہ کرو آبادی بیگم بنام نعام بیگم (۱۸۷۷ء) الہ آباد جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ کے ساتھ -

خرید اہے تو وہ اپنے حق کا دعوے کر سکتا ہے۔

جس صورت میں شفیع کو مبیعہ کی نسبت مختلف قسم کے حقوق شفع حاصل ہوتے ہیں تو اُس کے ایک حق کے زائل ہونے سے دوسرے حقوق ساقط نہیں ہوتے لہذا ایسی صورت میں اگر شفیع مبیعہ کا حصہ دار اور ہمسایہ ہو تو وہ بحیثیت حصہ دار اپنا حصۂ جائداد فروخت کر سکتا ہے اور بیع کرنے کے باوصف ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے جائداد سابق کے خلاف اگر وہ کسی دوسرے کو منتقل ہو تو بیع شفع کی نالش کر سکتا ہے[1]۔

شفع کا حق شخصی ہے۔ چونکہ شفع کا حق شخصی ہے اس لئے ایسا حق ایک شخص سے دوسرے کو وراثتاً منتقل نہیں ہو سکتا لیکن جس صورت میں کہ دو شخص شفع کا استحقاق رکھتے ہیں اُن کی ایک جداگانہ حالت ہے۔

اگر شفیع مطالبات ضروری و شرعی کرنے کے پہلے یا عدالت سے شفع کی ڈگری ملنے کے بعد لیکن مبیعہ پر قبضہ پانے کے پہلے مرجائے تو اُس کا حق اُسی کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے[2]۔ لیکن حق شفع مشتری کی فوتی سے زائل نہیں ہوتا لہذا مشتری کے مرنے کے بعد شفیع اپنے حق کا دعوے کر کے مشتری کے ورثا سے مبیعہ لے سکتا ہے۔

ازالۂ حق جب شفیع کے دعوی کرنے پر عدالت کو ثابت ہو کہ قبل نالش اُس نے اپنی اُس جائداد کو جس کی بنا پر وہ حق شفع کا طالب ہوا ہے کسی دوسرے کو

---

[1] دو مقدموں میں کلکتہ ہائی کورٹ نے مدعی کے خلاف جبکہ اُس نے شرکت اور حصہ داری کی بنا پر حق شفع کا دعوے کیا تھا فیصلہ کیا ہے کہ مدعی کو ایسی صورت میں ہمسائگی کی بنا پر ڈگری نہیں مل سکتی۔ کنجا بہاری لال بنام گردھاری لال (۱۸۶۸ء) بنگال لا رپورٹس شارٹ نوٹس جلد ا صفحہ ۱۲ مطابق ویکلی رپورٹر جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۹۔ شیو سہائے ملک بنام ہری سہائے سنگھ (۱۸۶۹ء) بنگال لا رپورٹس ضمیمہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۲۔ لیکن اس حق میں اور اُس حق شفع میں جو پہلے حق سے بہتر ہو اور اثر قانونی کی بنا پر ساقط ہو جائے بڑا فرق ہے ۱۲۔

[2] محمد حسین بنام نعمت اللہ (۱۸۹۷ء) الہ آباد جلد ۲۰ صفحہ ۸۸۔

منتقل کردی ہے تو اُس کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے[۱]۔ عدالت سے چارہ کار (دادرسی) پانے کے لیئے مدعی کو ثابت کرنا چاہیئے کہ بوقت صدور ڈگری اُس کو حق شفع مبیعہ کا حاصل تھا[۲]۔ جب تک شفیع اُس جائداد کا جس کی بنا پر اُس کو مبیعہ لینے کا حق حاصل ہوتا ہے پوری طرح سے کسی دوسرے کو انتقال نہ کرے اُس کا حق شفع ساقط نہیں ہوتا اور نہ جزئی یا سرسری انتقال جائداد سے مدعی کا ایسا حق تلف ہوسکتا ہے۔

اگرچہ شفیع ڈگری ملنے کے پہلے اپنا حق شفع منتقل نہیں کر سکتا ہے[۳] لیکن جائداد متنازعہ یعنے مشفوعہ کو ڈگری ملنے کے بعد منتقل کر سکتا ہے[۴]۔

کوئی شخص اُس وقت تک حق شفع کا مستحق نہیں ہوسکتا جب تک کہ

شفیع کا مالک جائداد ہونا لازم ہے۔	وہ خود کسی ایسی جائداد کا جس کی بنا پر وہ شفع کا طالب بننا چاہتا ہے مالک نہ ہووے لیکن ایسے شخص کے لیئے اپنی اُس طرح کی ملک پر قبضۂ واقعی ہونے کی ضرورت نہیں ہے[۵]۔

کسی اسامی اراضی یعنے پٹہ دار یا مرتہن یا کسی بےنامی دار محض کو اسباب مسلمۂ شرعیہ کی بنا پر شفع کے دعوے کا حق نہیں ہے[۶]۔

ہندو بیوہ	چونکہ ہندو بیوہ کی پرورش کے لیئے جو جائداد دی جاتی ہے وہ اُس کی

---

[۱] جانکی پرشاد بنام اشور داس (۱۸۹۹ع) الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۳۷۴۔

[۲] رام گوپال بنام پیارے لال (۱۸۹۷ع) الہ آباد جلد ۲۱ صفحہ ۴۴۱

[۳] راجو بنام لعل میاں (۱۸۸۲ع) الہ آباد جلد ۵ صفحہ ۱۸۰۔

[۴] رام سہائے بنام گیا (۱۸۸۴ع) الہ آباد جلد ۷ صفحہ ۱۰۷۔

[۵] سکینہ بی بی بنام امیرن (۱۸۸۸ع) الہ آباد جلد ۱۰ صفحہ ۴۷۲۔ اور اس کا مقابلہ بینی شنکر شیلھٹ بنام مہا پال بہادر سنگھ (۱۸۸۷ع) الہ آباد جلد ۹ صفحہ ۴۸۰ کے ساتھ کرو۔

[۶] گمان سنگھ بنام تری پول سنگھ (۱۸۶۷ع) ویکلی رپورٹر جلد ۸ صفحہ ۴۳۷۔

دائمی ملک متصور ہوتی ہے لہذا جب بیوہ اُس پر قابض ہو جائے تو اُس کو حق شفع پیدا ہو جاتا ہے [1]

حق شفع جو واجب العرض کی رو سے پیدا ہوتا ہے

حق شفع جو بر بنائے تختۂ بندوبست موضع یا جس کو ممالک مغربی و شمالی میں واجب العرض کہتے ہیں اُس میں اور شرع محمدی کے حق شفع میں اکثر امور کے نظر کرتے بہت کچھ اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک مقدمہ میں الہ آباد ہائی کورٹ نے تجویز کی ہے کہ جب کسی گاؤں کے چند حصہ دار ہوں اور اُن میں کا ایک حصہ دار اپنے کامل یا جزو حصہ کو ایک دوسرے حصہ دار اور ایک غیر شخص کے ہاتھ ایک ہی بیعنامہ کے ذریعہ سے فروخت کرے تو اگر وہ حصہ جو غیر کو منتقل ہوا ہے مشتریٔ شریک کے حصہ سے جدا ہو سکتا ہے تو باقی حصہ داران شریک شخص غیر کا حق لینے کے مستحق ہیں۔ لیکن جس صورت میں منتقلہ و مبیعہ حصوں میں اس طرح فرق نہ ہو سکتا ہو تو شریک حصہ داراں باقی دونوں خریداروں کے خلاف کامیاب ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں [2]

شفیع مبیعہ کی تقسیم نہیں کر سکتا

اگر شفیع کے حق کا تعلق پوری جائداد مبیعہ سے ہو تو وہ محض جائداد کے ایک جزو کی نسبت دعوی کر کے دوسرے جزو کے لینے سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ اس طرح مبیعہ کی تقسیم کرا سکتا ہے بلکہ اُس کو پورے معاملۂ بیع کے خلاف دعوی کرنا چاہیئے [3]

لیکن جب مبیعہ کو چند لوگ خرید کر اُس میں اپنے مختلف حصے ٹھیرائیں تو شفیع پوری جائداد یا اُس کے کسی حصہ کے لینے کے لیئے دعوی کر سکتا ہے۔

---

[1] محمد یوسف علی خاں بنام دل کنور (۱۸۹۷ء) الہ آباد جلد ۲۰ صفحہ ۲۴۸۔

[2] رام ناتھ بنام بدری نرائن (۱۸۹۶ء) الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۱۴۸۔ شیو بہادر رائے بنام جیاک رائے (۱۸۸۶ء) الہ آباد جلد ۸ صفحہ ۴۶۲۔

[3] درگا پرشاد بنام منبی (۱۸۸۴ء) الہ آباد جلد ۶ صفحہ ۴۲۳۔ امیر حسن بنام رحیم بخش (۱۸۹۷ء) الہ آباد جلد ۱۹ صفحہ ۴۶۶۔

تدبیر سقوط حق شفعہ

جن تدبیروں اور حیلوں سے حق شفعہ کا ازالہ کیا جاتا ہے اُس میں سے ایک تدبیر حسب ذیل ہے:۔ عموماً جائداد مشفوعہ کا مالک اپنے ہمسایہ کے حق شفعہ کو مٹانے کی غرض سے اپنی جائداد کے ایک حصہ کو جو شفیع کی جائداد سے متصل ہو اور خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو خارج کر دیتا ہے جس کے سبب سے شفیع کی جائداد میں اور مبیعہ میں فصل واقع ہو جاتا ہے۔

میعاد دعویٰ

قانون میعاد سماعت ہند (ایکٹ ۱۵ سنہ ۱۸۷۷ء) جدول ۲ کے فقرہ ۱۰ میں حق شفعہ کے دعوے کی مدت بتلائی گئی ہے۔ انتقال جائداد کے متعلق ہند میں ایکٹ نشان ۴ بابت سنہ ۱۸۸۲ء نافذ ہے اور اُس میں بیعبات کی نسبت چند احکام و قواعد درج ہیں۔ اگرچہ اُن احکام وغیرہ کی رو سے مرتہن کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے لیکن اُس کے دعوے کی مدت اُس تاریخ سے نہیں شروع ہوتی جو تاریخ بیعبات کی ڈگری میں قانون مذکور کی دفعہ ۸۶ کی ضمن میں راہن کے مرتہن کے قرضہ وغیرہ کو ادا کرنے کے لیئے مقرر کی جاتی ہے بلکہ دعویٰ شفعہ کا حق اُس تاریخ سے پیدا ہوتا ہے جس تاریخ کہ مرتہن کو قانون متذکرۂ صدر کی دفعہ ۸۷ کے تحت میں عدالت سے بیعبات کا حکم قطعی عطا ہوتا ہے۔[1]

---

[1] بتول بیگم بنام منصور علی خاں (۱۸۹۸ء) انڈین لا رپورٹس الہ آباد جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۵۔ انوار الحق بنام جوالا پرشاد رپورٹ وجلد مذکور صفحہ ۳۵۸۔ رحم الٰہی خاں بنام گھسیٹا رپورٹ وجلد مذکور صفحہ ۳۷۵۔ شفعہ کے حق دعوے کے متعلق دیکھو الہ آباد جلد ۲۲ صفحہ ۲۴۰۔

باب پنجم[۱]

بیع

فصل اوّل

مشاہدات عام

تعریف بیع — ایک شخص کا اپنی کسی مخصوص چیز کو کسی مستقل و معین بدل کے عوض دوسرے کو منتقل کرنا بیع کہلاتا ہے۔

معاہدۂ بیع کے وقت اس مال کا جو منتقل کیا جاتا ہے موجود ہونا ضرور نہیں ہے۔ بہر حال بوقت تکمیل معاہدہ مبیعہ کا موجود ہونا یا اس امر کی امید کرنا کہ تکمیل معاہدہ کے وقت بکنے والی شئے موجود و ہمدست ہو سکتی معاہدۂ بیع کو جائز کرنے کے لیئے کافی ہے۔

جو انتقال مال و جائداد کہ معاوضۂ رقم یا اُن چیزوں کے معاوضہ میں جو روپیہ کی علامت ہو سکتی ہیں یا اس کی بجائے استعمال ہوتی ہیں عمل میں آتا ہے اُن ہی قواعد کے تابع ہے جن کا تبادلۂ اشیاء و جنس پر اطلاق ہوتا ہے۔

ع ۱ چونکہ ہندوستان میں معاہدے اور انتقال جائداد کی نسبت سرکار نے قانون بنا کر نافذ کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمان بھی ان دونوں امور میں اُس قانون کے تابع ہیں اس لیئے شرع محمدی کے وہ اصول جن کا تعلق بیع اور معاہدہ سے ہے ہند کے قانون معاہدہ اور قانون انتقال جائداد سے منسوخ ہو گئے ہیں۔ برانہم میں نے اس باب کا کتاب ہذا میں اس لیئے اضافہ کیا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم قانون میں شرع اسلام کی بیع بھی شامل ہے ۱۲

ایک بیع تو وہ ہے جس میں بیع کا معاہدہ ہوتے ہی فریقین مال اور معاوضہ کو

اقسام بیع

ایک دوسرے کے حوالہ کر دیتے ہیں اور دوسری بیع وہ ہے جس میں فریقین کے درمیان معاملہ کی بات طے پاتی ہے لیکن اُس کی تکمیل کسی آئندہ زمانہ پر ملتوی کر دی جاتی ہے پہلی قسم کے معاملہ کو بیع قطعی کہتے ہیں اس سے مراد "بیع خالص" یعنے ایسی قسم کی بیع جس میں وہ اشیاء جو ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ ہوتی ہیں وہ ایک دوسرے کی قیمت سمجھی جاتی ہیں تو اس بیع کو اصطلاحاً "قطعی" کہتے ہیں۔

عموماً دوسری قسم کی بیع کو "سلم" کہتے ہیں اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا معاہدۂ بیع ہے جس میں معاملہ کے ساتھ قیمت ادا کر دی جاتی ہے لیکن مال کسی قدر تاخیر کے ساتھ مشتری کو حوالہ کیا جاتا ہے یعنے اس قسم کی بیع میں مال کے پہنچانے میں تعویق کرنے سے معاہدۂ بیع فسخ نہیں ہوتا۔

تقسیم بالا کی رو سے بیع کی حسب ذیل قسمیں ہیں:—

(الف) بیع قطعی، (ب) بیع مشروط، (ج) بیع ناممکل (د) بیع ناجائز۔

(الف) بیع قطعی وہ ہے جو فوراً اثر پذیر ہوتی ہے یعنے ایجاب و قبول کے ساتھ ہی معاہدۂ بیع مکمل ہو جاتا ہے۔

(ب) بیع مشروط وہ ہے جس میں مالک کی جانب سے اس کا مختار معاملۂ بیع کو طے کرتا ہے اور اُس کی تعمیل مالک کی منظوری پر منحصر ہوتی ہے اور جس صورت میں فریقین معاہدہ سے کوئی ایک نابالغ ہو تو معاملۂ بیع کی تکمیل ولی کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوتی۔

(ج) بیع غیر مکمل ایک قسم کا اقرار خرید و فروخت ہے جس کی تکمیل طرفین میں مبیعہ اور معاوضہ کے ردّ و بدل سے ہوتی ہے۔

(د) بیع ناجائز وہ ہے جس میں مبیعہ کے حاصل کرنے کے لئے معاوضۂ قانونی نہ دیا جائے۔

ہر ایک شۓ جس کی از روئے قانون کچھ قیمت قرار پا سکتی ہو اور جس کے متعلق

بدل

بائع اور مشتری باقاعدہ طور پر راضی ہو جائیں بدل یعنے معاوضہ

ہوسکتی ہے لیکن معاہدۂ بیع کے وقت بدل کا معین ہوجانا لازم ہے یا اگر اُس کا تعین نہ ہوا ہو تو بدل ایسی شے ہونی چاہیئے جس کا قرار داد بیع کے بعد بھی تعین و تشخص ہوسکتا ہو۔

ایجاب وقبول کے ذریعہ سے بیع کا معاہدہ کیا جاتا ہے۔ بیع کے لیئے مخصوص الفاظ میں مطلب کا ظاہر کرنا ضرور نہیں ہے۔ فریقین جس زبان میں اور جس قسم کے الفاظ چاہیں ادائے مطلب کے لیئے استعمال کرسکتے ہیں بشرطیکہ بائع اور مشتری ایک دوسرے کے مفہوم اور نیت سے بخوبی واقف ہوجائیں۔ بیع زبانی بھی ہوسکتی ہے اور خط یا نامہ و پیام اور قاصد کے ذریعہ سے بھی طے پاسکتی ہے۔

ایجاب وقبول

ایجاب وقبول کے قطعی ہوجانے سے فریقین بیع کے پابند ہوجاتے ہیں لیکن اگر مجلس بیع میں ایجاب وقبول نہ کیا جائے تو معاملہ کالعدم ہوجاتا ہے۔

مال کی وضع وقطع اور اُس کی خوبی کی نسبت غلط بیانی کرنے سے معاہدۂ بیع باطل ٹھیرتا ہے۔

معاہدۂ بیع کے فریقین کو معاملہ کے حسن وقبح سے بخوبی واقف ہونا چاہیئے۔ مجنون بھی اُس زمانہ میں جبکہ اُسے جنون کا دورہ نہ ہوا اور اُس کی عقل بجا ہو بیع کا معاہدہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح نابالغ کا برضامندی ولی معاہدہ کرنا جائز ہے۔

جس طرح بدل کا معین و مشخص ہونا ضرور ہے اُسی طرح جواز معاہدۂ بیع کے لیئے مبیعہ کا تعین و تشخص لازم ہے اور ان دونوں کے متعلق فریقین میں جو گفتگو یا تحریر ہوتی ہے اُس میں کسی قسم کا ابہام یا تذبذب نہ ہونا چاہیئے۔

فصل دوم

اختیار تکمیل بیع

فریقین کا اختیار تکمیل بیع

معاہدۂ بیع کو فسخ کرنے کا اختیار بائع اور مشتری دونوں

اپنے لیئے مخصوص کر سکتے ہیں لیکن اس اختیار کی بنا پر بیع کی تکمیل تین دن سے زیادہ ملتوی نہیں ہو سکتی۔

جو شخص اپنے لیئے اختیارِ تکمیل بیع کو محفوظ کرتا ہے اگر وہ شے مبیعہ کو قبول کرلے تو بیع کا معاہدہ مکمل ہو جاتا ہے۔

بائع کی جانب سے ایسی شرط کا عائد کرنا کہ اگر تین دن کے اندر مشتری مال مبیعہ کی قیمت ادا نہ کرے تو بیع کالعدم سمجھی جائیگی شرعاً جائز ہے۔

جس صورت میں بائع اختیارِ تکمیل بیع کو اپنے لیئے محفوظ کرتا ہے تو مبیعہ کی ملکیت اس سے جدا نہیں ہوتی لیکن جب مشتری اختیار مذکور کو اپنے واسطے مخصوص کرے اور مال اُس کے حوالہ ہو جائے اور بعد حوالگی مال کو کوئی ضرر پہنچے یا تلف ہو جائے تو مشتری ادائی قیمت کے لیئے ذمہ دار ہے۔

اور اگر بائع اختیار متذکرہ کو اپنے واسطے مخصوص کرلے تو صرف واجبی قیمت ادا کرنے کی ذمہ داری مشتری پر عائد ہوتی ہے۔

مشتری معائنۂ مال کے بعد اُس کے خریدنے سے انکار کر سکتا ہے حالانکہ مال دیکھنے کے بغیر خریدنے کے وقت اُس نے اُسے پسند کر لیا ہو۔

اگر کوئی شخص مکان کے سامنے کا رُخ دیکھ کر اُس کو خرید لے تو پھر اُس کا اختیار معائنہ (یعنے مکان دیکھنے کے بعد پسند و ناپسند کرنے کا اختیار) باقی نہیں رہتا گو اُس نے مکان کے اندرونی حصوں کو کبھی نہ دیکھا ہو۔ اور یہی کیفیت اُس خریدار کی ہے جو مکان کے عقب کا رخ یا باغ کے درختوں کو دیکھ کر بلا معائنۂ کامل مکان یا باغ کو خریدتا ہے۔

اگر خریدار چیز کے خریدنے کے وقت اُس کے عیب و نقص سے واقف نہ ہو اور بیع کے واقع ہونے یعنے خرید لینے کے بعد اُس کو اُس عیب و نقص کا علم ہو تو وہ بائع کو مبیعہ واپس کر سکتا ہے۔

اگر ادائی قیمت کسی آئندہ زمانہ کے لیئے ملتوی رکھی جائے تو وقت ادائی کا معین و محقق ہونا ضرور ہے۔ ادائی قیمت کے لیئے کوئی غیر معین یا ایسا وقت قرار نہیں دیا جا سکتا جو کسی واقعۂ اتفاقی پر مبنی ہو اور نہ کسی واقعہ پر ادائی منحصر

کی جا سکتی ہے۔

جب تک مال مبیعہ مشتری کے قبضۂ حقیقی میں نہ آ جائے اُس کو اُس کے دو بارہ فروخت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن زمین کو مشتری اپنے قبضہ میں آنے کے قبل بیع کر سکتا ہے۔

مشتری کا مبیعہ کو فروخت کرنے کا اختیار

ہر ایک معاہدۂ بیع میں بائع کی جانب سے مبیعہ کے بے عیب اور نقص و خرابی سے پاک وصاف ہونے کا ضمناً اقرار متصور ہوتا ہے۔

اگر مبیعہ کی اُس مقدار یا حیثیت و قسم میں جس کو بائع مشتری سے بیان کرتا ہے خریدنے کے بعد اختلاف ہو تو مشتری کو معاہدۂ بیع کے فسخ کرنے کا اختیار رہے۔

بصورت فروخت قطعۂ زمین اُس پر کی ہر ایک شے جس کا ملحقات میں شمار نہیں ہو سکتا یعنے ایسی شے جو زمین مبیعہ سے جدا ہو سکتی ہے بیع میں شامل نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ درخت ثمر دار کی شکل میں اگرچہ درخت زمین سے ملحق ہونے کی وجہ سے زمین مبیعہ کے ساتھ مشتری کی مِلک سمجھا جاتا ہے لیکن اُس کا میوہ بائع کی مِلک شمار ہوتا ہے۔

اگر مشتری شرط پسند یا ناپسند قائم کرنے کے بعد مبیعہ کے ساتھ اس طرح مسلوک ہو جس سے اُس کا اختیار مالکانہ ظاہر ہو سکے اور مبیعہ کی حیثیت بدل جائے تو اُس کا اختیار تکمیل بیع باقی نہیں رہتا بلکہ مبیعہ اُس کی مِلک ہو جاتی ہے اور مشتری قیمت مقررہ کی ادائی کا ذمہ دار قرار پا جاتا ہے۔

مشتری کا اختیار کیونکر منسوخ ہوتا ہے

جس صورت میں خریدار مال کو خریدنے کے پہلے نہ دیکھے یا اگر نمونہ لینے کا طریقہ ہے تو نمونہ تک کا معائنہ نہ کرے تو اُس کو مال کے وصول ہونے اور حسب اطمینان خود نہ پائے جانے کی حالت میں بشرطیکہ اس نے مبیعہ کے ساتھ صریحاً اپنے کسی فعل سے اپنی ملکیت کا اظہار نہ کیا ہو تکمیل معاہدہ سے دست کش ہونے کا اختیار ہے۔

اگر مشتری کسی چیز کو اُس کے کُل عیوب و نقائص کے ساتھ لینے کے واسطے راضی نہ ہوا ہو اور مال وصول ہونے کے بعد اُس میں کچھ ایسا نقص نظر آئے جس سے بوقت خریداری وہ واقف نہ ہوا ہو تو وہ بائع کو مبیعہ واپس کرنے کا مجاز ہے بشرطیکہ مبیعہ مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد خراب اور کم نہ ہوئی ہو ورنہ مشتری صرف تاوان پانے کا مستحق ہوگا۔

اور جب مشتری ایسی ناقص شئے مبیعہ کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرے تو وہ بائع اول سے تاوان لینے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

چیز کے خریدنے کے بعد امتحان کرنے پر اُس کا عیب اور نقص معلوم ہو تو مشتری بائع سے کامل قیمت واپس کرا سکتا ہے حالانکہ شئے مبیعہ آزمایش میں تلف و ضائع ہی کیوں نہ ہو جائے بشرطیکہ مشتری کو اس سے کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچا ہو لیکن اگر اشیائے ناقص و معیوب سے مشتری فائدہ اُٹھایا ہے تو نقص یا عیب کی مناسبت سے وہ تاوان پانے کا مستحق ہوگا۔

حق مشتری نسبت تاوان

جب ایک شخص چیز خرید کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے اور مشتری دوم کے پاس وہ ناقص (و معیوب) ثابت ہو اور دوسرا خریدار پہلے خریدار کو قیمت واپس کرنے کے لئے مجبور کرے تو بائع دوم بائع اول سے قیمت واپس مانگنے کا مستحق ہے بشرطیکہ شے زیر بحث میں جبکہ وہ خریدار اول کے پاس تھی نقص یا عیب موجود رہا ہو۔

لیکن مشتری کے طرز عمل سے اگر مبیعہ کے عیب و نقص کے متعلق رضامندی پائی جائے تو اُس کا تاوان پانے یا قیمت کے واپس لینے کا حق باقی نہیں رہتا ہے۔

اگر تقسیم کرنے سے مبیعہ کو ضرر پہنچتا ہے اور خریدنے کے بعد مبیعہ کا ایک حصہ مشتری کی رائے میں ناقص قرار پائے یا شخص ثالث کی ملک ثابت ہووے تو مشتری مبیعہ کے ایک حصہ کو اپنے پاس رکھ کر دوسرے حصہ کو بائع کو واپس دینے کا مستحق نہیں ہے اور نہ حصۂ واپس کردہ کی مناسبت سے

اُس کی قیمت کی واپسی کا طالب ہو سکتا ہے لہٰذا ایسی صورت میں مشتری کو کامل مبیعہ اپنے پاس رکھ کر صرف ناقص حصہ کے متعلق تاوان طلب کرنا چاہئیے یا پورے مبیعہ کو واپس کر کے کامل قیمت کی واپسی کا طالب ہونا لازم ہے۔

لیکن جب مبیعہ کے چند حصے اس کو ضرر پہنچنے کے بغیر جدا ہو سکتے ہیں تو اُس پر اس قاعدہ کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔

بیع جس میں اختیارِ تکمیل محفوظ کیا جاتا ہے بیع موقوف کہلاتی ہے اور جب مشتری ایسی بیع میں مبیعہ پر اپنا قبضہ کر لیتا ہے یا اختیارِ تکمیل کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو اس طرح کی بیع خود بخود قطعی ہو جاتی ہے۔

بیع میں اُن نتائج قانونی کا جو کسی معاملہ کی تکمیل کے بعد منتج ہوتے ہیں اُس وقت ظہور ہوتا ہے جبکہ بیع قطعی ہو جاتی ہے یعنے اُس کا معاہدہ مکمل ہوتا ہے[1]۔

---

[1] انجم النسا بنام عجائب علی خاں (۱۹۰۰ء) انڈین لارپورٹس الہ آباد جلد ۲۲ صفحہ ۴۴۲۔

ضمیمہ (۱)

ذوی الفروض

باپ، ماں اور بیٹی

باپ	=	$\frac{1}{6}$
ماں	=	$\frac{1}{6} = \frac{5}{6}$
بیٹی	=	$\frac{1}{2}$

باقی متروکہ (یعنے سدس حصہ) باپ کو ملتا ہے۔ اگر متوفی کی دو بیٹیاں ہوں تو باپ کو $\frac{1}{6}$ اور ماں کو $\frac{1}{6}$ اور دو بیٹیوں کو $\frac{2}{3} = \frac{4}{6}$ ملیگا۔
(باقی ندارد)

باپ، ماں، بیٹی اور بیٹا

باپ	=	$\frac{1}{6}$
ماں	=	$\frac{1}{6}$
بیٹا	=	$\frac{2}{3} \times \frac{2}{3} = \frac{4}{9}$
بیٹی	=	$\frac{1}{3} \times \frac{2}{3} = \frac{2}{9}$

اگر دو بیٹیاں ہوں تو

باپ	=	$\frac{1}{6}$
ماں	=	$\frac{1}{6}$
بیٹا	=	$\frac{3}{9}$
دو بیٹیاں	=	$\frac{3}{9}$

باپ، ماں اور شوہر

شوہر = $\frac{1}{2}$

ماں = $\frac{1}{3} \times \frac{1}{2} = \frac{1}{6}$

باپ = $\frac{1}{3}$
(بحیثیت عصبہ)

ماں، باپ اور ایک بہن :۔

ماں = $\frac{1}{3}$

باپ = $\frac{2}{3}$
(بحیثیت عصبہ)

باپ کے سبب سے بہن محجوب الارث ہوتی ہے۔

ماں، باپ اور دو بہنیں :

ماں دو بہنوں کے سبب سے = $\frac{1}{6}$

باپ (ذی رحم ہونے کے سبب سے) = $\frac{5}{6}$

باپ کی وجہ سے بہنیں محروم ہوجاتی ہیں۔

باپ، ماں، بیٹی اور دو پوتیاں =

باپ = $\frac{1}{6}$

ماں = $\frac{1}{6}$

بیٹی = $\frac{1}{2}$

دو پوتیاں = $\frac{1}{6}$

اگر اس مثال میں دو بیٹیاں ہوتیں تو ان دونوں کو دو ثلث ملتا اور پوتیاں محروم ہوجاتیں

ذوی الفروض

دادی، نانی اور دادا:

دادی اور نانی = $\frac{1}{6}$

دادا = $\frac{5}{6}$

دو بیٹیاں، ایک پوتی اور ایک پڑپوتا:

دو بیٹیاں = $\frac{2}{3}$

پڑپوتا = $\frac{1}{3} \times \frac{2}{3} = \frac{2}{9}$

پوتی = $\frac{1}{3} \times \frac{1}{3} = \frac{1}{9}$

زوجہ (بیوہ)، ماں، دو بیٹے اور تین بیٹیاں

بیوہ = $\frac{1}{8}$ ⎫

ماں = $\frac{1}{6}$ ⎭ $= \frac{14}{48} = \frac{98}{336}$

دو بیٹے = $\frac{4}{7} \times \frac{34}{48} = \frac{136}{336}$

تین بیٹیاں = $\frac{3}{7} \times \frac{34}{48} = \frac{102}{336}$

عول

شوہر، ماں، تین حقیقی بہنیں، چار علاتی بھائی اور بہنیں اور دو اخیافی بھائی اور بہنیں:

شوہر = $\frac{3}{6}$

ماں = $\frac{2}{6}$

تین حقیقی بہنیں = $\frac{3}{6}$

دو اخیافی بھائی اور بہنیں = $\frac{2}{6}$

$= \frac{10}{6}$

چونکہ اس شکل میں علاتی بھائی اور بہنوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا لہذا مسئلۂ عول کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

شوہر = $\frac{3}{10}$

ماں = $\frac{2}{10}$

تین حقیقی بہنیں = $\frac{3}{10}$

دو اخیافی بہنیں اور بھائیاں = $\frac{2}{10}$

چونکہ یہ لوگ ذوی الفروض شرعی ہیں اس لیئے یہ مساوی حصے

پاتے ہیں اور اُن کو علاتی بھائی بہنوں پر ترجیح ہے۔

شوہر، باپ، ماں، دو بیٹیاں:

شوہر	=	$\frac{1}{4}$
باپ	=	$\frac{1}{6}$
ماں	=	$\frac{1}{6}$
دو بیٹیاں	=	$\frac{2}{3}$
	مجموعہ =	$\frac{15}{12}$

اس شکل میں مقسوم عام ۱۵ تک بڑھانا چاہیئے اور اُس کی مناسبت سے سہام میں کمی کا ہونا لازم ہے۔

شوہر $\frac{3}{15}$ باپ $\frac{2}{15}$ ماں $\frac{2}{15}$ اور دو بیٹیاں $\frac{8}{15}$

باپ، ماں، بیوہ اور دو بیٹیاں:-

بیوہ	=	$\frac{1}{8}$
باپ	=	$\frac{1}{6}$
ماں	=	$\frac{1}{6}$
دو بیٹیاں	=	$\frac{2}{3}$
	مجموعہ =	$\frac{27}{24}$

حالاتِ بالا کے لحاظ سے مقسوم عام کو ۲۷ تک بڑھانا چاہیئے اور اُس کی مناسبت سے حصص میں کمی کرنی چاہیئے۔

بیوہ	=	$\frac{3}{27}$
باپ	=	$\frac{4}{27}$
ماں	=	$\frac{4}{27}$
دو بیٹیاں	=	$\frac{16}{27}$

رد

بیوہ، ماں اور بیٹی:

بیوہ	=	$\frac{1}{8}$
ماں	=	$\frac{1}{6}$
بیٹی	=	$\frac{1}{2}$
	مجموعہ =	$\frac{19}{24}$

ماں : بیٹی $= \frac{1}{6} : \frac{1}{2} = 1 : 3$

ماں اور بیٹی کی مناسبت سے اُن دونوں میں تقسیم کرو $= \frac{5}{96} : \frac{15}{96}$

بیوہ	=	$\frac{1}{8} = \frac{12}{96}$
ماں	=	$\frac{1}{6} + \frac{5}{96} = \frac{21}{96}$
بیٹی	=	$\frac{1}{2} + \frac{15}{96} = \frac{21}{96}$

علاتی بہن یا بہنیں ایک حقیقی بہن کے ساتھ جبکہ کوئی حاجب موجود نہ ہو ($\frac{2}{3} - \frac{1}{2} = \frac{1}{6}$)۔

ایک حقیقی بہن اور چند علاتی بہنیں:۔ حقیقی بہن $\frac{1}{2}$،

علاتی بہنیں $\frac{1}{6}$ یا جیسا کہ $\frac{3}{6} : \frac{1}{6}$،

حقیقی بہن $= \frac{3}{6}$، علاتی بہنیں $\frac{1}{6}$ کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیتی ہیں۔

دو بیٹیاں، دو پوتیاں، تین علاتی بہنیں:۔

دو بیٹیاں $= \frac{2}{3}$، تین علاتی بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عُصبہ مع الغیر ہونے سے $\frac{1}{3}$ حصہ ملتا ہے اور پوتیاں بیٹیوں کے ساتھ عَصبہ مع الغیر نہ ہونے سے محجوب ہو جاتی ہیں۔

دو پوتیاں ایک حقیقی بہن اور چند علاتی بہنیں:۔

متوفی سے قرابت قریبہ رکھنے کے سبب سے حقیقی بہن متعدد علاتی بہنوں کو محروم کر دیتی ہے اور اس بنا پر اُسی کو باقی متروکہ بھی ملتا ہے۔ دو پوتیاں $= \frac{2}{3}$، حقیقی بہن $= \frac{1}{3}$،

شوہر	=	$\frac{1}{4}$
بیٹیاں	=	$\frac{2}{3}$
بہن	=	$\frac{1}{12}$

میت کے باپ کا چچازاد بھائی میت کی بہن کے سبب سے محروم ہوتا ہے[1]۔

نمبر ۱۔ مہر جہاں بیگم بنام شہزادی بیگم کے فیصلہ میں جو انڈین لا رپورٹس بمبئی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱۲ پر شائع ہوا ہے اس اصول پر عمل کیا گیا ہے ۱۲۔

ضمیمہ (۲)

عصبات

"عصبات میں سب سے اقرب بیٹا ہے اُس کے بعد پوتا یعنے بیٹے کا بیٹا خواہ وہ سلسلہ میں کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ کے بعد سلسلۂ اعلیٰ عصبات میں شمار ہوتا ہے یعنے میت کا باپ دادا پردادا وغیرہ خواہ سلسلہ میں کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جب یہ دونوں اولاد و اجداد کے سلسلے ختم ہو جائیں تو میت کا حقیقی بھائی بعد ازاں علاتی بھائی اُسکے بعد حقیقی بھتیجا پھر علاتی بھتیجا اسکے بعد حقیقی چچا بعد ازاں علاتی چچا اُسکے بعد حقیقی چچازاد بھائی بعد ازاں باپ کا حقیقی چچا پھر باپ کا علاتی چچا اُس کے بعد باپ کا حقیقی چچازاد بھائی اُسکے بعد باپ کا علاتی چچازاد بھائی بعد ازاں دادا کا حقیقی چچا اور اسی طرح کے رشتہ دار عصبات متصور ہوتے ہیں۔ مبسوط میں عصبات کی بھی ترتیب بتلائی گئی ہے۔" (یاد رکھنا چاہیئے کہ ترتیب بالا میں جہاں کہیں بیٹے کے الفاظ آئے ہیں اُس سے مراد میت کے نسل کی اولاد نرینہ ہے)۔

ضمیمہ (۳)

محرمات شرعیہ

جن عورتوں سے نسب یعنے شرکت خون کے سبب سے نکاح کرنا شرعاً ناجائز ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

"ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، پھوپھیوں، خالاؤں سے نیز بھتیجیوں، بھانجیوں سے عقد نکاح کرنا یا تعلق زناشوئی پیدا کرنا یا زوجیت کا تعلق پیدا کرنے کی استدعا کرنا

ہمیشہ کے لیئے یعنے شخص طالب کی عمر کے ہر زمانہ میں اور ہر حالت میں ممنوع ہے۔ اور یہ کل رشتہ دار عورتیں مرد کے لیئے حرام موبد ہیں" ماؤں سے مراد کسی مرد کی حقیقی ماں اور اُس کی دادیاں اور نانیاں ہیں خواہ وہ کتنی ہی اونچی پشت کی کیوں نہ ہوں۔ بیٹیوں سے مراد ایک شخص کی حقیقی بیٹیاں اور پوتیاں اور نواسیاں ہیں خواہ وہ سلسلہ میں کتنی ہی نیچی کیوں نہ ہوں۔ بہنوں میں کل حقیقی اور علاتی اور اخیافی بہنیں شامل ہیں۔ اسی طرح حقیقی بھتیجیوں اور بھانجیوں میں خواہ سلسلہ میں وہ کتنی ہی نیچی ہوں۔ علاتی بھتیجیاں اور بھانجیاں گو سلسلہ میں کتنی ہی نیچی ہوں شامل ہیں

پھوپھیوں کی تین قسمیں ہیں:۔ حقیقی پھوپھی، علاتی پھوپھی (یعنے باپ کی علاتی بہن) اور اخیافی پھوپھی (باپ کی اخیافی بہن) علیٰ ہذا القیاس اس کے باپ کی پھوپھیاں دادا کی پھوپھیاں اور ماؤں کی پھوپھیاں اور دادیاں حرام موبد ہیں۔ خالہ کی بھی تین قسمیں ہیں:۔ کسی شخص کی حقیقی خالہ، علاتی خالہ (ماں کی علاتی بہن) اور اخیافی خالہ (ماں کی اخیافی بہن) اور والدین کی خالائیں۔

قرابت سببی کی بنا پر جو عورتیں حرام ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔
"زوجاؤں کی مائیں اور اُن کی دادیاں اور نانیاں۔ زوجہ کی بیٹیاں یا زوجہ کی اولاد کی بیٹیاں خواہ وہ درجہ میں کتنی ہی پست کیوں نہ ہوں (بشرطیکہ زوجہ سے زفاف ہوا ہو یعنے عقد نکاح کی تکمیل ہو گئی ہو) خواہ زوجہ کی بیٹی شوہر کے زیر پرورش رہی ہو کہ نہیں" (لیکن اس مسئلہ میں حنفیہ" زوجہ کی بیٹیوں کے حرام ہونے کے لیئے خلوت یا زوجہ کو تکمیل نکاح کا مساوی نہیں مانتے"۔ قرابت سببی کے تیسرے درجہ میں بیٹے کی زوجہ (بہو) یا پوتے کی زوجہ نواسے کی زوجہ خواہ درجہ میں پوتا یا نواسا کتنا ہی نیچا کیوں نہ ہو اور خواہ بیٹے نے اپنی زوجہ سے مباشرت کی ہو کہ نہیں شامل ہیں۔ اس قرابت کے چوتھے طبقہ میں ذیل کی عورتوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ آباد اجداد کی زوجائیں خواہ باپ کی جانب کی ہوں کہ ماں کی جانب کی اور خواہ پشت میں آبا و اجداد کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں۔ الغرض ان سب رشتہ کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا

یا مجامعت کرنا ممنوع ہے"۔

نکاح جائز ہونے کی صورت میں تحریم سببی واقع ہوتی ہے اور جب نکاح صحیح نہ ہو تو تحریم نہیں واقع ہوتی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے بذریعۂ عقد ناجائز نکاح کرلے تو منکوحہ کی ماں محض عقد نکاح کی بنا پر ناکح پر حرام نہیں ہوتی بلکہ ایسی شکل میں ہمبستری باعث تحریم ہے۔ یعنے تحریم سببی صرف اُسی وقت میں ہوتی ہے جبکہ مرد اور عورت میں مجامعت واقع ہو خواہ وہ حقیقت میں جائز ہو یا بظاہر جائز معلوم ہو یا ناجائز۔ جب مرد کسی عورت کے ساتھ زنا کرتا ہے تو اُس عورت کی ماں خواہ وہ درجہ میں کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو اور اُس کی بیٹیاں خواہ وہ درجہ میں کتنی نیچی کیوں نہ ہوں اُس پر حرام ہو جاتی ہیں اور اسی طرح وہ عورت مرد زانی کے باپ اور داداؤں پر خواہ وہ درجہ میں کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں اور اُس کے بیٹوں پر خواہ وہ درجہ میں کتنے ہی نیچے واقع ہوئے ہوں حرام ہو جاتی ہے۔

ضمیمہ (۴)

اہل کتاب

"جو لوگ کسی دین الٰہی کے معتقد ہیں اور ایسی کتب سماوی پر جیسا کہ توراۃ و زبور میں ایمان رکھتے ہیں صاحب کتاب کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ (مسلمانوں کا) شادی کرنا اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے"۔ اگرچہ فتاوائے عالمگیری میں زن مجوسیہ کو بت پرست و مشرک لکھا ہے لیکن مجوسیوں یعنے آتش پرستوں کا مذہب زردشت کے مذہب سے مختلف ہے۔

شیعوں کے نزدیک مجوس، نصاریٰ اور یہود کی ایک حیثیت ہے۔

فتاوائے عالمگیری اور رد المختار وغیرہ میں لکھا ہے کہ "مسلمان وہ شخص ہے جو وحدانیت خدا اور محمد مصطفےٰ کی رسالت من اللہی کا معتقد ہو"۔

ضمیمہ (۵)

تفویض

فقہائے متقدمین کے نزدیک عقدِ نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار شوہر کو حاصل ہے شوہر جب چاہے اپنی خوشی و اختیار سے زوجہ کو طلاق دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے سوائے شوہر کسی دوسرے شخص کو حتّیٰ کہ زوجہ کو بھی طلاق دینے کا اختیار تفویض کر سکتا ہے۔ اس بنا پر اکثر نکاح کے وقت متناکحین میں ایک خاص معاہدہ ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد اگر شوہر کی جانب سے شرائط نکاح میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی ہو یا شوہر کوئی دوسری شادی کرلے تو زوجۂ و اہل شوہر سے طلاق لینے کی مجاز ہوگی۔ اس شرط کو تفویض کہتے ہیں اور نکاح میں اس طرح کا اقرار کرنا جائز ہے۔

ضمیمہ (۶)

ایلاء اور ظہار

قدیم زمانہ میں طلاق کے سوائے فسخ نکاح کے دو اور طریقے تھے لیکن جن اسلامی ملکوں اور حکومتوں میں تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی اور جو رباتیں شائستہ ہوگئیں ان میں فسخ نکاح کے دونوں طریقے صدیوں پہلے سے متروک ہوگئے ہیں۔ بہر کیف یہ طریقے ایلاء اور ظہار کہلاتے تھے۔ پہلے طریقے کے موجب مرد قسم کھا کر چار مہینے تک عورت سے ترک تعلقات کر دیتا تھا اور

اگر اس مدت میں دونوں کا تعلق زناشوئی بالکل منقطع ہوتا تو ان میں اس مدت کے اختتام پر طلاق قطعی واقع ہو جاتی تھی۔ دوسرے طریقے میں شوہر اپنی زوجہ کو اپنی کسی ذی محرم قرابت دار عورت سے تشبیہ دیتا تھا اور اس بنا پر یا تو اسکو کفارہ دے کر زوجہ کو اپنے پر حلال کرنا پڑتا یا بحکم قاضی اُن دونوں میں طلاق جاری ہو جاتی تھی۔

ہر چند یہ دونوں طریقے زمانۂ جاہلیت کے اعراب میں رائج تھے اور اگرچہ پیغمبر عربی نے بھی ایک حد تک فسخ نکاح کے اس طرز عمل کو جاری رکھا ہے لیکن ایسے سخت شروط و قیود میں ان کو جکڑ دیا گیا ہے کہ ان پر عمل کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

ضمیمہ (۷)

"ہبۂ قرضہ" یعنے برات

حنفیہ کے قول کے مطابق دائن کا مدیون کو قرضہ ہبہ کرنا یا اسکو برات دیدینا شرعاً جائز ہے اور اگر مدیون ہبہ وغیرہ کو قبول نہ کرے تو وہ ادائی دین سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

دین مدیون کو معاف ہو سکتا ہے اور اگر وہ مر جائے تو اس کے وارث کو بھی خواہ بالغ ہو کہ نابالغ بخشا جا سکتا ہے۔

اسی طرح دائن اپنا قرضہ کسی شخص ثالث کو ہبہ کر سکتا ہے یعنے مدیون کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو بھی وہ اپنا دین منتقل کر سکتا ہے لیکن انتقال دین کو جائز قرار دینے کے لیئے موہوب لہٗ کو قرضہ پر قبضہ کرنے کا اختیار ملنا لازم ہے۔ چونکہ ہر ایک قسم کے انتقال دین میں اس کے وصول کرنے کا اختیار منتقل الیہ کو ضمناً حاصل رہتا ہے اس لیئے اس تاکید شرعی کو ایک قسم کا تکلف سمجھنا چاہیئے۔

لیکن شیعوں میں اس مسئلہ کی نسبت اختلاف آراء ہے۔ چنانچہ افقہ الفقہا (عالم علامہ) امام جعفر طوسی اور دوسرے سرآوردہ علما اس مسئلہ میں حنفیہ سے متفق ہیں اور ان کے برعکس صاحب شرائع کا قول ہے کہ دین صرف مدیون یا اُس کے وارث کو ہبہ ہو سکتا ہے اور مدیون کی رضامندی یا بلا رضامندی کے اس طرح کا ہبہ موثر ہو سکتا ہے۔ بہرکیف قول اول عرفاً مستند ہے۔

اگر الف کا بعض ایسے رقوم میں حصہ ہو جو ایک شخص ثالث کے قبضہ میں ہوں تو الف کا اپنے حصہ کی رقم ب کو ہبہ یا منتقل کرنا فریقین اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس عطا و انتقال پر مسئلہ مشاع کے ضمن میں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مرض الموت میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی دین کی ادائی کا اقرار کرلے اور اُس اقرار سے دائن کے ساتھ سلوک کرنا یا اُس کو فیض پہنچانا نہ پایا جاتا ہو تو اس قبولیت کا اثر مسلمان متوفی کی محض ایک ثلث جائداد پر نہیں بلکہ کل جائداد پر پڑتا ہے۔

ضمیمہ (۸)

دعوے بطلان انتقال جائداد موقوفہ

ایک مقدمہ میں مدعیوں نے اس بناء کے ساتھ رجوع کیا کہ جو زمینیں اُن کے دادا اور اُس کی اولاد صلبی کو ایک مسجد کے اخراجات انتظام اور قیام کے لیئے عطا ہوئی تھیں اُن کو اُن کے باپ (مدعی علیہ نمبر۳) اور چچا زاد بھائیوں (مدعی علیہما نمبر ۴ و ۵) نے جو جائدادِ وقف کے متولی تھے اور جن کے سپرد اُس کا

عہ اس کے ساتھ مقابلہ کرو ابراہیم بھائی بنام فل بائی (سنہ ۱۹۰۲ء) انڈین لا رپورٹس بمبئی جلد ۲۶ صفحہ ۵۷۷۔

انتظام تھا اس جائداد موقوفہ کی کچھ زمینوں کو خلاف شرع شخص ثالث کو منتقل کیا ہے اور مدعی علیہم نے مسجد کے فرائض کی انجام دہی بھی ترک کر دی ہے لہذا مدعیوں نے اُن متولیوں کی جگہ کام کرنا شروع کر دیا اور دعوے کیا کہ عدالت متنازعہ زمینوں کے انتظام اور قبضہ و تصرف کا اُن کو مستحق ٹھیرائے ۔ مدعی علیہ نمبر ۳ کی جانب سے منجملہ اور عذرات کے جوابدہی میں ایک یہ عذر بھی پیش کیا گیا کہ مدعی علیہ نمبر ۳ نے اپنا حق مدعیوں کو منتقل نہیں کیا ہے لہذا وہ باپ کی زندگی میں جائداد متنازعہ فیہ کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں ۔

لیکن عدالت نے تجویز کی کہ جائداد وقف کے جن حصوں کو مدعیوں کے باپ اور چچا زاد بھائیوں نے منتقل کیا ہے اُس کارروائی کو عدالت کے ذریعہ سے باطل قرار دلانے کا دعوے کر سکتے ہیں ۔ اور جائداد موقوفہ سے خدمت مسجد کو جو سابق میں اُس سے متعلق کی گئی تھی دوبارہ جاری کرا سکتے ہیں ۔ نیز یہ کہ مدعیان محض مامون علیہم نہیں ہیں بلکہ وہ خاندان تولیت کے ارکان ہیں اور اس لئے موجودہ متولیوں کے مرنے کے بعد متولی کا منصب ارثاً انھیں ملیگا بشرطیکہ مدعی علیہم جیسا کہ اُنھوں نے اپنے جواب میں بیان کیا ہے اپنے حین حیات تولیت سے دست برداری نہ کی ہو اور مستعفی نہ ہوئے ہوں ۔[1]

ضمیمہ (۹)

وصیت

چونکہ قانون حصول نقل مصدقۂ وصیت و اہتمام ترکہ مجریہ ہند (دی پروبیٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن ایکٹ) کی رو سے مسلمانوں کی وصیت لسانی کے اختیار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے لہذا اگر کسی مسلمان کی زبانی وصیت ثابت ہو جائے تو

۱۔ قاضی حسین بنام سجن بال کرشنا (۱۸۹۹ء) انڈین لا ریورٹس بمبئی جلد ۲۴ صفحہ ۱۷۰۔

پروبیٹ کے لیئے قبول کرلی جائیگی۔[1]

ضمیمہ (۱۰)

وقف مال و زر

جائداد بصورت حصص

بمقدمۂ کلثوم بی بی بنام غلام حسین عارف[2] فاضل جج نے تجویز کی ہے کہ "شرع محمدی کی رو سے تجارتی کمپنی کے حصوں کو وقف کرنا ناجائز ہے" لیکن میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ جو نتیجہ لائق جج نے شرع محمدی سے اخذ کیا ہے اُس کی علمائے اسلام کے مستند اقوال سے تصدیق نہیں ہوتی اور اس فیصلہ کے اثر سے شرع محمدی کا ایک طے شدہ اور مسلمہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ا۔ میرے خیال میں لوگ لفظ اجتہاد کے معنی سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ اجتہاد کا مفہوم اصول جدید کا نشو و نما یا ارتقا ہے۔ حنفیوں کے خیال کے مطابق تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جدید اصول قائم کرنے کا حق مفقود ہو گیا لیکن قدیم مسائل اور اصول کی تعبیر اور تاویل کے متعلق جس کے ذریعہ سے ہر ایک زمانہ کے مسلمانوں کی ضرورتوں کا تصفیہ ہوتا ہے کوئی ممانعت قطعی موجود نہیں ہے تو بس ایسی صورت میں جبکہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے سبب سے مسلمانوں کی طرز معاشرت بھی بہت کچھ بدل گئی ہے اور ان کو آئے دن نئی نئی

---

[1] بمعاملۂ وصیت حاجی محمد آباد (۱۸۹۹ء) انڈین لا رپورٹس بمبئی جلد ۲۴ صفحہ ۸۔

[2] (۱۹۰۵ء) کلکتہ ویکلی نوٹس جلد ۱۰ صفحہ ۴۹۹

ضرورتیں[1] پیش آتی رہتی ہیں کیوں تاویل مسائل قدیم شرعیہ کا دائرہ کشادہ نہ کیا جائے۔ خصوصاً جبکہ صحیح تاویل و تعبیر کرنے کے خلاف کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے تو تاویل مسائل سے ضرور کام لینا چاہیئے۔

۲۔ جب ابو یوسف رح اور محمد رح کی رائے میں اختلاف ہو تو مسلمان جج ان دونوں کے فیصلوں میں سے جس فیصلہ کو زیادہ معقول اور مطابق عقل پائے یا جو زمانہ کی ضرورتوں کو پوری کرنے میں زیادہ مفید معلوم ہو اُس کو اختیار کر سکتا ہے[2]۔ مسلمان قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو بات اُس کو مفید و مناسب معلوم ہو یا باصطلاح مذہب جس کو وہ مصلحت سمجھتا ہو اُس پر اپنے فیصلہ کو منحصر رکھے[3]۔

۳۔ وقف کے متعلق شرع میں چند ایسے اصلی اور ضروری قواعد ہیں جن پر تمام مستند فقہا کا اتفاق ہے لیکن ان لوگوں نے جو اختلاف کیا ہے اُس کا محض وقف کے ذیلی قواعد سے تعلق ہے۔ اصلی قواعد یہ ہیں:—

(الف) جائداد موقوفہ کا ہمیشہ کے واسطے وقف ہونا ضرور ہے۔

(ب) اُس پر کسی انسان کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنے جائداد موقوفہ کسی شخص کی ملک نہیں ہو سکتی۔

(ج) اُس کا ناقابل توریث اور ناقابل انتقال ہونا لازم ہے۔

قواعد و شرائط بالا کے متعلق حنفی علما کا اجماع ہے لیکن افتمتی شرائط کی نسبت اُن میں اختلاف ہے مثلاً کس طرح وقف کرنا چاہیئے اور کن لوگوں کے واسطے وقف ہو سکتا ہے، وقف کرنے میں کس قسم کے الفاظ استعمال کرنا چاہیئے وقف کن چیزوں کا ہو سکتا ہے یا کون چیزیں وقف کے واسطے

---

[1] دیکھو اسناد جن کا حوالہ محمدن لا جلد ا مقدمہ صفحہ ۵۲ پر دیا گیا ہے۔

[2] تصانیف سر ولیم جونس جلد ۳ صفحہ ۵۱۰۔

[3] فتاوائے حمیدیہ۔

[4] ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۵۷۸۔

موزوں ہیں اور اسی طرح کے قواعد میں ابو یوسفؒ اور محمدؒ نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے چند شرائط کی بابتہ ابو یوسفؒ کے فتوے کے مطابق تصفیہ کیا جاتا ہے اور چند قواعد و مسائل کا محمدؒ کے قول کے موافق فیصلہ ہوتا ہے محمدؒ کے نزدیک جواز وقف کے لیئے {(اور وقف کی غرض) ناتمام ہونے والی شے ہونی چاہیئے} کسی ناتمام ہونے والی شے کا تصریحاً موقوف مقرر ہونا ضرور ہے لیکن ابو یوسفؒ کی رائے میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ علمائے بخارا نے محمدؒ کے قول کو اور علمائے بلخ نے ابو یوسفؒ کی رائے کو اختیار کیا اور ہندوستان میں بھی اسی دوسرے قول پر عمل ہوتا تھا مگر ہند کی انگریزی عدالتوں نے محمدؒ کے اُصول کو پسند کیا ہے[۱]

محمدؒ کے نزدیک جائداد وقفی کا کسی امین کو منتقل ہونا لازم ہے اور اُس کے برعکس ابو یوسفؒ کی رائے میں اس کی ضرورت نہیں ہے اور اُن کی رائے کو فقہائے بلخ نے بھی اختیار کیا تھا اور ہند میں بھی اسی پر عمل ہوتا تھا۔

ابو یوسفؒ کا خیال تھا کہ چند قسم کی جائداد منقولہ (یعنے مال) کے سوائے اور جن کا وقف کرنا رائج ہوگیا ہے دوسرے کسی قسم کے مال کو وقف کرنا ناجائز ہے اور اُس کا سبب یہ بتلایا جاتا تھا کہ چونکہ جائداد منقولہ کے وقف کرنے سے وقف کی غرض اصلی یعنے استمرار و دوام مفقود ہو جاتی ہے اور مال استعمال و تصرف سے خرچ ہو جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا اس لیئے اُس کا وقف کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کے خلاف محمدؒ کی رائے میں ہر ایک قسم کا مال (جائداد منقولہ) جو لوگوں کے خرید و فروخت اور لین دین میں کام آسکتا ہے موقوف قرار پا سکتا ہے اور اس طرح کے مال کا وقف کرنا شرعاً جائز و صحیح ہے۔ بہر حال اب محمدؒ کے قول کو تمام دنیائے اسلام تسلیم کرتی ہے اور فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ "فتوائے محمدؒ کے ساتھ ہے" یعنے اس

---

[۱] دیکھو صفحہ ۲۳ ۱۲ ماسبق ۔۱۲

قول کے مطابق اوقاف کا تصفیہ کیا جاتا ہے[1]۔

[2]
امام زفرؒ کو بھی جو ابو حنیفہؒ کے ہمعصر اور شاگرد ہیں اجتہاد میں ابو یوسفؒ
اور محمدؒ کے ہم پلہ اور اعلیٰ درجہ کے امام سمجھے جاتے ہیں محمدؒ کے ساتھ اتفاق ہے
اور اُن کا قول ہے کہ جائداد منقولہ کا جس میں روپیہ اور رقم بھی شامل ہو سکتی ہے
وقف کرنا شرعاً جائز ہے۔

صاحب ردالمحتار جن کا اکابر علمائے حنفیہ میں شمار کیا جاتا ہے لکھتے ہیں کہ ازبسکہ محمدؒ کے قول میں جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے تمام قسم کی جائداد منقولہ شامل ہے لہذا زفرؒ کے قول سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے[3]۔

۴۔ لہذا روپیہ کے وقف کیئے جانے کی نسبت ابو یوسفؒ کے قول کو اصولی خیال کرنا سخت غلطی ہے اور عدالت کا اس طرح کا قیاس شرع محمدیؐ کے اس مسلمہ و مقبولہ قاعدہ کے بالکل متضاد و منافی ہے۔

۵۔ جو ہدایت کہ فقہائے حنفی جائداد منقولہ کی نسبت کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ شے موقوفہ ایسی ہونی چاہیئے جو آدمیوں کے روزمرہ کام میں آتی ہو اور اگر اُس میں یہ صفت نہ ہو تو اُس کا وقتاً فوقتاً تازہ کرنا ممکن نہیں اور جو دائمی نفع کہ اُس سے واقف کافۂ انام کو پہنچانا چاہتا ہے وہ مفقود ہو جاتا ہے مثلاً اگر ایک گائے غربا کو دودھ ملنے کی غرض سے وقف کردی جائے تو اُس کے دودھ سے غربا دواماً نفع نہیں اٹھا سکتے تا اینکہ جب گائے دودھ دینے کے قابل نہ رہے اور اُس کو بیچ کر دوسری گائے نہ خریدی جائے یعنی

---

[1] ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۵۷۸۔

[2] دیکھو ملتقا اور ڈاؤہسن کی کتاب مسمی تذکرۂ عام سلطنت عثمانیہ Multeka and D'ohsson, Tableaw General de l'Empire Ottomane.

[3] ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۵۷۸۔ اس کے سوائے دیکھو فتح القادر جلد ۲ صفحہ ۶۳۶۔

موقوف کو وقتاً فوقتاً تازہ نہ کیا جائے غرض وقف مفقود ہو جاتی ہے۔

۶۔ محمدن لا جلد ا صفحہ ۸ ۷ اپریں نے لفظ تامل کے ترجمہ کے متعلق اعتراض کیا ہے۔ کٹیافیگو(Catafago) کی لغات عربی میں اور جانسن کی لغات عربی اور فارسی میں تامل کے معنی ایک دوسرے سے لین دین خرید وفروخت کرنا لکھے ہیں اور جانسن نے تعارف کے معنی "عادت مشق رسم اور فیشن" بتلائے ہیں۔

داجیز المحیط میں ذیل کا فقرہ لکھا ہوا ہے جس میں یہ دونوں لفظ ال کر واقع ہوئے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ مرادف نہیں ہیں اور جو خیال کہ ان کے ہم معنی ہونے کا فقرۂ بالا میں بیان ہوا ہے اس کی تردید ہوتی ہے۔ "اسی طرح منقول (یعنے جائداد منقولہ) کا جیساکہ گھوڑے، اسلحہ، کدال، دیگ، بسولے، آرہ (منشار) تابوت اموات، کفن، قرآن مجید، کتب فقہ وحدیث وادب ہیں اور دوسری ایسی چیزوں کا وقف کرنا جن کا لوگ لین دین اور خرید وفروخت کرتے ہیں[1] اور جن کے وقف کرنے کی ان کو عادت ہوگئی ہے"[2]۔

۷۔ اگرچہ کٹیافیگو اور جانسن تامل کے معنی لین دین خرید وفروخت وغیرہ کی عادت بتلاتے ہیں، لیکن بالفرض اس لفظ کا یہ مفہوم نہ بھی ہو بلکہ اسکی معنی وقف کرنیکی عادت بھی ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس اختلاف مفہوم سے تمام قسم کی جائداد منقولہ کے جواز وقف میں جس میں روپیہ ورقم بھی شامل ہے کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس اختلاف مفہوم کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک شئے کا جس کے لوگ لین دین اور خرید وفروخت کرنے کی عادت رکھتے ہیں شرعاً جائز ہے۔

۸۔ اگر ابو یوسفؒ کے عہد کا زمانۂ حاضرہ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن چیزوں کی بابت جن کا وقف ہو سکتا ہے علمائے شریعت کے خیالات میں بہت وسعت ہوئی ہے[3]۔ چنانچہ ابو یوسفؒ کے نزدیک

---

[1] یا جس میں باہمی لین دین ردوبدل ہو۔
[2] کتاب ہدایہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے ۱۲۔

عمارتوں اور درختوں کو وقف کرنا اُس زمین کے وقف ہونے کے بغیر جس پر وہ بطور ملحقات واقع ہیں جائز نہیں تھا۔ لیکن اب اس طرح کے وقف کو تمام فقہائے حنفی درست مانتے ہیں۔ اسی طرح ابو یوسف سکوں (درہم و دینار) کے وقف کرنے کو بر بنائے قیاس یعنے اس احتمال سے کہ سکہ لوگوں کے استعمال میں آکر خرچ ہو جاتا ہے قبیح سمجھتے تھے لیکن اس زمانہ میں جہاں کہیں اس کا رواج ہے لوگ روپیہ کو وقف کرتے ہیں اور علمائے حنفیہ اس کو جائز مانتے ہیں مگر اس قدر احتیاط کرنا ضرور ہے کہ اگر فی الواقع روپیہ بشکل سکہ وقف کیا جائے تو اُس کی اصلی قیمت مضاربت (بیوپار) یا بضاعت (تجارت)[1] میں لگائی جانی چاہیئے (افسوس ہے کہ کلثوم بی بی بنام غلام حسین قاسم عارف کے فیصلہ میں اس مسئلہ تک کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے) اگر کوئی تلف و ضائع ہونے والی شئے وقف ہو اور اُس کے اتلاف کا احتمال قوی ہو تو شرع کا حکم ہے کہ موقوف کو فروخت کر کے اُس کی قیمت کو اسی طرح تجارت وغیرہ میں لگانا چاہیئے۔ عہ۲ اس کے علاوہ اگر ایسی شئے جس کا عام رواج نہ ہو وقف کر دی جائے تو قاضی بشرطیکہ اس کو مناسب سمجھے اپنے اختیار سے اُس وقف کو جائز قرار دے سکتا ہے۔[3]

ایک مال وقفی کو دوسرے مال وقفی کے مقابلہ میں یعنے ایک قسم کے وقف کو کسی دوسری قسم کے وقف پر ترجیح نہیں دی جا سکتی اور نہ کسی وقف کی اگر وہ وصیت کے ذریعہ سے قائم کیا جائے دوسرے کسی وقف سے قدر و منزلت بڑھ سکتی ہے۔ قاضی کو صرف اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا وہ شئے جو وقف کی گئی ہے اس قابل ہے کہ اُس کے وقتاً فوقتاً تازہ کرتے رہنے سے

عہ۱۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۵۷۹۔ مضاربت اور بضاعت کے معنوں کے لیئے جانسن کی لغت دیکھی جائے۔

عہ۲۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۵۷۹ مضاربت اور بضاعت کے معنوں کے لیئے جانسن کی لغت دیکھی جائے

عہ۳۔ ایضاً

نفع دائمی حاصل ہو سکتا ہے یا اُس کو بیچ کر اس کی قیمت و منافع بیوپار یا تجارت میں لگانا زیادہ مناسب ہوگا۔ جو مسائل اور دلائل ہدایہ میں درج ہیں اُن کو احکام شرع کے مانند اہم سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ اس کتاب کے اکثر مسائل وغیرہ اب سے صدیوں پہلے منسوخ ہو گئے ہیں اور جو باقی رہ گئے ہیں اُن میں بھی اکثر ترمیم ہوئی ہے لہذا کتاب مذکور سے مطالب اخذ کرنے اور اُن کو سمجھنے کے لئے ہر ایک شخص کو اُس کی تفاسیر و شروح (خصوصاً فتح القدیر) کا مطالعہ کرنا ضرور ہے۔

تمت

صحت نامہ اصول شرع محمدی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
(تمہید) ۴	حاشیہ ۱ سطر ۱	تزویچ	تزویج
۸	″ ″ ″	دولنگز	رولنگز
۹	۱۶	ابتدأً	ابتداءً
۳۸	۱۱	اپنے	اپنی
۴۰	۱۳	مامو	ماموں
″	۲۲	″	″
″	۲۳	″	″
۴۴	حاشیہ ۳	بغاطون	وفاتن
۴۹	حاشیہ سطر ۲	مالکییہ	مالکیہ
″	۳	″	″
۵۱	۱۸	باپ کے	باپ کی
۵۳		ولاءلاامامت	ولاءالامامت
۶۳	حاشیہ ۳ سطر ۱	اپیل کیسنر	اپیل کیسینز
۷۲	۱۷	ضرورت ہیں	ضرورت نہیں
۷۴	۸	اولاد علال	اولاد حلال
۷۸	۱۱	ایسادلی	ایسا ولی
″	حاشیہ ۳	زودالمختار	ردالمختار
۸۲	۲۱	اقاب	اقارب
۱۰۷	۲۱	تصریح وتعین	تصریح وتعیین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲۰	۹	ڈگری	ڈکری
۱۲۲	۱	اسکے عدۃ	اس کی عدۃ
۱۳۹	حاشیہ بخاری سطر ۱۹-۲۰-۲۱	ولائت غیر عطا	ولایت غیر عطا
۱۴۰	حاشیہ ۲ سطر ۱	بنام ڈیل	بنام ڈیل
۱۴۸	۱۰	دوسرے قسم	دوسری قسم
۱۴۹	۵	ابتدأً	ابتداءً
۱۵۶	۱۳	پہلے قسم	پہلی قسم
۱۵۸	۱۱	قول امام محمد رح	قول امام ابویوسف
″	۱۹	امام ابویوسف رح	امام محمد
۱۶۱	۱۹	مقبر لے	مقبرے
۱۶۹	۵	دائر کرلے	دائر کرے
″	۱۴	اتقاقی پر	اتفاقی پر
۱۷۱	۲	واقف کے	واقف کی
۱۷۴	۱۷	ہیں ورثہ اپنی	ہیں ورثاء اپنی
۱۷۵	۱۶	بلالخاظ	بلالحاظ
″	۲۲	کرلے	کرے
۱۸۴	۱۷	ہبہ شرط العوض	ہبہ بشرط العوض
″	۱۸	ہوتا ہے ۲	ہوتا ہے ۱
۱۸۷	۱	متنوعہ	مشفوعہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۰	۷	مشقوعہ	مشفوعہ	۲۰۴	۱۱	مشتری فائدہ	مشتری نے فائدہ
۱۹۴	۶	کرنے راضی	کرنے پر راضی	۲۰۸	۳	پڑوتا	پروتا
۱۹۵	حاشیہ سطر ۱/۳	ڈگری	ڈکری	″	۲۴	بھائیاں	بھائی
۱۹۶	۲	″	″	۲۱۳	۵	ہمتبسری	ہم بستری
″	۷	″	″	۲۱۶	۱	مسلۂ گی	مسئلہ کی
۱۹۸	۱۳	″	″	″	۱۵	دعوے لبطلان	دعوائے بطلان
″	۱۴	دعوی شفع	دعوائے شفع	۲۲۳	۱۳	لگانا چاہیئے ۳ سطر	لگانا چاہیئے ۲ سطر
۲۰۳	۶	مخصوص کرنے	مخصوص کرے				

تمت